باسمہٖ تعالیٰ

ہمارے معاشرہ کی سنجیدہ اور سمجھدار بیٹی

طاہرہ کے نام

سلمہا

خطوط کا مجموعہ

پرویز

طلوعِ اسلام ٹرسٹ ۲۵/بی، گلبرگ ۲، لاہور

کتاب کا نام:	طاہرہ کے نام خطوط
مصنف:	پرویز
ناشر:	طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) 25 B گلبرگ II لاہور 54660 پاکستان فون: 576 4484, 575 3666 فیکس: 5866617 Email: trust@toluislam.com Web: www.toluislam.com
طابع:	آواز اشاعت گھر
مطبع:	یمانی پریس، ریٹی گن روڈ، لاہور
پہلا ایڈیشن:	1957
دوسرا ایڈیشن:	1969
تیسرا ایڈیشن:	1976
چوتھا ایڈیشن:	1989
پانچواں ایڈیشن:	1993
چھٹا ایڈیشن:	1995
ساتواں ایڈیشن:	1999
آٹھواں ایڈیشن:	2001

طلوع اسلام ٹرسٹ کی کتب سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے

فہرست مشمولات

نمبر	مضمون	صفحہ
۱	تعارف	۹
	باب اوّل	
	پہلا خط	
۱	مرد اور عورت کی حیثیت یکساں ہے	۱۳
۲	مروجہ قوانینِ شریعت کی رُو سے عورت کی حیثیت	۱۴
۳	یہ تصورات غلط ہیں	
	مرد اور عورت یکساں واجب التکریم ہیں۔	۲۰
۴	عورت کی منفرد خصوصیات	۲۲
۵	یہ غلط ہے کہ مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔	۲۷
۶	وراثت میں عورتوں کا حصہ کیوں کم ہے؟	۲۵
۷	گواہی میں، دو عورتیں ایک مرد کے برابر کیوں ہیں؟	۲۶
	دوسرا خط	۴۱
	مزید تصریحات	
۱	جنسی معاشرہ کی عورتیں	۴۴
۲	عیسائیت اور عورت	۴۵
	تیسرا خط	
	(نکاح۔ طلاق۔ تعدد ازدواج)	۴۸
۱	نکاح	۵۰
۲	ایک سے زیادہ بیویاں	۵۲
۳	طلاق	۵۶
	چوتھا خط	
	(دوسری بیوی)	۶۳
۱	صابرہ کی دکھ بھری داستان	۶۳
	پانچواں خط	
	(ان جوڑ شادیاں)	۷۴
۱	شاکرہ کی شادی اس کے لئے موت کا پیغام تھی	۷۶
	چھٹا خط	
	(جہیز کے مطالبات)	۸۱
۱	شفقت کی بیچارگی۔ جہیز نہ ہونے کی وجہ سے گھر بیٹھے عمر کٹ گئی۔	۸۱

نمبر	مضمون	صفحہ
	ساتواں خط	
	ساس بہو کی کشمکش	۸۷
۱	رشتہ کے معاملہ میں غلط ذہنیت	
	قسمت کا لکھا	۸۸
	توکّل کا غلط مفہوم	۹۰
۲	والدین کی اطاعت کا غلط مفہوم	۹۲
۳	شادی کے بعد لڑکے لڑکی کو الگ رہنا چاہیئے۔	۹۹
	آٹھواں خط	
	(بچوں کی تربیت)	۱۰۱
۱	حیوان اور انسان کے بچے میں فرق	۱۰۲
۲	انسانی فطرت کا غلط تصوّر	۱۰۳
۳	حیوانی جبلت جیسی پابندی بھی نہیں	۱۰۳
۴	ماحول کا اثر	۱۰۴
۵	ماں کے فرائض	۱۰۶
۶	اُمّت کی تشکیل ماں کرتی ہے	۱۱۱
	نواں خط	
	(پردے کے متعلّق)	۱۱۳
۱	عصمت کے دو معیار —— مرد کے لئے اور، عورت کے لئے اور۔	۱۱۳
۲	قرآنی معیار۔ دونوں کیلئے یکساں	۱۱۴
۳	گھروں میں بند رکھنا سزا ہے	۱۱۵
۴	جنسی تقاضا کے متعلّق نفسیاتی بحث	۱۱۸
۵	پرائیویسی اور پردہ — گھر کے اندر	۱۱۹
۶	گھر سے باہر	۱۲۱
۷	بنیادی اصول۔ تبرّج (نمود کا جذبہ) نہیں ہونا چاہیئے۔	۱۲۲
۸	ازدواجی انتخاب کے حدود	۱۲۳
۹	غلط معاشرہ میں حالت	۱۲۵
۱۰	کرنا کیا چاہیئے؟	۱۲۷
	دسواں خط	
	(ماڈرن عورتیں)	۱۲۹
۱	ماڈرن بیوی کی زندگی کے معمولات	۱۲۹
۲	ایسے گھروں میں بچّوں کی حالت	۱۳۰
۳	صحت کی خرابی۔ اخراجات کی زیادتی	۱۳۱
۴	عورت کے اندر ایک نفسیاتی کشمکش پیدا ہوگئی ہے۔	۱۳۲
۵	عورت اور مرد کے فرائض	۱۳۳
۶	یورپ کی عورت	۱۳۴
۷	ستر کی بہترین شہادت۔ عملی زندگی	۱۳۶

نمبر	مضمون	صفحہ
	گیارہواں خط	
	(گھر کی زندگی کیسے خوشگوار بن سکتی ہے)	۱۲۸
۱	روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں کی اہمیت	۱۲۸
۲	ایک انتہائی نیک عورت	۱۴۰
۳	لیکن اس کے باوجود... ؟	۱۴۰
۴	نقائص کیا تھے ؟	۱۴۱
۵	مرد اور عورت میں ہم آہنگی	۱۴۲
۶	یہ تبدیلی ہر وقت پیدا کی جا سکتی ہے	۱۴۴
	بارھواں خط	
	(ہمارے گھر جہنم کیوں بنے رہتے ہیں۔)	۱۴۵
۱	اس کا بنیادی سبب ہماری خودساختہ شریعت ہے۔	۱۴۵
۲	اسلام میں پوزیشن یہ نہیں تھی	۱۴۶
۳	نابالغوں کی شادیاں	۱۴۶
۴	ایک سے زیادہ بیویاں	۱۴۷
۵	اس کا نفسیاتی اثر	۱۴۹
۶	بات بات پر طلاق کی دھمکی	۱۵۰
۷	ہمارے صدر اوّل کی تاریخ	۱۵۲
۸	ماڈرن گھروں کی حالت	۱۵۴
	تیرہواں خط	

نمبر	مضمون	صفحہ
	بیٹی کے لئے بَر کا انتخاب	۱۵۷
	باب دوم	
	قرآنی احکام	۱۶۱
	(سابقہ خطوط کی قرآنی سندات)	
۱	مرد اور عورت کی حیثیت	۱۶۲
۲	نکاح	۱۶۵
	جنسی اختلاط ۔ اولاد	۱۶۸
۳	مہر	۱۸۰
۴	تعلقات کی کشیدگی	۱۸۲
	عارضی علیحدگی	۱۸۳
	طلاق	۱۸۳
۵	عدت	۱۸۷
۶	ترکہ (وراثت)	۱۸۹
۷	اولاد	۱۹۱
	لڑکی اور لڑکے میں کوئی فرق نہیں	
۸	رضاعت (دودھ پلانا)	۱۹۴
۹	تعدد ازدواج	۱۹۶
۱۰	لونڈیاں	۲۰۰
	باب سوم	
	حضرت عائشہؓ کی عمر شادی کے وقت	۲۰۲
۱	صغرسنی کی شادی کے لئے دلیل	۲۰۲

نمبر	مضمون	صفحہ
٢	عام روایات (کہ حضرت عائشہؓ کی عمر شادی کے وقت چھ سال کی تھی)	٢٠٣
٣	یہ روایات غلط ہیں	٢٠٣
٤	صحیح پوزیشن کی تحقیق	٢٠٤
٥	حضرت عائشہؓ کی عمر بوقت شادی سترہ سال کی تھی اور رخصتی کے وقت انیس سال کی۔	٢١٠ ٢١١
٦	تاریخ اور قرآن میں تضاد	٢١٢

طلوعِ اسلام ٹرسٹ کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

تعارف

(طبع اوّل)

قرآن کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم کسی گرتی ہوئی قوم کو سنبھالنا چاہتے ہو تو اس کی ابھرنے والی نسل کو سنبھال لو۔ اگر تم نے آنے والی نسل کے دل و دماغ کی تربیت صحیح خطوط پر کر دی تو قوم خود بخود سنبھل جائے گی۔ اس حقیقت کے پیش نظر، میں نے شروع ہی سے، قوم کے نوجوان طبقہ کو اپنے پیغام کا اوّلین مخاطب قرار دیا ہے اور جو کچھ لکھا ہے، بیشتر انہی کے لئے لکھا ہے۔ اس سلسلہ میں "سلیم کے نام خطوط" کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ "سلیم" ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کا نمائندہ ہے، جس کا قلب تو سلیم ہے لیکن غلط تعلیم نے (جو ہمارے مدرسوں اور کالجوں میں ملتی ہے) دین کے متعلق اس کے دل میں طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا کر دیئے ہیں۔ ان خطوط میں اس کے انہی شبہات کا سائنٹفک طریق سے تجزیہ کر کے، قرآنی حقائق اور عقل و بصیرت کی روشنی میں ان کے ازالہ کی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ یہ خطوط بے حد مؤثر اور مفید ثابت ہوئے۔ کچھ عرصہ ہؤا، میرے ایک عزیز دوست نے مشورہ دیا کہ سلیم کے نام خطوط کی طرح "طاہرہ کے نام خطوط" کا بھی الگ سلسلہ شروع کرنا چاہیئے جن میں خصوصیت سے ان معاملات سے متعلق گفتگو کی جائے جن کا تعلق عورتوں سے ہے۔ یہ مشورہ ایسا مفید ثابت ہؤا کہ طاہرہ کے نام پہلے خط پر ہی ملک کے مختلف حصوں سے بچیوں اور بہنوں کے سینکڑوں خطوط موصول ہوئے، جن میں اس نئے سلسلے کو بہت سراہا گیا۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہؤا کہ خواتین کی طرف سے استفسارات کا سلسلہ وسیع ہو گیا۔ چنانچہ اس کے بعد جتنے "خطوط" شائع ہوئے ان میں بیشتر انہی استفسارات پر مبنی تھے۔

کچھ عرصہ سے تقاضا تھا کہ (سلیم کے نام خطوط کی طرح) طاہرہ کے نام خطوط کا بھی مجموعہ شائع کر دیا جائے۔ زیرِ نظر مجموعہ، اسی تقاضے کا نتیجہ ہے۔ پہلے خیال یہ تھا کہ یہ خطوط ایک ہی جلد میں شائع کر دیئے جائیں لیکن

میں نے محسوس کیا کہ ان خطوط کے علاوہ اور بھی کئی چیزیں ایسی ہیں جن کا اس قسم کے مجموعہ میں شامل ہونا ضروری ہے جب انہیں مجموعہ میں شامل کرنے کا خیال پیدا ہوا تو یہ ضرورت بھی سامنے آئی کہ قرآنِ کریم میں جسقدر احکام ایسے ہیں جن کا تعلق (خاص طور پر) عورتوں سے ہے، انہیں (مختلف عنوانوں کے تحت، یکجا کر دیا جائے تاکہ جس معاملہ میں ضرورت پڑے، متعلقہ احکام بیک نظر سامنے آجائیں. چنانچہ یہ احکام بھی مرتب کر دیئے گئے. ان چیزوں سے اس مجموعہ کی افادی حیثیت بہت بڑھ گئی لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی ضخامت بھی اتنی زیادہ ہو گئی کہ اسے دو حصّوں میں تقسیم کرنا پڑا.

ان خطوط میں بیشتر ان مصائب و مشکلات اور پیچیدگیوں اور اُلجھنوں کو سامنے لایا گیا ہے، جن سے ہمارے معاشرہ میں بچاری بے کس اور بے بس لڑکیاں بالعموم دوچار ہوتی ہیں اور ان کا حل قرآن کی روشنی میں بتایا گیا ہے. جہاں تک ان مشکلات کے حل کا تعلق ہے، ظاہر ہے کہ یہ چیز انفرادی نہیں بلکہ معاشرہ کی اجتماعی ہے. یعنی جب تک ہمارے معاشرہ کی اصلاح نہیں ہوتی ان مشکلات کا تسلی بخش حل نہیں مل سکتا. معاشرہ کی اصلاح کے دو مؤثر طریقے ہیں. ایک تو یہ کہ ہمارے مدرسوں اور کالجوں میں تعلیم صحیح انداز کی ملے. اور دوسرے یہ کہ ملک کے قوانین قرآنِ کریم کی روشنی میں مرتب کئے جائیں. اس کے لئے ضروری ہے کہ رائے عامہ کو اس قدر بیدار کیا جائے کہ یہ تبدیلیاں آئینی طور پر عمل میں لائی جاسکیں.

ان خطوط کے مطالعہ سے یہ حقیقت بھی سامنے آجائے گی کہ نکاح و طلاق وغیرہ کے سلسلہ میں جس چیز کو بالعموم شریعت کا فیصلہ کہا جاتا ہے وہ بعض اوقات قرآنِ کریم کی تعلیم کے یکسر خلاف ہوتا ہے. اس سے ظاہر ہے کہ ہماری مروجہ شریعت میں (جس کے مطابق ہماری عدالتوں میں بھی فیصلے ہوتے ہیں)، ایسی باتیں بھی ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں. ہم مسلمان ہیں اور قرآن کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ہمارے لئے ضابطہ حیات ہے. لہٰذا ہر وہ چیز جو قرآن کے خلاف ہو کبھی صحیح دین نہیں ہو سکتی. ضرورت اس امر کی ہے کہ سب سے پہلے خود ہماری شریعت، قرآن کے مطابق ہو جائے. اس کا طریقہ بھی وہی ہے جو اُوپر تجویز کیا گیا ہے.

بعض خطوط میں معاشرہ کی ان خرابیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، جو جدید تعلیم یافتہ (ماڈرن) سوسائٹی میں عام ہو رہی ہیں. یہ اس روش کا نتیجہ ہے جو ہم نے مغرب کی اندھی تقلید سے اختیار کر رکھی ہے اور جس سے قوم روز بروز تباہیوں کے جہنم کی طرف کھنچے چلی آ رہی ہے. لہٰذا اگر ہمارے قدامت پرست طبقہ میں اصلاح کی ضرورت

ہے تو جدّت پسند طبقہ بھی اس سے مستغنی نہیں۔ وہ اگر فالج کا مریض ہے تو یہ سرسام کا شکار ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ان دونوں کی افراط و تفریط کو قرآن کی روشنی میں اعتدال پر لایا جائے۔

"جنسیات" بڑا اہم موضوع ہے کیونکہ قوموں کی تہذیب و تمدّن سے اس کا تعلق بڑا گہرا ہے۔ لیکن چونکہ یہ موضوع ایسا ہے جس پر ہمارے ہاں ابھی بہت کم لکھا گیا ہے۔ (بلکہ یوں کہئے کہ ہمارے نقطۂ نگاہ سے کچھ لکھا ہی نہیں گیا)، اس لئے میں چاہتا تھا کہ اس کے متعلق بات شروع کی جائے تو اس انداز سے کہ اس کی اہمیت سامنے آجائے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر ان خطوط کے دوسرے حصّہ میں ایک تحقیقاتی مقالہ شامل کر دیا گیا ہے جس سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ قرآن نے عفّت و عصمت پر جو اس قدر زور دیا ہے تو اس کی غایت کیا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بہ نسبت مردوں کے معاشرہ کی اصلاح عورتیں زیادہ آسانی اور مؤثر طریق سے کر سکتی ہیں۔ معاشرہ دراصل مختلف خاندانوں (گھروں) کے مجموعہ کا نام ہوتا ہے اور عورت گھر کی اصلاح نہایت حسن کارانہ انداز سے کر سکتی ہے۔ ان خطوط کی اشاعت سے میرا مقصد یہی ہے کہ اس اصلاح کی ابتداء ہمارے گھروں سے ہو جائے۔ اگر میری اس کوشش سے کچھ گھرانے بھی ایسے نکل آئے جن میں قرآن کی شمعیں روشن ہو گئیں تو میں سمجھوں گا کہ مجھے میری محنت کا صلہ مل گیا۔

جو بہنیں اپنے گھر میں ابتدائی قرآنی تعلیم شروع کرنا چاہیں، ان سے میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کو "اسلامی معاشرت" سبقاً سبقاً پڑھائیں اور جو کچھ بچے پڑھیں پھر اس پر ان سے عمل کرائیں۔ اس مختصر سی کتاب میں قرآن کریم کی ان ہدایات کو آسان اور دل کش انداز میں درج کر دیا گیا ہے جن کا تعلق ہماری روزمرّہ کی زندگی سے ہے۔ اس کے بعد بچّوں کو طاہرہ کے نام خطوط پڑھائیں۔ اور کالج کے طالب علموں کو (خواہ وہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں) سلیم کے نام خطوط۔ اس سے ان کے ذہن کی بنیادیں اسلامی ہو جائیں گی۔

آخر میں اتنا اور کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جن امور پر ان خطوط میں بحث کی گئی ہے، ان سے (یا کسی دوسرے معاملہ سے) متعلق کوئی بات دریافت طلب ہو، تو مجھ سے بلا تامّل دریافت کر لی جائے۔ میں ان استفسارات کا جواب بخوشی دوں گا۔ میرے لئے قوم کی ہر بچّی "طاہرہ بیٹی" ہے۔

کراچی جنوری ۱۹۵۷ء

پرویز

طبع دوم

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن دو جلدوں میں شائع ہوا تھا۔ لیکن یہ دوسرا ایڈیشن، مصنف کی نظرِ ثانی اور حک و اضافہ کے بعد، ایک ہی جلد میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اس میں تمام متعلقہ امور نہایت جامعیت سے آ گئے ہیں۔

گلبرگ ۔ لاہور
اپریل ۔ ۱۹۶۹ء

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

طبع چہارم

اس کتاب کے اس چوتھے نئے ایڈیشن میں محترم پرویزؒ صاحب کا طاہرہ کے نام آخری خط جو انہوں نے جون ۱۹۸۴ء میں تحریر کیا، بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ اس طرح اس کتاب میں ان تمام موضوعات پر قرآنی تعلیمات یکجا ہو گئی ہیں جو ہماری بہنوں اور بیٹیوں کی ازدواجی زندگی میں پیش آ سکتے ہیں۔

فالحمد للہ علی ذٰلک

فروری ۱۹۸۹ء

طلوعِ اسلام ٹرسٹ

باب اوّل

طاہرہ کے نام خطوط

مرد اور عورت

دونوں انسان ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طاہرہ کے نام پہلا خط

(مرد اور عورت کی حیثیت)

طاہرہ بیٹی! جیتی رہو۔ جی چاہتا تھا کہ تمہیں یہ "اسیس" دوں کہ دودھوں نہاؤ پوتوں کھلاؤ۔ لیکن اول تو تم یہی پوچھو گی کہ اسیس کسے کہتے ہیں۔ اور اگر میں نے یہ بھی بتا دیا کہ "اسیس" محبت بھری دعا کو کہتے ہیں تو تم خود اس دعا کے معنی پوچھنے لگ جاؤ گی اور جس دعا کے معنی پوچھنے پڑ جائیں وہ اپنا اثر و کیف کھو دیتی ہے۔ دعا ہو یا مزاح، شعر ہو یا نغمہ، یہ اسی صورت میں اثر انداز ہو سکتے ہیں کہ اُدھر کہنے والے کی زبان سے نکلیں اور اُدھر سننے والے کے دل میں اُتر جائیں۔ (اسی کو بلیغ کہتے ہیں) اگر ان کا مطلب پوچھنا پڑ جائے تو ان کا سب اثر زائل ہو جاتا ہے۔

بیٹی! تمہارا گلہ میرے سر آنکھوں پر، لیکن میں یہ خیال کرتا تھا کہ جب میں سلیم میاں کو خط لکھ دیتا ہوں تو اس میں تم خود بخود شریک ہو جاتی ہو۔ تم اور سلیم کچھ الگ الگ تھوڑے ہو۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ تمہیں اس کا شدید احساس ہے۔ اس سے مجھ پر بڑا اثر ہوا۔ بالخصوص تمہارے اس طنز سے کہ میں نے بھی اوروں کی طرح بیٹے کو بیٹی پر ترجیح دی اور مرد کو عورت سے فائق سمجھا۔ نہیں طاہرہ! تمہیں غلط فہمی ہوئی۔ یہ چیز تو میرے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ لیکن تمہارا طنز تمہارے مزاج کی گہرائی اور احساسات کی شدت کا ترجمان ہے اور اس کا مجھے احترام ہے، اس لئے کہ مجھے اس کا بھی احساس ہے کہ جب عورت کے واجب الاحترام جذبات کی قدر نہ کی جائے تو وہ کس قدر "خطرناک" ہو جاتی ہے۔ (دیکھنا بیٹی! اس لفظ "خطرناک" سے کوئی غلط مفہوم نہ لے لینا۔ میرے الفاظ سے وہی مفہوم لیا کرو جن کے لئے میں انہیں استعمال کرتا ہوں، تمہارے لئے میرے الفاظ کا صحیح مفہوم سمجھ لینا چنداں مشکل نہیں، اس لئے کہ تمہیں ان الفاظ کو سنتے سنتے اب ایک عمر گذر گئی ہے) ہمارے معاشرے میں جو ناہمواریاں پیدا ہو چکی ہیں ("ہمارے معاشرے" سے مراد ہے تمام مسلمانوں کا معاشرہ) اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں مردوں نے عورت کے واجب الاحترام جذبات کی قدر

ہی نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے کبھی عورت کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ بلکہ اس سے بھی واضح تر الفاظ میں، اس نے اسے اس قابل ہی نہیں سمجھا کہ اسے سمجھا جائے۔ لیکن ایسا سمجھنے سے اس نے کون سا سکھ پا لیا ہے؟ بائیں آنکھ دکھتی ہے تو دائیں آنکھ کب چین سے سو سکتی ہے۔

تم نے طاہرہ! اپنے ذہن میں اس مسئلے کو بڑی آسانی سے حل کر لیا کہ چونکہ ہمارے "قوانینِ شریعت" مردوں کے بنائے ہوئے ہیں اس لئے اس میں مردوں کو ہر حال میں بالادست رکھا گیا ہے اور عورت بیچاری کو کچل دیا گیا ہے۔ اس میں

مروجہ قوانین میں عورت کی حیثیت

شبہ نہیں کہ ہمارے موجودہ قوانینِ شریعت (یا رسم و رواج) کا نتیجہ وہی ہے جو تم نے بیان کیا ہے، لیکن اس کی وجہ یہی نہیں جو تم نے سمجھی ہے۔ اگر اس توجیح کو صحیح سمجھ لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ مردوں کی 'فطرت' ہی ایسی ہے کہ یہ اپنے آپ کو بالادست رکھنا چاہتے ہیں اور عورت کو اپنا محکوم و مغلوب۔ تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے سلیم کے نام ایک خط میں اس حقیقت کو واضح کیا تھا کہ "انسان کی فطرت" کوئی چیز نہیں۔ اس میں کچھ رجحانات وہ ہیں جنہیں یہ اپنی حیوانی زندگی سے اپنے ساتھ لایا ہے۔ جہاں تک حیوانات کا تعلق ہے ان میں یہ جذبہ کہیں کارفرما نظر نہیں آتا کہ نر اپنی مادہ کو اپنا زیر دست رکھنا چاہتا ہے۔ لہذا مردوں میں یہ جذبہ حیوانی جبلّت کا نتیجہ تو ہو نہیں سکتا۔ حیوانی جبلّت کے علاوہ، جن خصوصیات کو "انسانی فطرت" کہا جاتا ہے وہ درحقیقت وراثت، ماحول، تعلیم اور تربیت وغیرہ کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ لہذا یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ چونکہ ہمارے مروّجہ قوانین مردوں نے بنائے تھے اس لئے ان میں عورت کو اس درجہ پست حیثیت دی گئی ہے۔ اس کے بجائے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ چونکہ یہ قوانین اس ماحول میں بنے تھے جس میں عدل کے بجائے استبداد کا دور دورہ تھا اور عورت کو نگاہِ نفرت دیکھا جاتا تھا اس لئے ان قوانین و تصوّرات کی رُو سے عورت کی حیثیت مغلوب و محکوم اور ذلیل و حقیر سی قرار پا گئی۔ یہ قوانین ہمارے دورِ ملوکیت کی پیداوار ہیں اور جیسا کہ میں کئی مرتبہ بتا چکا ہوں، ہمارا "مروّجہ" اسلام کم و بیش، اسی دور کا مرتّب شدہ ہے، تم دیکھو گی کہ اس دور میں زندگی کا جو نقشہ مرتّب ہوا (خواہ وہ عورتوں سے متعلق تھا یا مردوں سے)، اس میں ہر مقام پر استبداد کا پہلو نمایاں تھا۔ مثلاً جو قوانین اس دور میں مرتّب ہوئے ان کی رُو سے جملہ حقوق حکمران طبقے کے حق میں محفوظ ہیں، رعایا کے کوئی حقوق نہیں۔ رعایا صرف، عنایاتِ خسروانہ (بادشاہ کی بخشش) کی بھیک مانگ سکتی ہے۔ اپنے حق کے طور پر کوئی چیز طلب نہیں کر سکتی۔ ان قوانین کی رُو سے تمام حقوق زمیندار کو حاصل ہوتے ہیں۔ کاشتکار کو جو کچھ ملتا ہے، ایک خدمتگار (کمّی) کی حیثیت سے ملتا ہے۔ ان کی رُو سے، امیر آدمی عیش و عشرت کے تمام سامان جب جی چاہے حاصل کر سکتا ہے۔ غریب کو روٹی تک

بھی خیرات کے طور پر ملتی ہے۔ غرضیکہ ان قوانین کی رُو سے۔

ملاہے خُلق کو بھی، تا اُسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش "تجمل حسین خاں" کے لئے (دورش)

حتیٰ کہ ان اعتقادات کی رُو سے، امیر آدمی جنّت تک بھی روپے کے عوض خرید سکتا ہے لیکن غریب بچارے کو اپنی نجات خدا سے رو رو کر مانگنی پڑتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جس ماحول میں، زیردست مردوں کے متعلق اس قسم کے قوانین اور اعتقادات وضع ہوئے ہوں، اس میں عورت بچاری کے لئے کسی بہتر سلوک کی توقع کس طرح کی جاسکتی ہے۔

عورت کے معاملے میں تو استبداد کے علاوہ، مردوں کے دل میں نفرت اور حقارت کے جذبات بھی موجزن تھے۔ اس کی ایک خاص وجہ تھی۔ جیسا کہ میں متعدد بار لکھ چکا ہوں، ہمارا مروّجہ اسلام، یہودیوں کی رسوم پرستی، مجوسیوں (ایرانیوں) کی اشخاص اور نسل پرستی اور عیسائیوں کی خانقاہیت کا مرقع ہے۔

عیسائیت کا اثر عیسائیوں کی رہبانیت میں عورت کے متعلق بڑا گھناؤنا تصوّر تھا۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ عورت تمام گناہوں کا سرچشمہ ہے کیونکہ آدم بچارے کو جنّت سے نکلوانے کا موجب یہی تھی۔ اسے ابلیس کا ہیچہ سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ دنیا میں شر کا وجود اسی سے باقی تھا، اس لئے عیسائیت میں عورت تمام برائیوں کا مجسمہ، فلہذا سخت قابلِ نفرت شے سمجھی جاتی تھی۔ اسی تصوّر کی تہ میں جذبہ یہ کار فرما تھا کہ حضرت عیسےٰؑ کی تجرّد (بلا بیوی بچوں) کی زندگی کو شرفِ انسانیت کا نمونہ قرار دیا جائے۔ عیسائیوں کے ہاں تو یہاں تک بھی کہہ دیا گیا تھا کہ عورت میں روح ہی نہیں ہوتی۔

اس سے مجھے ایک دلچسپ بات یاد آگئی۔ ہمارے گاؤں میں ایک حکیم تھا، پریم سنگھ۔ ڈنگروں کا "ڈاکٹر" بھی وہی تھا اور انسانوں کا طبیب بھی وہی۔ ایک دفعہ والدہ کو درد گردہ کی تکلیف ہوئی۔ انہوں نے پریم سنگھ سے کہا کہ میرے گردے میں درد ہے اس کے لئے کوئی دوا دو۔ اس نے کہا کہ نہیں آپ کو گردے کا درد نہیں۔ والدہ کو اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ درد گردہ ہو چکا تھا اس لئے انہوں نے اصرار سے کہا کہ یہ درد گردہ ہی ہے۔ اس پر حکیم پریم سنگھ نے کہا کہ نہیں پھوپھی! آپ کو درد گردہ نہیں۔ عورت کے تو گردہ ہوتا ہی نہیں، (دل گردے" والے تو صرف مرد ہوتے ہیں) والدہ اس "حکیم" سے اور کیا کہتیں، اتنا ہی کہا کہ پریم سنگھ! محمد دین قصائی کے ہاں ہر روز بکری ذبح ہوتی ہے۔ اس میں سے اسی طرح دو گردے نکلتے ہیں جس طرح بکرے سے

پریم سنگھ نے کہا۔ پھوپھی! بکری کی اور بات ہے۔

بہرحال، میں کہہ یہ رہا تھا کہ عیسائیت کا یہ تصور کہ عورت سخت قابلِ نفرت شے ہے، مسلمانوں میں بھی منتقل ہو کر آ گیا۔ اور یہ اسی معاشرے میں ہوا جس کے استبداد کا ذکر اُوپر آ چکا ہے۔ یہ ہمارے "اسلامی تمدّن" کا وہ دَور تھا جس میں عورتیں (لونڈیاں بنانے کے لئے) بازاروں میں نیلام ہوا کرتی تھیں اور ہر شخص کو اجازت تھی کہ جتنی چاہے خرید لے اور جب جی چاہے انہیں فروخت کر دے۔ یہ سب کچھ "شریعت" کی رُو سے جائز تھا۔ اور مُلّا کی شریعت اسے اب بھی جائز قرار دیتی ہے۔

یہ تھا وہ ماحول جس میں اس "شریعت" کے قوانین مدوّن ہوئے جسے آجکل اسلام کہا جاتا ہے۔ ان قوانین میں احترامِ آدمیت کے آثار و نقوش ڈھونڈنا اور عورت کے صحیح مقام کی تلاش کرنا، اپنے آپ کو فریب دینا ہے۔ ان قوانین کی تائید و جواز میں اس قسم کی روایات وضع کر لی گئیں کہ "عورت ناقص العقل ہوتی ہے۔ یہ آدم کی پسلی سے پیدا ہوئی تھی اس لئے یہ پسلی کی ہڈی کی طرح ہمیشہ ٹیڑھی ہی رہے گی۔ اگر اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی جائے گی تو یہ ٹوٹ جائے گی لیکن سیدھی نہیں ہو گی۔ جس قوم کے امورِ زندگی میں عورت کی رائے کو دخل ہوگا وہ قوم تباہ ہو جائے گی"۔ وغیرہ ذالک

ہمارا ضابطۂ اخلاق

ان قوانین و اعتقادات کی روشنی میں جب ہمارا ضابطۂ اخلاق مرتّب ہوا تو اس میں عورت کے متعلق اس قسم کی لغویات کو مسلمات کی حیثیت سے داخل کر دیا گیا کہ

اگر نیک بودے سرانجامِ زن !
زناں را مزن نام بودے نہ زن

اگر عورت کی سرشت نیک ہوتی تو اس کا نام زن (مارو) نہ ہوتا، مزن (مت مارو) ہوتا:

چہ خوش گفت جمشید بارائے زن
کہ یا پردہ یا گور بہ جائے زن

جمشید نے اپنے مصاحب سے کیسی اچھی بات کہی کہ عورت کا بہترین مقام یا پردہ ہے یا گور۔

مشو ایمن از زن کہ زن پارسا ست
کہ خربستہ بہ گرچہ دُزد آشنا ست

اگر عورت پارسا ہو ---- تو بھی اس کی طرف سے مطمئن نہ رہو۔ کیونکہ اپنے گدھے کو باندھ کر ہی رکھنا
چاہیئے خواہ چور کیسا ہی درست کیوں نہ ہو۔

اگر تم اس سے بھی واضح تر الفاظ میں کچھ سننا چاہتی ہو تو ہیر وارث شاہ کو دیکھو، (جو پنجاب کے معاشرہ کا عکس ہے اور جسے قرآن کی طرح سند میں پیش کیا جاتا ہے) میں تمہیں اس کے کچھ متعلقہ اشعار لکھ کر بھیجتا، لیکن مشکل یہ ہے کہ اگر میں فارسی کا کوئی شعر لکھوں تو اس کا ترجمہ کر دوں اور اگر تمہاری اپنی زبان میں کچھ کہوں تو اس کا بھی مطلب سمجھاؤں۔ میں تو سمجھ ہی نہیں سکا کہ تم نئی پود کے بچے اسکول اور کالجوں سے کیا بن کر نکلتے ہو؟ اپنی زبان بھول جاتے ہو اور کوئی دوسری زبان اس انداز سے نہیں سیکھ پاتے کہ اس سے صحیح طور پر لطف اندوز ہو سکو۔ تمہارے دور کے بچے تو خیر پھر بھی کسی حد تک غنیمت تھے۔ آنے والی نسل کے متعلق تو یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ کیا بن رہی ہے۔ لیکن میں بھولا! تم اور تمہارے ساتھ کے بچے وہی کچھ بن کر نکلے تھے جو کچھ ہم نے انہیں بنایا تھا اور اب یہ آنے والے بچے بھی وہ کچھ بن کر نکلیں گے جو کچھ ہم انہیں بنا رہے ہیں۔ اس میں نہ تمہارا قصور ہے نہ آنے والے بچوں کا۔ بچوں کو تو جو کچھ بنایا جائے وہ وہی کچھ بن جاتے ہیں۔

وارث شاہ

وارث شاہ کے معاملے میں دوسری مشکل یہ بھی ہے کہ ایک باپ اپنی بیٹی کو وہ سب کچھ سنا بھی نہیں سکتا جو اس نے لکھا ہے۔ عورت کے متعلق اس نے نرم ترین الفاظ میں بھی جو لکھا ہے وہ یہ ہے کہ " ایہہ تریتاں مکھ دیاں کتیاں نیں " یعنی عورتیں مکر و فریب کی کتیاں ہوتی ہیں۔ یہ لفظ (کتیاں) ذرا تشریح طلب ہے۔ سورۂ یوسف میں زلیخا کے خاوند کا مشہور قول مذکور ہے کہ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ (۱۲/۲۸) ان عورتوں کی چال بڑی گہری ہے)، لیکن ہمارے ہاں اس قول کو اس طرح پیش کر دیا جاتا ہے گویا یہ خود خدا کا ارشاد ہے۔ کہیں عورت کے متعلق بات چھڑی اور ایک طرف سے جھٹ یہ آواز آگئی کہ میاں ان کے متعلق تو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں، خود اللہ میاں نے کہہ دیا ہے کہ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ۱۲/۲۸ اس کے بعد کون سی سند کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ وارث شاہ نے بھی اسی "ارشادِ خداوندی" کے تتبع میں فرما دیا کہ عورتیں "مکھ دیاں کتیاں" ہوتی ہیں۔ لفظ "کتیاں" میں ایک تو "كَيْدَكُنَّ" کے لفظ "کُنَّ" کا تلازمہ ہے۔ لیکن اس لفظ کے معنی بڑے جامع ہیں۔ تم نے گاؤں میں آک (مدار) کا بوٹا دیکھا تھا۔ اس میں آم کی شکل کا "پھل" بھی دیکھا تھا۔ اسے " آک کی کُتی " کہتے ہیں۔ شکل و شباہت کے اعتبار سے بالکل آم، لیکن سارا زہر سے بھرا ہوا۔ زبان سے لگ جائے تو حلق تک کڑوا ہو جائے۔ آنکھوں میں پڑ جائے تو آنکھیں

اندھی ہوجائیں۔ یہ ہے "گنی"۔ اس سے سمجھ لو کہ مکہ کی "گُنی" کے کیا معنی ہوئے۔ یہ ہے ہمارے معاشرے میں عورت کی تصویر۔ یعنی شکل ثمرِ بہشت کی اور خاصیت زہر کی۔

یہ تو خیر وارث شاہ کی باتیں ہیں جس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ معاشرہ کے سطحی طبقہ کا ترجمان ہے لیکن ہمارے ہاں کے اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کی بھی یہ حالت ہے کہ وہ بھی عورت کے ناقص العقل اور بے وقوف جاہل ہونے کی سند میں اعداد و شمار تک پیش کر دیتے ہیں یعنی پہلے تو عورت کو قرنہا قرن سے جہالت کی کوٹھڑیوں میں بند رکھا۔ یعنی اور اس کے بعد اس کی جہالت کو اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں بطور سند پیش کر دیا کہ عورت ہوتی ہی ناقص العقل ہے۔ یعنی پہلے تو چینی لڑکیوں کے بچپن ہی سے پاؤں باندھ دیئے اور جب اس طرح ان کے پاؤں چھوٹے چھوٹے رہ گئے تو انہیں بطور شہادت پیش کر دیا کہ چین کی عورتیں چلنے کے قابل ہی نہیں ہوتیں[1]۔

عورت اور قرآن

یہ کچھ طاہرہ! عورت کے ساتھ ان قوانین و ضوابطِ اخلاق نے کیا جو اُس دور کی پیداوار تھے جن کا ذکر اُوپر آ چکا ہے۔ لیکن ایک مسلمان کے لئے، عورت (یا مرد) کا صحیح مقام متعین کرنے کا معیار نہ تو یہ قوانینِ معاشرت ہیں اور نہ ہی یہ ضوابطِ اخلاق۔ اس کے نزدیک، اس آسمان کے نیچے، معیار فقط ایک ہی ہے، اور وہ ہے اسکے خدا کی کتاب، جس پر ایمان لانے کا وہ دعویدار ہے۔ قرآن نے عورت کو کون سا مقام دیا ہے۔ اس کی تفاصیل تو طول طویل ہیں۔ لیکن ان کا ماحصل کیا ہے، اس کے متعلق علامہ اقبال کا ایک لطیفہ یاد آگیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر میں مسلمان نہ ہوتا اور قرآن کا ویسے ہی مطالعہ کرتا تو اس نتیجے پر پہنچتا کہ یہ کتاب کسی عورت کی تصنیف ہے جس نے مرد سے اپنی صنف کے غصب کردہ حقوق کا بدلہ لیا ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب ایک طرف یہ دیکھا جائے کہ دنیا کے مختلف مذہبوں اور تہذیبوں میں عورت کو کن پستیوں میں دھکیلا گیا ہے اور دوسری طرف قرآن کو دیکھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس میں عورت کی طرفداری کی گئی ہے۔

(۱؎ حاشیہ صفحہ ۲۰) انقلابِ چین سے پہلے وہاں یہ رواج تھا کہ لڑکیوں کے پاؤں بچپن ہی سے کس کر باندھ دیتے تھے اسطرح وہ بڑھنے نہیں پاتے تھے چنانچہ چینی عورتیں بڑی مشکل سے چل پھر سکتی تھیں۔

قرآن نے سب سے پہلے اس عام تصوّر کی تردید کی کہ خدا نے پہلے مرد (آدم) کو پیدا کیا تھا اور اس کی پسلی سے عورت (حوّا) کو نکالا تھا۔ یہ تو تم سمجھ ہی چکی ہو، کہ قرآن کی رُو سے یہ تصور ہی غلط ہے کہ انسانوں کی پیدائش کا سلسلہ کسی خاص جوڑے (آدم اور حوا) سے شروع ہوا تھا۔ قرآن میں آدم (یعنی آدمی) کو نوعِ انسان کے نمائندے کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ نظریۂ ارتقاء کی رُو سے زندگی کی ابتدا ایک خلیۂ حیات (LIFE CELL) سے ہوتی ہے جو آگے چل کر خود بخود دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ایک (OVUM) یعنی مادہ کا

انسان کی پیدائش

خلیہ، اور دوسرے (SPERMATOZOON) یعنی نر کا خلیہ، قرآن میں بھی یہی بیان کیا گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ (اللہ وہ ہے جس نے تمہیں ایک جرثومۂ حیات سے پیدا کیا)، وَّخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا (اور اس جرثومۂ حیات سے اس کا جوڑا بنایا۔) یعنی وہ جرثومۂ حیات دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا اور پھر ان دونوں خلیوں کے امتزاج سے مردوں اور عورتوں کی بڑی تعداد دنیا میں پھیلا دی (وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَآءً (۴/۱) اس سے تم نے دیکھ لیا کہ قرآن کی رُو سے مرد اور عورت میں پیدائش کے اعتبار سے ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت یا سبقت حاصل نہیں۔ دونوں کا سرچشمۂ حیات ایک ہے اور دونوں ایک ہی اصل کی دو شاخیں ہیں۔

قرآن نے جہاں مرد اور عورت کو زوج کہا ہے[1] تو یہ نہیں کہا کہ عورت کو مرد کی زوج بنایا۔ بلکہ انسانوں

زوج

کو خطاب کر کے کہا کہ جَعَلَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا۔ (۴۲/۱۱ ، ۳۰/۲۱) اس نے تم میں سے تمہارے لئے زوج بنا دیئے۔ زوج کہتے ہیں رفیق اور ساتھی کو یعنی مرد اور عورت ایک دوسرے کے رفیق اور ساتھی ہیں۔ ایسے ساتھی کہ ان میں سے ایک کی تکمیل دوسرے کے ذریعے ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے زوج کے معنی ہوں گے COMPLEMENTARY TO EACH OTHER۔ مرد کی تکمیل عورت سے اور عورت کی تکمیل مرد سے ہوتی ہے۔ یہ ایک دوسرے کے زوج ہیں۔ بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ (بَعْضُکُمْ مِّنْ بَعْضٍ (۳/۱۹۵)) "تم ایک دوسرے میں سے ہو۔" اس لئے تم میں سے

---

[1] ہمارے ہاں صرف عورت کو مرد کی زوجہ کہتے ہیں، مرد کو عورت کا زوج نہیں کہتے، لیکن قرآن کریم میں عورت کو مرد کی زوج اور مرد کو عورت کا زوج کہا گیا ہے۔ یعنی ایک دوسرے کے رفیقِ سفر۔

کوئی بھی اکیلا مکمل نہیں کہلا سکتا۔

اس کے بعد قرآن نے اس عقیدے کی تردید کی کہ "جنت میں آدم کی لغزش کا موجب عورت ہوئی تھی"، یعنی اس عقیدے کی تردید کی کہ ابلیس نے عورت کو اپنے پھندے میں پھنسایا اور پھر عورت نے آدم کو بہکایا، جس کی وجہ سے دہ گناہوں کا مرتکب ہوا اور جنت سے نکالا گیا۔[1] قرآن نے کہا کہ مرد اور عورت، دونوں میں یکساں طور پر قانون کی پابندی اور قانون شکنی کی صلاحیت موجود ہے۔ غلط فیصلوں کا امکان دونوں سے ہے اور دونوں لغزش کھا سکتے ہیں۔ (فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَٰنُ عَنْهَا (۲/۳۶) اس لئے یہ سمجھنا غلط ہے کہ دنیا میں گناہ کی ذمہ داری عورت پر ہے۔ مرد بالکل معصوم ہے۔

مرد اور عورت دونوں واجب التکریم

یہ تو رہا منفی پہلو۔ اب آؤ مثبت پہلو کی طرف۔ قرآن نے کہا ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (۱۷/۷۰) "ہم نے بنی آدم کو واجب التکریم بنایا ہے" اس سے مراد صرف مرد نہیں، مرد اور عورت دونوں ہیں۔ عربی زبان کا یہ قاعدہ ہے کہ جب مرد اور عورت دونوں کا مشترکہ ذکر ہو تو "بنو فلاں" کہتے ہیں۔ قرآن میں "بنی اسرائیل" سے مراد قوم بنی اسرائیل کے صرف مرد ہی نہیں، مرد اور عورت سب ہیں۔ اس طرح جب قرآن نے کہا کہ ہم نے انسان کو "فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ" (۹۵/۴) پیدا کیا ہے۔ یعنی حسن کارانہ توازن کو لئے ہوئے تو اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ قرآن کا تخاطب "انسان" سے ہوتا ہے۔ صرف مردوں سے نہیں۔

قرآن کا مقصد یہیں سے لگے ہاتھوں تم اس نکتہ کو بھی سمجھ لو کہ قرآن کا مقصد یہ ہے کہ (۱) انسان کی صلاحیتوں کو نشوونما دے کر ان میں توازن[2] پیدا کر دے (۲) اس معاشرے میں توازن پیدا کیا جائے۔ جس میں ایک انسان کو دوسرے انسانوں سے واسطہ پڑتا ہے اور (۳) انسان اور کائنات کی قوتوں میں

---

[1] یہودیوں کی تورات میں ایسا ہی لکھا ہے۔

[2] توازن کے معنی ہیں صحیح صحیح وزن۔ جتنا جس چیز کو ہونا چاہیے۔ اسکا ٹھیک ٹھیک اتنا ہی ہو۔ حکیموں کے نسخوں میں دوائیوں کے وزن کو جو اہمیت ہوتی ہے اس سے کون واقف نہیں۔

توازن پیدا کیا جائے۔ یعنی انسانی زندگی کا سارا مقصود، قیامِ توازن ہے۔ اب تم یہ سوچو کہ جب (قرآن کی رُو سے) انسانی زندگی سے مراد مرد اور عورت دونوں کی زندگی ہے، تو کیا یہ کسی صورت میں بھی ممکن ہے کہ یہ توازن صرف ایک صنف (تنہا مردوں یا عورتوں) کے ذریعے سے پیدا ہو سکے۔ کیا اسکا تصوّر بھی کیا جاسکتا ہے کہ اَلْاِنْسَانَ (THE MAN) کے آدھے حصّے کو یکسر نظرانداز کر کے یہ سمجھ لیا جائے کہ انسانیت میں توازن پیدا ہو جائے گا۔ انسانی زندگی میں جو ناہمواریاں ہمیں نظر آرہی ہیں، ان کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ انسان نے اپنے آدھے حصے ہی کو پورا انسان سمجھ رکھا ہے۔ جس سے نہ تو زندگی کا کوئی مکمل نقشہ بنتا ہے اور نہ ہی اسے توازن نصیب ہوتا ہے۔ بلکہ اس کی حماقت تو اس سے بھی آگے بڑھتی ہے یعنی جس "آدھے حصّے" (مرد) کو اس نے "اَلْاِنْسَان" سمجھ رکھا ہے اس میں بھی اس قدر طبقاتی تقسیم کر دی ہے کہ اس کے (شاید) ننانوے فیصد حصّے کو "اَلْاِنْسَان" کی صف سے الگ کر رکھا ہے اور "انسان" تصور کر لیا گیا ہے فقط اس قلیل سے حصّے کو جسے اس نے اپنے خود ساختہ معیاروں کے مطابق "اوپر" کا طبقہ قرار دے رکھا ہے۔ اس میں نہ فکرِ انسانی کے نمائندے (کسی افلاطون کی) تخصیص ہے اور نہ ہی مذہبی دنیا کے ترجمان (کسی برہمن) کی تمیز۔ سب کے ہاں طبقاتی تقسیم موجود ہے۔ (لیکن یہ موضوع تمہارے سوال سے باہر کی چیز ہے اس لئے اس خط میں اس کے متعلق تفصیلی گفتگو کی گنجائش نہیں۔

تقسیمِ کار کا اصول

اب تم یہ دیکھو طاہرہ! کہ قرآن اس توازن کے لئے (جس کا ذکر اُوپر کیا گیا ہے) کیا نقشہ بتاتا ہے وہ کہتا ہے کہ تم کائنات میں غور کرو۔ ہر جگہ تقسیمِ کار کا اصول نظر آئے گا۔ سورج کا کام حرارت پہنچانا ہے۔ پانی کا کام ٹھنڈک اور نمی دینا۔ ہوا اپنی خصوصیات الگ رکھتی ہے اور مٹی کی خصوصیات الگ ہیں۔ لیکن بیج کی نشوونما ان سب مختلف اور متفرق قوتوں کے امتزاج (ملنے سے) ہوتی ہے۔ اس امتزاج میں ہر قوت کا اپنا اپنا حصہ ہے اور اپنا اپنا فریضہ۔ اس تقسیمِ کار میں کسی ایک قوت کو دوسری قوت پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ آگ کو پانی پر اس لئے فضیلت حاصل نہیں کہ وہ حرارت پہنچاتی ہے اور پانی ٹھنڈک۔ نہ ہی پانی کو آگ پر اس وجہ سے کوئی فوقیت حاصل ہے کہ وہ ٹھنڈک پہنچاتا ہے اور آگ حرارت۔ پانی اور آگ کی الگ الگ خصوصیات ہیں اور نظامِ کائنات میں توازن رکھنے کے لئے ان دونوں

؎ اس اجمال کی تفصیل خط کے آخری حصہ میں ملے گی۔

کی ضرورت ہے، اور اپنا اپنا مقام۔ ان کے باہمی امتزاج سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو کمی ایک عنصر میں ہے وہ دوسرا عنصر پوری کر دے۔ یعنی بیج کی نشوونما کے لئے حرارت کے علاوہ ٹھنڈک کی بھی ضرورت تھی۔ چونکہ سورج کی کرنوں میں اس کی کمی تھی اس لئے پانی نے اسے پورا کر دیا۔ اسی طرح پانی میں حرارت کی کمی تھی اس کی اس کمی کو سورج نے پورا کر دیا۔ لہٰذا ان دونوں کی رفاقت سے مقصود یہ ہے کہ ایک کی کمی دوسرے کے تعاون سے پوری ہو جائے۔ یہ ہے ان کا صحیح صحیح مقام۔ لیکن اگر ان میں سے (مثلاً حرارت یہ سمجھ لے کہ میں پانی سے افضل ہوں۔ کیونکہ میں وہ کام کر سکتی ہوں جو یہ پانی نہیں کر سکتا تو یہ اس کی حماقت ہے۔

جو کچھ خارجی کائنات میں ہو رہا ہے۔ وہی کچھ انسانی معاشرہ میں مقصود ہے۔ یہاں بھی تقسیم عمل کا اصول کارفرما ہے۔ انسانی دنیا میں، مرد اور عورت دو ہی مختلف عناصر ہیں۔ ان میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں لیکن کچھ خصوصیات ایسی ہیں جو ایک میں ہیں اور دوسرے میں نہیں۔ قانونِ کائنات کے مطابق یہاں بھی ایک کی خصوصیات کی کمی، دوسرے کی رفاقت سے پوری ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے ایک صنف کو دوسری صنف پر فضیلت حاصل ہے۔ فَضَّلَ اللّٰہُ بِہٖ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ (۴/۳۲)۔ یعنی اگر ایک خصوصیت کے اعتبار سے مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے تو دوسری خصوصیت کے لحاظ سے عورتوں کو مردوں پر فوقیت ہے ان میں سے کسی ایک صنف (مرد یا عورت) کا یہ سمجھ لینا کہ چونکہ مجھ میں ایک ایسی خصوصیت ہے جو صنفِ مقابل میں نہیں، اس لئے میں اس سے افضل ہوں، غلط بینی پر مبنی ہے۔ صحیح زاویۂ نگاہ یہ ہونا چاہیئے کہ مجھ میں ایک ایسی کمی ہے جو صنفِ مقابل کی رفاقت سے پوری ہو سکتی ہے۔ یعنی میری تکمیل کے لئے اس کی رفاقت (تزویج[1] لابنفک ضروری) ہے اس لئے میں اس سے افضل نہیں ہوں، بلکہ اپنی تکمیل کے لئے اس کی "زوجیت" (رفاقت) کا محتاج ہوں۔ اسی بنا پر قرآن نے مرد اور عورت کے باہمی تعلق کی نسبت فرمایا کہ جَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً ط (۳۰/۲۱)، اللہ نے تم میں باہمی مودّت اور رحمت پیدا کی ہے۔ اس میں مودّت اور رحمت کے الفاظ غور طلب ہیں۔ مودّت کے عام معنی تو کشش اور محبت کے ہیں، لیکن وَدٌّ کہتے ہیں اس میخ کو جس سے دو چیزیں اس طرح آپس میں جڑ جائیں کہ ایک دوسرے کی تقویت کا باعث بن جائے۔ اسی بنا پر کسی شے کی صلاحیتوں کے کامل مظاہرے کو مودّۃ کہتے ہیں۔ مرد اور عورت کے اس طرح باہم گیر پیوست ہو

---

[1] جوڑا بننا

جاننے کے لئے قرآن نے دوسری جگہ انہیں لباس سے تشبیہہ دی ہے جہاں فرمایا کہ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (۲/۱۸۷) "تم ایک دوسرے کے لئے بمنزلہ لباس کے ہو جس کا بدن کے ساتھ پورا پورا اختلاط ہوتا ہے۔

دوسرا لفظ رحمت ہے جس کے معنی سامانِ پرورش کے ہیں۔ (اس طرح کی پرورش و حفاظت جس طرح رحمِ مادر میں بچے کی ہوتی ہے۔) لہٰذا جَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً کا مطلب یہ ہوا کہ مرد اور عورت کی باہمی رفاقت سے ایک دوسرے کی صلاحیتیں نشوونما پاتی اور توازن پذیر ہوتی ہیں لہٰذا مرد کا یہ سمجھنا کہ میں عورت سے افضل ہوں، ایک خود ساختہ پندار ہے جس کا قانونِ کائنات کی میزان میں کوئی وزن نہیں۔

عورت کی منفرد خصوصیات

جیسا کہ میں اُوپر لکھ چکا ہوں، مرد اور عورت میں بیشتر انسانی خصوصیات مشترک ہیں۔ مثلاً عقل و بصیرت کی خصوصیت۔ زندگی کے ان گوشوں میں جن میں ان کی خصوصیات مشترک ہیں، یہ دونوں دوش بدوش چلیں گے۔ لیکن اس تقسیم عمل کی رُو سے (جس کا ذکر اوپر آچکا ہے)، عورت کو حیاتیاتی طور پر (BIOLOGICALLY) ایسا بنایا گیا ہے[1] کہ اس میں بچے کی تولید[2] و پرورش کے لئے ایسی خصوصیات ہیں جن سے مرد محروم ہیں۔ عورت کی یہ خصوصیات معاشرہ کی ایک بنیادی ضرورت (اور بڑی ہی ایک بہت بڑی کمی) کو پورا کرتی ہیں۔ اس اعتبار سے عورت کا درجہ مرد سے فائق ہے۔ بچے کی تربیت ماں کی گود میں ہوتی ہے۔ جس قسم کی اس کی تربیت ہوگی، اسی قسم کا وہ بچہ ہوگا اور جس قسم کے قوم کے بچے ہوں گے، اسی قسم کی وہ قوم ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ عربی زبان (اور خود قرآنِ مجید میں) قوم کے لئے اُمّت کا لفظ آیا ہے۔ اس لفظ (اُمّت) کا مادہ (یعنی ROOT) اُمّ ہے، جس کے معنی "ماں" کے ہیں۔ لہٰذا، قرآنِ کریم کی رُو سے، اُمّت (قوم) کی تخلیق و تشکیل کی ذمہ دار ماں ہے۔ یہ ہے عورت کی وہ خصوصیت جس سے مرد محروم ہیں۔ ذرا سوچو کہ اس اعتبار سے عورت کتنی بڑی ذمہ داریوں کی حامل، اور کتنے عظیم مقام کی مالک ہے لیکن ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں

---

[1] یعنی جسمانی ساخت کے اعتبار سے۔ [2] پیدا کرنے

عورت کی زندگی کا بیشتر حصّہ صرف ہو جاتا ہے اس دوران میں وہ طبعی طور پر (PHYSICALLY) اس قابل نہیں ہوتی کہ زندگی کے ان شعبوں میں جن میں سخت محنت و مشقّت کی ضرورت ہوتی ہے۔ حصّہ لے سکے۔ اس سے معاشرہ میں ایک کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اس کمی کو مرد پورا کرتا ہے۔ وہ اپنا پورا وقت وسائل پرورش بڑھانے میں صرف کر سکتا ہے۔ (اسی کو اکتساب رزق کہتے ہیں) ظاہر ہے کہ یہ چیز مرد کے لئے عورت پر افضلیت کا موجب نہیں بن سکتی۔ عورت اس کی ایک کمی کو پورا کرتی ہے، یہ اُس کی کمی کو پورا کرتا ہے۔ یا یوں سمجھو کہ عورت ایک طرح سے معاشرہ میں اضافہ کا موجب بنتی ہے۔ مرد دوسری طرح سے۔ ایک کو ایک جہت سے افضلیت حاصل ہوتی ہے، دوسرے کو دوسری جہت سے۔ فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ [۴:۳۴] "اللہ نے ایک کو دوسرے پر (مختلف خصوصیات کی رُو سے) افضلیت دی ہے"۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ تمہارے خود ساختہ تصوّرات ہیں جن کی رُو سے تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ چونکہ مرد کماتا ہے اور اُس کی کمائی عورتوں پر صرف ہوتی ہے، اس لئے مرد کو عورت پر افضلیت حاصل ہے[1]۔ اور تم اُس خود ساختہ معیارِ فضیلت کو اس حد تک کھینچ کر لے گئے ہو کہ عورت کے دل میں رہ رہ کر یہ سوال اُٹھتا ہے کہ میں عورت کیوں بن گئی، مرد کیوں نہ بنی؟ وہ کہتا ہے کہ جس معاشرہ کا تصوّر میں پیش کرتا ہوں اس میں کبھی عورت کے دل میں اس قسم کا خیال بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے اس نے کہا ہے کہ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰی بَعْضٍ (۴:۳۲) "اللہ نے جو خصوصیّات تم میں سے ایک صنف کو دی ہیں وہ ایسی باعثِ امتیاز ہرگز نہیں کہ ان کی بنا پر صنفِ مقابل یہ آرزو کرنے لگ جائے کہ مجھے دوسری صنف کی خصوصیات کیوں نہ مل گئیں"۔ مرد اور عورت کے جو میدان الگ الگ ہیں ان کے اعتبار سے ان کی خصوصیات میں اختلاف ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ دونوں اپنے اپنے میدان میں، فرائض مفوّضہ کو پوری پوری محنت اور حسن و خوبی سے سرانجام دیتے ہیں یا نہیں۔ اپنے اپنے میدان میں جو جس قدر سعی و عمل کرے گا اسی کے مطابق معاشرہ کی خوشگواریوں میں اس کا حصّہ ہوگا۔ لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ (۴:۳۲)، تم صرف یہ آرزو کیا کرو کہ جو تمہارا میدان ہے اس میں تمہیں سعی و عمل کی زیادہ سے زیادہ صلاحیّت و توفیق نصیب

---

[1] اگر یہ اصول صحیح مان لیا جائے کہ کمانے والوں کو کھانے والوں پر افضلیت ہوتی ہے تو بڑے بڑے مدبّرین، مفکرین اور ایجادات کرنے والوں پر، کاشتکاروں کو ہمیشہ افضلیت ہونی چاہیئے اور میدانِ جنگ میں لڑنے والے مجاہدین کا درجہ مزدوروں سے بہت نیچا ہونا چاہیئے۔ کیونکہ مفکر، مدبّر اور سپاہی اناج پیدا نہیں کرتے۔

ہو۔ وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ط ۴/۳۲

مشترکہ صلاحیتیں تقسیم عمل کے اس فرق کو چھوڑ کر باقی انسانی صلاحیتیں مرد اور عورت دونوں میں موجود ہیں۔ سورۂ احزاب میں دیکھو، کس طرح ان صلاحیتوں میں مردوں اور عورتوں دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ چلا جاتا ہے:۔

اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِیْنَ وَ الْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَ الْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِیْنَ وَ الصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰکِرِیْنَ اللّٰهَ کَثِیْرًا وَّالذّٰکِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا ○ (۳۳/۳۵)

"اگر مردوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ قانونِ خداوندی کی اطاعت سے اپنی تکمیلِ ذات کر سکتے ہیں تو عورتوں میں بھی اس کی صلاحیت ہے۔ (اَلْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ) اگر مرد اس پارٹی (جماعت) کے رکن بن سکتے ہیں جو خدا کے قانون کے اٹل نتائج پر یقین رکھتے ہوئے امنِ عالم کی ذمہ دار ہو تو عورتیں بھی اس جماعت کی اسی طرح رکن ہو سکتی ہیں (اَلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَات) اگر مردوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنی استعداد کو اس طرح سنبھال کر رکھیں کہ ان کا استعمال صرف قانونِ خداوندی کے مطابق ہو تو یہی صلاحیت عورتوں میں بھی ہے۔ (وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰت) اگر مرد اپنے دعوئے ایمان کو سچ کر دکھانے کے اہل ہیں، تو عورتیں بھی اس کی اہل ہیں (وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰت) اگر مرد ثابت قدم رہ سکتے ہیں تو عورتیں بھی رہ سکتی ہیں (وَالصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرٰتِ) اگر مرد اس خصوصیت کے حامل ہو سکتے ہیں کہ جوں جوں ان کی صلاحیتیں بڑھتی جائیں، وہ شاخِ ثمردار کی طرح قانونِ خداوندی کی اطاعت میں اور جھکتے چلے جائیں تو یہی خصوصیت عورتوں میں بھی ہے۔ (وَالْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ) اگر مردوں میں ایثار کا مادہ ہے تو عورتوں میں بھی ہے۔ (وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ) اگر مرد اپنے آپ پر ایسا کنٹرول رکھ سکتے ہیں کہ انہیں جہاں سے روکا جائے وہ رک جائیں، تو عورتوں میں بھی اس کی صلاحیت ہے۔ (وَالصّٰٓئِمِیْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ) اگر مرد اپنے جنسی میلانات کو ضوابط کی پابندی میں رکھ سکتے ہیں تو عورتیں بھی ایسا کر سکتی ہیں (وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ) اگر مرد قانونِ خداوندی کو شعوری طور پر سمجھنے اور اسے ہر وقت پیشِ نظر رکھنے کے اہل ہیں تو عورتیں

میں بھی اس کی اہلیت ہے (وَالذّٰکِرِیْنَ اللّٰہَ کَثِیْرًا وَّالذّٰکِرَاتِ) جب یہ صلاحیتیں دونوں میں موجود ہیں تو ان کے نتائج بھی دونوں کے لئے یکساں طور پر موجود ہونے چاہئیں۔ فلہذا نظامِ خداوندی میں دونوں کے لئے حفاظت کا سامان اور اجرِ عظیم موجود ہے۔ (اَعَدَّ اللّٰہُ لَھُمْ مَّغْفِرَۃً وَّ اَجْرًا عَظِیْمًا ۝)

قرآن کی ان تفاصیل پر غور کرو طاہرہ! اور پھر سوچو کہ زندگی کا وہ کون سا گوشہ ہے جس کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ مرد میں تو اس کی صلاحیت ہے اور عورت میں نہیں۔ مرد تو یہ کچھ کر سکتا ہے اور عورت نہیں کر سکتی۔ مرد تو یہ کچھ بن سکتا ہے مگر عورت نہیں بن سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ مرد اور عورت دونوں کے صلاحیت بخش اعمال نتیجہ خیز ہوں گے اور دونوں دوش بدوش جنت میں داخل ہوں گے۔ گھر کی جنت میں، معاشرے کی جنت میں اور پھر اس زندگی سے متصل، اگلی زندگی کی جنت میں (وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ وَلَا یُظْلَمُوْنَ نَقِیْرًا ۴/۱۲۴) ان میں سے کسی کے کام کا نتیجہ ضائع نہیں ہوگا۔ (لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی ج ۳/۱۹۵)

تم نے دیکھ لیا طاہرہ! کہ قرآن کی رُو سے:۔

(۱) انسانیت کی تمام صلاحیتیں مردوں اور عورتوں میں موجود ہیں۔ ان صلاحیتوں کی نشوونما اور ان کا صحیح صحیح مصرف، مقصودِ حیات ہے۔ لہٰذا اس باب میں مردوں اور عورتوں میں کسی قسم کا فرق نہیں۔ دونوں "جنت میں داخل ہونے" کے اہل ہیں۔ اس لئے ان میں سے کسی صنف کو دوسری صنف پر کوئی وجۂ امتیاز نہیں۔

البتہ تقسیمِ کار کے کائناتی اصول کی بنا پر بعض فرائض ایسے ہیں جنہیں صرف عورت ہی سرانجام دے سکتی ہے اس اعتبار سے عورت معاشرہ میں مرد کی ایک بہت بڑی کمی کو پورا کرتی ہے۔ لیکن عورت کی زندگی کا ایک حصہ انہی فرائض کی سرانجام دہی میں صرف ہو جاتا ہے اور وہ طبعی طور پر اکتسابِ رزق کے کاموں میں حصہ نہیں لے سکتی۔ معاشرہ کی اس کمی کو مرد پورا کرتا ہے لیکن جس طرح عورت، مرد پر یہ احسان نہیں رکھ سکتی کہ وہ ان فرائض کو سرانجام دیتی ہے جن کی سرانجام دہی مرد کے لئے ممکن نہیں، اسی طرح مرد بھی عورت پر یہ کہہ کر تحکم نہیں جما سکتا کہ وہ کماتا ہے اور عورت اپنی زندگی کے بیشتر حصہ میں کمانے سے معذور رہتی ہے۔

(iii)۔ معاشرہ کا توازن اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے کہ قانونِ کائنات کی رُو سے جو فریضہ جس کے سپرد کیا

گیا ہے وہ اسے نہایت حسن وخوبی سے سرانجام دے۔

(۷) اس اعتبار سے کاروبارِ زندگی کے دو دائرے بن گئے۔ ایک دائرہ وہ جس کے فرائض صرف عورت سرانجام دے سکتی ہے اور دوسرا دائرہ وہ جس میں مرد اور عورت دونوں مشترکہ طور پر شریک ہو سکتے ہیں۔

(۷) جس طرح یہ غلط ہوگا کہ عورت ان فرائض کو سرانجام نہ دے جن کی خصوصیت صرف (EXCLUSIVELY) اسی کے حصّہ میں آئی ہے۔ اسی طرح یہ بھی غلط ہوگا کہ اسے اسی دائرہ کے اندر محبوس کر دیا جائے اور مشترکہ دائرے میں آنے کی اجازت ہی نہ دی جائے۔ ان دونوں صورتوں میں معاشرہ کا نظام بگڑ جائے گا۔

مرد عورتوں پر حاکم ہیں

قرآن کی ان تصریحات کے بعد، اب اس آیت کو دیکھو جو تمہارے لئے اس درجہ وجہِ پریشانی بن رہی ہے۔ آیت یہ ہے:۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَہُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِہِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ ؕ وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَہُنَّ فَعِظُوْہُنَّ وَاہْجُرُوْہُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْہُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَکُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْہِنَّ سَبِیْلًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیًّا کَبِیْرًا ○ (۴/۳۴)

تم اپنی پریشانی میں بھی سچی ہو، اس لئے کہ تم قرآن کو انہی ترجموں سے سمجھ سکتی ہو جو ہمارے ہاں مروّج ہیں اور ان ترجموں سے انسان بے شک اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے جس تک تم پہنچی ہو۔ یہی ترجمے تو ہیں جن کی بناء پر مرد اپنے "ڈنڈے" کے جواز میں اس آیت کو "خدائی سند" کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اس آیت کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے:۔

"مرد حاکم ہیں اُوپر عورتوں کے بہ سبب اس کے کہ بزرگی دی اللہ نے بعضے ان کے کو اُوپر بعض کے اور بہ سبب اس کے کہ خرچ کرتے ہیں مالوں اپنے سے، پس نیک بخت عورتیں فرماں بردار ہیں۔ نگہبانی کرنے والی ہیں بیچ غائب کے ساتھ محافظت اللہ کے۔ اور جو عورتیں کہ تم ڈرتے ہو چڑھائی ان کی سے۔ پس نصیحت کرو ان کو اور چھوڑ دو ان کو بیچ خواب گاہ کے۔ اور مارو ان کو پس اگر کہا مانیں تمہارا پس مت ڈھونڈو اوپر ان کے راہ تحقیق اللہ ہے بلند بڑا۔" (ترجمہ شاہ رفیع الدین)

یعنی چونکہ مرد کماتے ہیں اور عورتوں پر اپنا روپیہ صرف کرتے ہیں اس لئے وہ عورتوں پر حاکم ہیں۔ عورت کا کام یہ ہے کہ وہ مرد کی فرمانبردار رہے اور اگر اس کی فرمانبرداری میں کوئی فرق آجائے تو مرد کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ اسے مارے پیٹے۔

یہ ہے عورت کی پوزیشن اس قرآن کی رُو سے جو ہمارے مروّجہ ترجموں سے سمجھا جاتا ہے۔ قبل اس کے کہ میں اس آیت کے صحیح مفہوم تک پہنچوں، تمہیں لگے ہاتھوں ایک اہم نکتہ سمجھائے دیتا ہوں۔ جب میں کہتا ہوں کہ ہمارے مروجہ ترجمے قرآن کا صحیح مفہوم پیش نہیں کرتے تو اس پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ بزرگ جنہوں نے یہ ترجمے کئے تھے، عربی کے بڑے بڑے عالم تھے۔ پھر کیا ہوا کہ یہ صحیح ترجمہ نہ کر سکے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے وہ ممالک بھی موجود ہیں جن کے باشندوں کی مادری زبان عربی ہے، اگر وہ بھی قرآن کا صحیح مفہوم نہیں سمجھتے تو پھر اور کون صحیح مفہوم سمجھے گا۔

یہ اعتراضات بڑے وزنی ہیں اس لئے ان کے جواب کے لئے اصل حقیقت کا سمجھنا نہایت ضروری ہے۔

ترجمے صحیح کیوں نہیں ہوتے

جن بزرگوں نے یہ ترجمے کئے ہیں ان کے سامنے یہ سوال تھا کہ یہ کیسے متعین کیا جائے کہ قرآن کے فلاں لفظ کا مفہوم کیا ہے۔ انہیں لامحالہ اہل زبان ہی کی طرف رجوع کرنا تھا ہمارے ہاں تیسری صدی ہجری سے لیکر ان بزرگوں تک سینکڑوں تفاسیر عربی زبان میں لکھی گئی تھیں ان میں سے بعض مفسرین تفسیر کے علاوہ عربی ادب کے بھی امام تسلیم کئے جاتے ہیں۔ مثلاً تفسیر کشاف کے مصنف، علامہ زمخشری یا مثلاً تفسیر جلالین جس میں التزام یہ کیا گیا ہے کہ قرآن کے الفاظ کے مرادف عربی الفاظ لکھ دیئے گئے ہیں۔ ہمارے مترجمین کے لئے عربی کی ان تفسیروں میں بیان کردہ مفہوم سند کا درجہ رکھتا تھا۔ اسی طرح عربی ممالک کے باشندوں کے لئے بھی ان عربی تفاسیر میں بیان کردہ مفہوم سند کا درجہ رکھتا ہے۔ یعنی جو کچھ ان عربی کی تفسیروں میں لکھا گیا ہے، اسے قرآن کا صحیح مفہوم سمجھا جاتا ہے۔ اس سے تمہیں معلوم ہو گیا ہو گا کہ ہمارے ترجموں میں قرآن کا جو مفہوم دیا گیا ہے (یا جو مفہوم خود عربی بولنے والے سمجھتے ہیں) وہ دراصل قرآن کا وہ مفہوم ہے جو ہمارے اسلاف کی تفاسیر میں درج ہو چکا تھا۔ مثال کے لئے یہی زیر نظر آیت دیکھو۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ میں قَوّٰامُوْنَ کا ترجمہ کیا گیا ہے حاکم۔ ہمارے بزرگوں نے قوامون کا مفہوم سمجھنے کے لئے ان عربی تفاسیر کو دیکھا، تو کشاف میں اس کا مفہوم لکھا تھا مسیطرین یعنی داروغے۔ اور جلالین میں لکھا تھا متسلطین۔ یعنی عورتوں پر مسلّط۔ اب ظاہر ہے کہ جب ہمارے

مترجمین نے دیکھا کہ یہ ائمہ تفسیر وادب، قوّامون کا مفہوم مسیطرین اور متسلّطین بتاتے ہیں تو انہوں نے اس کا ترجمہ حاکم کر دیا۔ یہ ان الفاظ کا صحیح ترجمہ ہے۔ لیکن یہ ترجمہ قرآن کے لفظ قوّامون کا نہیں بلکہ قوّامون کے اس مفہوم کا ترجمہ ہے جو کشاف اور جلالین میں دیا گیا ہے۔ لہٰذا ہمیں (ان ترجموں کے بجائے) یہ دیکھنا چاہیئے کہ ان تفاسیر میں یہ مفہوم کس طرح آ گیا۔

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، یہ تفاسیر اس دور میں لکھی گئی تھیں، جب ہمارے معاشرے پر ملوکیت کا استبداد غالب آ چکا تھا اور ہماری "شریعت" اور "طریقت" مجوسیوں، یہودیوں اور عیسائیوں کے تصورات سے متاثر ہو چکی تھی۔ ان تفاسیر میں سب سے پہلے طبری کی تفسیر لکھی گئی۔ (باقی تفسیریں درحقیقت اسی تفسیر پر لکھی ہوئی "طرحی غزلیں" ہیں) طبری کا انداز یہ ہے کہ اس میں قرآن کا مفہوم روایات کی رُو سے متعین کیا گیا ہے۔ یہ چیز میرے متعدد مضامین میں بیان کی جا چکی ہے کہ روایات کس طرح وضع ہوئیں اور انہیں کیسے مرتب اور جمع کیا گیا۔ روایات کی تاریخ سے اس حقیقت کا سمجھنا مشکل نہیں رہ جاتا کہ روایات کے وضع کرنے میں کوئی دشواری ہی نہ تھی۔ یہ روایات عکس ہیں اس معاشرے کا جس میں یہ وضع کی گئی تھیں (نہ کہ رسول اللہ کے عہد مبارک کا) اب ظاہر ہے کہ قرآن کا جو مفہوم ان روایات کی رُو سے متعین کیا گیا تھا وہ کس قسم کا ہوگا۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے پھر اسی آیت کی مثال سامنے لاؤ جو اس وقت زیر نظر ہے۔

روایات

ہم نے دیکھا ہے کہ کشاف وغیرہ نے قوّامون کا مفہوم متسلّطین اور مسیطرین بیان کیا ہے۔ اور اسی آیت سے عورتوں کو مارنے پیٹنے کا جواز نکالا ہے۔ اس آیت کی "شانِ نزول" میں جو روایات ہماری کتابوں میں لکھی ہیں ان میں لکھا گیا ہے کہ ایک عورت نے نبی اکرم ؐ سے اپنے خاوند کی شکایت کی کہ اس نے اُسے تھپڑ مارا ہے۔ آپ ؐ نے بدلہ لینے کا حکم دیا ہی تھا کہ یہ آیت نازل ہو گئی اور حضور ؐ کو اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا۔ دوسری روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں کو مارا نہ کرو۔ اس کے بعد حضرت عمر رضؓ آپ ؐ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ عورتیں آپ ؐ کے حکم کو سُن کر اپنے خاوندوں پر دلیر ہو گئی ہیں۔ اس پر آپ ؐ نے انہیں مارنے کی اجازت دے دی۔ اب مردوں کی طرف سے دھڑا دھڑ مار پیٹ شروع ہو گئی اور بہت سی عورتیں شکایت لے کر آپ ؐ کے پاس آئیں۔ اس پر آپ ؐ نے مردوں سے کہا کہ جو لوگ عورتوں کو مارتے ہیں وہ اچھا نہیں کرتے لیکن جب آپ ؐ نے عورتوں کو اس کا بدلہ دلوانا چاہا تو یہ آیت نازل ہو گئی۔ لہٰذا حکم یہی رہا کہ چونکہ مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس لئے انہیں مار پیٹ سکتے ہیں۔

پہلا خط

چنانچہ حضرت اشعث رضؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت عمرؓ کا مہمان ہوا۔ اتفاقاً میاں بیوی میں ناچاقی ہوگئی اور حضرت عمرؓ نے اپنی بیوی کو مارا۔ پھر مجھ سے فرمانے لگے کہ اشعثؓ! تین باتیں یاد رکھو جو میں نے رسول اللہؐ سے سن کر یاد کر رکھی ہیں ایک تو یہ کہ مرد سے یہ نہ پوچھا جائے کہ اس نے بیوی کو کس بنا پر مارا۔ دوسرے یہ کہ وتر پڑھے بغیر نہ سونا اور تیسری بات راوی کے ذہن سے نکل گئی۔

یہی نہیں کہ مردوں کو عورتوں پر حاکم مقرر کیا گیا ہے۔ بلکہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اگر میں کسی کو حکم کر سکتا کہ وہ ماسوائے اللہ کے دوسرے کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ (اس حدیث کی تشریح میں اور احادیث بھی ہیں لیکن وہ ایسی نہیں جنہیں ایک باپ اپنی بیٹی کو لکھ سکے۔

یہ ہیں وہ روایات جو زیر نظر آیت کی تفسیر میں ہماری سب سے قدیم کتب تفاسیر میں مذکور ہیں۔ انہی روایات کی بنا پر قوّامون کا مفہوم متسلّطین (غلبہ و تسلّط کے مالک) اور مسیطرین (داروغہ) لیا گیا اور اسی مفہوم کا ترجمہ ہمارے ہاں حاکم کیا گیا۔ پھر انہی کے مطابق ہماری فقہ کے احکام مدوّن ہوئے۔ چنانچہ جصّاص نے احکام القرآن میں انہی روایات و تفاسیر کی بناء پر عورتوں کو مارنے پیٹنے اور بند رکھنے کے تمام فقہی قوانین بیان کر دیئے ہیں۔

ایک اور دشواری

ان روایات کی وجہ سے ایک بڑی مشکل اور بھی واقع ہوگئی۔ اگر ہمارے یہ مفسرین حضرات، قرآنی آیات کا مفہوم اپنی طرف سے متعیّن کرتے تو بعد میں آنے والوں کے لئے اتنی گنجائش رہ سکتی تھی کہ ان کے بیان کردہ مفہوم سے اختلاف کر سکتے لیکن جب انہوں نے اپنے بیان کردہ مفہوم کی تائید میں رسول اللہؐ کی طرف منسوب کردہ احادیث درج کر دیں تو ان کا متعیّن کردہ مفہوم رسول اللہؐ کا بیان کردہ فرمودہ مفہوم قرار پا گیا۔ اس کے بعد کس کی مجال تھی کہ وہ اس مفہوم سے اختلاف کا خیال تک بھی ذہن میں لا سکتا۔ چنانچہ جس کسی نے اس مفہوم سے اختلاف کا خیال ظاہر کیا اسے فوراً کہہ دیا گیا کہ تم قرآن کو زیادہ سمجھتے ہو یا رسول اللہؐ زیادہ بہتر سمجھتے تھے؟ اب کون سا ایسا سوختہ بخت مسلمان ہے جو یہ کہہ سکے کہ میں رسول اللہؐ سے بھی بہتر قرآن سمجھتا ہوں۔ اس طرح ان تفاسیر میں بیان کردہ مفہوم ابدی طور پر مستند قرار پا گئے۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ یہ مفہوم رسول اللہؐ کے متعیّن فرمودہ نہیں تھے۔ بلکہ یہ ان روایات کی رُو سے متعین کئے گئے تھے جو رسول اللہؐ کی وفات کے سینکڑوں سال بعد وضع کی گئیں۔ رسول اللہؐ کا متعیّن فرمودہ مفہوم وہ ہو سکتا تھا جسے رسول اللہؐ قرآن کے ساتھ خود ایک کتاب میں لکھ کر یا لکھوا کر مستند طور پر اُمّت کو دے کر جاتے۔ رسول اللہؐ نے کوئی ایسی تفسیر

اُمّت کو نہیں دی۔ اس لئے ان کتب تفسیر میں بیان کردہ مفہوم رسول اللہ کا نہیں، خود ہمارے مفسّرین کا مفہوم ہے جو اس دور میں متعیّن کیا گیا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ لیکن جس کی تائید میں وہ روایات درج کر دی گئیں جو رسول اللہ کی طرف منسوب کی جاتی تھیں۔

اب تم نے سمجھ لیا ہوگا طاہرہ! کہ "الرجال قوامون علے النساء" میں قوامون کا ترجمہ، حاکم، متسلّط اور داروغہ کس طرح کیا گیا۔ اس مقام پر ایک لطیف بات کا ذکر بھی فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی کو اس کا احساس ہؤا کہ ان روایات کی رُو سے ممکن ہے کوئی غیر مسلم یہ اعتراض کر دے کہ رسول اللہ نے عورتوں کے ساتھ اس قسم کے سخت سلوک کی اجازت دے دی؟ اب دیکھو کہ اس اعتراض سے بچنے کی صورت کیا پیدا کی گئی! ایک روایت میں ہے کہ جب آپ نے اس عورت کو جس نے اپنے خاوند کی شکایت کی تھی، بدلہ لینے کی اجازت دی تو خدا کی طرف سے یہ آیت نازل ہو گئی۔ اس پر رسول اللہ نے فرمایا۔ اَرَدْنَا اَمْرًا وَّاَرَادَ اللّٰهُ غَيْرَهٗ یعنی ہم نے کچھ اور چاہا تھا اور اللہ نے اس کے خلاف حکم دے دیا۔ تم سمجھیں طاہرہ! کہ یہ بات کیا ہوئی! اس سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی کہ رسول اللہ تو چاہتے تھے کہ عورتوں سے عدل وانصاف کیا جائے لیکن جب خدا نے اس کے خلاف حکم دے دیا تو رسول اللہ مجبور ہو گئے۔ لہٰذا آپ کو بھی اسی کے مطابق تعلیم دینی پڑی۔

اس روایت کے وضع کرنے والے نے بزعم خویش، رسول اللہ کو تو اس اعتراض سے بچا لیا، لیکن اتنا نہ سوچا کہ وہی اعتراض اب خود خدا پر بھی عاید ہو گیا۔ بلکہ اعتراض کی شدّت اس اعتبار سے اور بھی بڑھ گئی کہ خود رسول اللہ نے خدا کے حکم کی سختی کو محسوس کیا، جبھی تو کہا کہ ہم کچھ اور چاہتے تھے اور خدا نے کچھ اور ہی حکم دے دیا۔ صاف نظر آتا ہے کہ یہ روایت وضعی ہے۔ اس لئے رسول اللہ جو اپنی مرضی کو پورے پورے طور پر خدا کی مرضی (یعنی قانون خداوندی) سے ہم آہنگ رکھتے (اور ہم آہنگ رکھنے کی تمنا کرتے) تھے، کبھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہم کچھ اور چاہتے تھے اور خدا نے کچھ اور حکم دے دیا۔[1]

---

[1] جو لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے تمام عمر جو کچھ فرمایا وہ خدا کی طرف سے وحی (غیر متلو) کی رُو سے ہوتا تھا۔ وہ غور کریں کہ رسول اللہ نے یہ کیوں فرمایا تھا کہ ہم نے کچھ اور چاہا تھا اور خدا نے کوئی اور حکم دے دیا۔

آیت کا صحیح مفہوم

مجھے اس کا احساس ہے طاہرہ! کہ تم بے چین ہو، کہ "اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ" والی آیت کا قرآنی مفہوم جلدی سے سامنے آجائے۔ لیکن جب تک تمہارے سامنے وہ پس منظر نہ آتا جس میں مروجہ مفہوم متعین ہوا تھا، صحیح مفہوم واضح طور پر سمجھ میں نہیں آسکتا تھا یہ وجہ ہے کہ میں نے صحیح مفہوم تک آنے سے پہلے ان تفاصیل کا بیان کر دینا ضروری سمجھا۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھو کہ اس آیت میں میاں بیوی کے متعلق بات نہیں ہو رہی۔ اَلرِّجَالُ (عام مردوں) اور اَلنِّسَآءِ (عام عورتوں) کے متعلق بات ہو رہی ہے۔ اس لئے یہاں گفتگو یہ ہے کہ معاشرہ میں مردوں اور عورتوں کے فرائض مفوضہ کیا ہیں؟

یہ تم دیکھ چکی ہو کہ عورتیں اپنے خصوصی فرائض کی سرانجام دہی کی وجہ سے اکتساب رزق سے معذور ہو جاتی ہیں اس کے برعکس مردوں کا سارا وقت اس کے لئے فارغ ہوتا ہے۔ لہٰذا قرآن نے تقسیم کار کے اصول کے مطابق مردوں کا فریضہ یہ بتایا کہ وہ قَوّٰامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ ہیں۔ لغت میں قَامَ الرَّجُلُ الْمَرْأَةَ کے معنے دیئے ہیں مَانَهَا۔ یعنی اس نے روزی مہیا کی، قَامَ عَلَيْهَا کے معنی ہیں، مانَ لها یعنی اس کی روزی مہیا کرنے والا۔ اس سے آیت کا مفہوم واضح ہو گیا۔ الرجال قوامون علی النساء یعنی معاشرہ میں مردوں کے ذمہ یہ فریضہ ہے کہ وہ اکتسابِ رزق کریں اس لئے کہ (بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ) تقسیم کار کی اصول کی بنا پر ایک قسم کی استعداد مردوں کو زیادہ دی گئی ہے اور دوسری قسم کی استعداد عورتوں کو۔ اور چونکہ مردوں کا سارا وقت اکتسابِ رزق کے لئے فارغ ہوتا ہے اور عورتیں اس سے معذور ہو جاتی ہیں، اس لئے مردوں کا کمایا ہوا رزق، عورتوں کی ضروریات کی کفالت کرتا ہے۔ (بِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ) اس سے عورتوں کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی جائیں گی اور ان کی صلاحیتیں نشوونما پائیں گی۔ (فَالصّٰلِحٰتُ) اور انہیں فراغت نصیب ہو جائے گی کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو اسی مصرف میں لائیں جس کے لئے وہ خاص صلاحیتیں پیدا کی گئی ہیں۔ یہ معنی ہیں۔ قٰنِتٰتٌ کے سقاقنیت اس مشکیزے کو کہتے ہیں جس میں پانی بھرنے کے بعد، اسے یوں اچھی طرح سی کر بند کر دیا جائے کہ وہ اپنا پانی محفوظ رکھے۔ راستے میں کہیں نہ گر لے اور جہاں ضرورت ہو وہاں اس کا منہ کھل سکے۔ اگر عورتوں کو اکتسابِ رزق کرنا پڑے تو جس مقصد کے لئے

انہیں خاص صلاحیتیں دی گئی تھیں وہ مقصد پورا نہیں ہوگا کیونکہ وہ صلاحیتیں غیر محل میں صرف ہو جائیں گی۔
اس کے بعد دو لفظوں میں اس نکتہ کو اور بھی واضح کر دیا جب فرمایا کہ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ
یعنی جب اللہ کے قانون نے اس طرح ان کی حفاظت و پرورش کا سامان بہم پہنچا دیا کہ انہیں اطمینان اور فرصت
مل گئی کہ وہ اس چیز کی حفاظت کر سکیں جو پوشیدہ طور پر ان کے سپرد کی گئی ہے (یعنی جنین کی حفاظت)۔

یہاں دو باتیں غور طلب ہیں طاہرہ! ایک تو یہ کہ قرآن، عورتوں کے خصوصی فرائض اور ان سے متعلقات امور کا تذکرہ ایسے سنجیدہ استعاروں میں کرتا ہے کہ انہیں ایک باپ اپنی بیٹی سے بھی بلاتامل بیان کر سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہمارے مروجہ تراجم اور تفاسیر کی رُو سے بات یوں بیان کی جاتی ہے کہ مرد عورتوں پر حاکم اور داروغہ ہیں۔ کیونکہ وہ ان پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ (ان کے برعکس) نیک بیویوں (فَالصّٰلِحٰتُ) کا شیوہ یہ ہے کہ وہ فرمانبردار (قٰنِتٰتٌ) ہوتی ہیں اور مرد کی غیر حاضری میں اپنی عصمت کی حفاظت کرتی ہے۔ یعنے مردوں کا کام یہ ہے کہ عورتوں پر حکومت کریں۔ اور عورتوں کا کام یہ ہے کہ وہ مردوں کی فرمانبرداری کریں اور عصمت کی حفاظت۔ گویا صٰلِحٰتٌ اور قٰنِتٰتٌ اور حٰفِظٰتٌ ہونا صرف عورتوں کے لئے ہے حالانکہ قرآن نے (سورۂ احزاب) کی ان آیات میں جنہیں پہلے درج کیا گیا ہے) یہ سب خصوصیات مردوں اور عورتوں دونوں میں مشترکہ طور پر بیان کی ہیں۔ اس لئے اگر "فرمانبردار" ہونا عورت کے لئے ضروری ہے تو قرآن کی رُو سے مرد کے لئے بھی ضروری ہے۔ لہذا یہ مفہوم کہ مرد کمانے اور حکومت کے لئے ہیں۔ اور عورتیں مردوں کی فرمانبرداری کرنے کے لئے، اس اعتبار سے بھی غلط ہے۔ مرد اور عورت کا باہمی تعلق رفاقت کا ہے اور رفاقت میں ایک کی حکومت اور دوسرے کی فرمانبرداری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے رفیق (زوج) ہوتے ہیں۔ اور قانونِ خداوندی کی اطاعت کرنے والے۔

عورتوں کو مارنا

اب اس سے آگے بڑھو۔ آیت کا باقیماندہ حصہ ہیں (وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ فَعِظُوْھُنَّ وَاھْجُرُوْھُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْھُنَّ)

چونکہ ہماری تفسیروں میں فیصلہ کر لیا گیا ہے کہ مرد کا کام عورت پر حکومت کرنا اور عورت کا کام مرد کی فرمانبرداری کرنا ہے۔ اس لئے باقیماندہ آیت کا مفہوم، اسی کی تائید میں، یہ لیا گیا کہ اگر بیوی، مرد کی فرمانبرداری نہ کرے تو وہ پہلے اسے سمجھائے بجھائے، پھر اس سے باہمی تعلقات منقطع کرے اور اس پر بھی کام نہ چلے تو اسے مارے۔

لیکن، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہاں گفتگو میاں بیوی کے متعلق نہیں ہو رہی، عام مردوں اور عورتوں کے فرائض کے متعلق ہو رہی ہے۔ یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ تقسیم عمل کے اصول کے مطابق، مردوں کا فریضہ یہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ اکتساب رزق کریں اور عورتیں، رزق کی طرف سے یوں مطمئن ہو جانے کے بعد اپنے خصوصی فرائض کو بطریق احسن سرانجام دیں۔ اس کے بعد کہا گیا کہ اگر عورتیں ان انتظامات کے باوجود (جن کی رُو سے وہ اکتساب رزق کی طرف سے مطمئن ہو جاتی ہیں) معاشرہ کے اس نظم اور تقسیم کار کے اصول سے بلا عذر سرکشی اختیار کریں (جیسا کہ آجکل یورپ کے بعض ممالک میں ہو رہا ہے) تو معاشرہ کیلئے ضروری ہے کہ وہ اس قسم کی فوضویت[ل] (ANARCHY) کو روکے۔ اس لئے کہ اگر عورتوں نے مرد بننے کے چاؤ میں بلا عذر، اپنے فرائض کو چھوڑ دیا تو نسل انسانی کا سلسلہ ہی منقطع ہو جائے گا۔ اس کے لئے کہا گیا کہ معاشرہ ایسا انتظام کرے کہ پہلے تو اس قسم کی عورتوں کو سمجھانے کی کوشش کی جائے کہ ان کی یہ روش معاشرہ کے لئے کس قدر تباہی کا موجب ہے۔ اگر اس پر بھی وہ باز نہ آئیں تو پھر انہیں ان کی خوابگاہوں میں چھوڑ دیا جائے۔ یہ ایک قسم کی نظر بندی (INTERNMENT) کی سزا ہو گی۔ اور اگر وہ اسی پر بھی سرکشی سے نہ رکیں تو پھر انہیں عدالت کی طرف سے بدنی سزا (CORPORAL PUNISHMENT) بھی دی جا سکتی ہے۔

یہ ہے عزیزہ! صحیح مفہوم اس آیت کا جس کی رُو سے ہمیں بتایا یہ جاتا ہے کہ خاوند عورتوں پر حاکم اور داروغے ہیں اور انہیں حق حاصل ہے کہ وہ بیویوں کو اپنا محکوم رکھیں۔ کیونکہ بیوی، مرد کی کمائی کھاتی ہے بیوی کا فریضہ یہ ہے کہ وہ خاوند کی تابعدار رہے اور اگر وہ اس کی فرمانبرداری نہ کرے تو میاں کو حق حاصل ہے کہ وہ ڈنڈے کے زور سے اپنا حکم منوائے۔

خط لمبا ہو گیا طاہرہ! اور تمہاری کئی باتوں کا جواب باقی رہ گیا۔ بہرحال اب میں تمہیں التزاماً خط لکھا کروں گا۔ ان خطوط میں رفتہ رفتہ تمہاری باتوں کا جواب آتا جائے گا۔ لیکن دیکھنا خطوط کے جواب میں جلدی نہ مچانا مجھے اور بھی بہت سے کام کرنے ہوتے ہیں۔

والسلام

۱۲ رمئی ۱۹۵۳ء　　　　پرویز

[ل] یعنی البساطریق جس میں قاعدے اور قانون کی کوئی پابندی نہ کی جائے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تکملہ

مندرجہ بالا خط شائع ہونے کے بعد بعض گوشوں سے خطوط موصول ہوئے جن میں کہا گیا کہ ان دو نکات کی بھی وضاحت کی جائے کہ

(i) وراثت میں لڑکی کا حصہ لڑکے سے آدھا کیوں ہے؟ اور

(ii) شہادت کے لئے دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر کیوں قرار دیا گیا ہے؟ اور

یہ مقامات خود میرے سامنے تھے اور جیسا کہ میں نے اس خط کے آخر میں لکھا ہے میرا ارادہ یہ تھا کہ یہ اور اسی ضمن کے دیگر امور آئندہ خطوط میں بتدریج واضح کئے جائیں لیکن چونکہ متذکرہ صدر خطوط سے مترشح ہوتا ہے کہ قارئین کے دل میں ان دو مقامات کے متعلق کھٹک سی پیدا ہو رہی ہے اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ ان کی وضاحت جلدی کر دی جائے۔

وراثت میں لڑکی کا حصہ جہاں تک وراثت کا تعلق ہے۔ قرآن میں ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔ (ملاحظہ ہو ۴/۱۱) جیسا کہ میں نے مندرجہ بالا خط میں بتایا ہے، قرآن کریم کی رُو سے ایک ایسا معاشرہ قائم ہوتا ہے، جس میں اکتسابِ رزق کی ذمہ داری بنیادی طور پر مرد کے ذمے ہوتی ہے کیونکہ ان فرائض و واجبات کی ادائیگی سے جو بنیادی طور پر عورت کے ذمے ہوتے ہیں، عورت کو اتنی فرصت نہیں مل سکتی، کہ وہ اکتسابِ رزق کا بوجھ اُٹھا سکے۔ اب ظاہر ہے کہ جس معاشرہ میں اکتسابِ معاش کی ذمہ داری مرد کے سر پر ہو، اس میں معاشی اسباب کی تقسیم میں مرد کا حصہ یقیناً زیادہ ہونا چاہیئے۔ یہ وجہ ہے کہ ترکہ میں لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر رکھا گیا ہے۔ لڑکیوں کے ذمہ نہ اپنے اخراجات کی کفالت ہوتی ہے، نہ اپنے خاندان کے رزق کی کفالت۔ اسکے برعکس لڑکے نے اپنے لئے بھی اکتسابِ رزق کرنا ہے اور اپنے بیوی بچوں کے لئے بھی۔ اسلئے اسے زیادہ حصہ ملنا

چاہیے۔

لیکن اگر حالات ایسے پیدا ہو جائیں کہ مرد اپنے اس فریضہ کو نظر انداز کر رہے ہوں اور لڑکیوں کے متعلق اندیشہ ہو کہ وہ کس مپرسی کی حالت میں رہ جائیں گی تو قرآن نے متوفی کو پورا پورا حق دیا ہے کہ وہ اپنے ترکہ کی تقسیم اقتضائے حالات کے مطابق جس طرح جی چاہے (از روئے وصیت) کر جائے۔ قرآن کے مقرر کئے ہوئے حصے اس صورت میں عمل میں آتے ہیں جب متوفی بلا وصیت کئے مر جائے یا اس کی وصیت پورے ترکہ کو محیط نہ ہوتی ہو۔ قرآن میں اس کی صراحت موجود ہے۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ لڑکی کا حصہ کم مقرر کرنے سے نہ تو اس کے حقوق میں کمی آجاتی ہے اور نہ ہی معاشرہ میں اس کا مقام مرد سے نیچے رہ جاتا ہے۔

عورتوں کی گواہی

دوسرا نکتہ ہے شہادت کے متعلق۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۸۲ میں ہے کہ جب تم آپس میں قرضہ کا معاملہ کرو تو اسے ضبطِ تحریر میں لے آؤ۔ اور اس پر دو مرد بطور گواہ بلا لیا کرو۔ اس سے آگے ہے فان لم یکونا رجلین فرجل وامراتان۔ کہ اگر دو مرد نہ ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتوں کو بطور گواہ بلا لیا کرو۔ دو عورتیں کیوں بلائی جائیں اس کی علت قرآن نے خود ہی بیان کر دی ہے جہاں کہا کہ یہ اس لئے ہے کہ

ان تضل احدٰھما فتذکر احدٰھما الاُخرٰی

عام طور پر اس آیت کے یہ معنی کئے جاتے ہیں کہ دو عورتوں کی اس لئے ضرورت ہے کہ "ان میں سے اگر ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے" لیکن قرآن نے تضل کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنی نسیان (بھول جانے) سے مختلف ہیں۔ اس کے بنیادی معنی ہیں، بات کا مبہم یا غیر واضح سا ہو جانا، ذہن میں الجھاؤ سا پیدا ہو جانا۔ زیادہ واضح الفاظ میں (TO GET CONFUSED OR BECOME PERPLEXED) اس لفظ کی وضاحت کے بعد اب اصل آیت کی طرف آئیے۔ اس آیت سے یہ سوال اٹھائے جاتے ہیں کہ :-

(i) کہ ایک مرد کے بجائے دو عورتوں کو کیوں ضروری قرار دیا گیا۔ اور
(ii) یہ بات خصوصیت سے عورتوں کے متعلق کیوں کہی گئی کہ یہ اس لئے ہے کہ اگر ان میں سے ایک کو کچھ الجھاؤ سا پیدا ہو جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے اور ان سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ قرآن کے نزدیک عورتیں مردوں کے مقابلہ میں کم قابلِ اعتماد ہیں اور ان میں ذہنی صلاحیت بھی کم ہوتی ہے۔

جہاں تک قابلِ اعتماد ہونے کا تعلق ہے، قرآن نے شہادت میں مردوں کے لئے بھی دو کی شرط عاید کی ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ قرآن، مردوں کو بھی قابلِ اعتماد نہیں سمجھتا؟ اسی لئے ایک کو کافی نہیں سمجھا گیا۔ ایک کے ساتھ دوسرے کی شہادت بھی ضروری قرار دی گئی ہے؟ لیکن یہ ظاہر ہے کہ قرآن کا مقصود یہ نہیں کہ ایک مرد قابلِ اعتماد نہیں ہوتا۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ایک کے بیان میں سہو یا سقم رہ جائے تو دوسرے کے بیان سے اس کی کمی پوری کی جائے۔ یعنی اس سے ایک امکانی احتمال کی قانونی روک تھام مقصود ہے۔ مردوں کے متعلق یہ فتویٰ دینا مقصود نہیں کہ مرد قابلِ اعتماد نہیں ہوتے، اس لئے ان میں سے کسی ایک (تنہا) کی شہادت پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے۔ یعنی مقصود شہادت کی توثیق و پختہ کرنا ہے، نہ کہ مردوں کے ناقابلِ اعتماد ہونے کا اعلان۔

اسی طرح جب قرآن نے ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کو ضروری قرار دیا ہے، تو اس سے بھی یہ مقصود نہیں کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتیں کم قابلِ اعتماد ہوتی ہیں، اس لئے ایک مرد کی جگہ دو عورتیں ضروری ہیں۔ یہاں بھی مقصود الیسا طریقہ اختیار کرنا ہے جس سے شہادت زیادہ سے زیادہ یقینی ہو جائے۔ ورنہ جہاں تک مردوں اور عورتوں کے تقابلی (COMPARATIVE) اعتماد کا تعلق ہے، قرآن نے دونوں کو ایک ہی حیثیت دی ہے۔ مثلاً قرآن میں جہاں لعان کی شہادت کا ذکر ہے وہاں ایک عورت کی شہادت کو بھی الیسا ہی قابلِ قبول قرار دیا ہے جیسا ایک مرد کی شہادت کو۔ ملاحظہ ہو (۲۴/۶-۹)

اب سوال دوسرا باقی رہ جاتا ہے کہ قرآن نے بالخصوص عورتوں کے متعلق کیوں کہا ہے کہ اگر ان میں سے ایک کو کچھ اشتباہ لاحق ہو جائے، کچھ گھبراہٹ سی ہو جائے تو دوسری عورت بات صاف کر دے؟ یہ ظاہر ہے کہ اس تقسیم فرائض کی رُو سے (جس کا ذکر میں نے اپنے خط میں کیا ہے یعنی عورتوں کے لئے اولاد کی پرورش و تربیت کا فریضہ اور مردوں کے ذمہ اکتسابِ رزق کی ذمہ داری) یہ ضروری تھا کہ مردوں اور عورتوں کی طبعی ساخت (BIOLOGICAL CONSTITUTION) میں فرق ہوتا۔ ان دونوں میں یہ فرق

بدیہی ہے۔

مرد اور عورت میں نفسیاتی فرق

پھر چونکہ انسان کی طبعی ساخت کا اثر انسان کی نفسیات (PSYCHOLOGY) پر بھی پڑتا ہے اس لئے مردوں اور عورتوں میں اس حد تک نفسیاتی فرق بھی ضروری تھا۔ اسی نفسیاتی فرق کا ایک نتیجہ تو بالکل واضح ہے کہ مرد اکتسابِ رزق کے بعد مطمئن ہو جاتا ہے کہ وہ اولاد کی پرورش سے متعلق اپنے فرائض سے سبکدوش ہو گیا ہے۔ لیکن عورت، اولاد کی پرورش کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیتی ہے اور اس پر بھی مطمئن نہیں ہوتی۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ اپنے خون کا آخری قطرہ تک بھی بچے کے اندر انڈیل دے۔ یا اگر اس کا بس ہو تو اپنا سینہ چیر کر بچے کو دل کے اندر سمو لے۔ وہ بچے کو چھاتی سے لگا کر جس زور سے بھینچتی ہے، وہ لاشعوری طور پر اسی جذبہ کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے، کہ دنیا کی ہر عورت بچے کو بائیں طرف گود میں اٹھاتی ہے۔ یہ بھلا کیوں؟ وہ اسے اپنے دل کے ساتھ چپکائے رکھنا چاہتی ہے جو بائیں طرف ہوتا ہے۔ مردوں اور عورتوں کی اس طبعی ساخت اور نفسیاتی اختلاف کے اثرات یا نتائج کیا ہوتے ہیں، اس کے متعلق مغرب کے علمائے نفسیات بہت کچھ تحقیق کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ہارڈنگ (M. ESTHER HARDING) نے ایک دلچسپ کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (THE WAY OF ALL WOMEN)۔ جہاں تک اس نکتہ کا تعلق ہے جو اس وقت ہمارے زیرِ نظر ہے، وہ اسمیں لکھتا ہے کہ:۔

"اگر مردوں کو انسان کے باہمی تعلقات (HUMAN RELATIONSHIP) کے مسائل سے متعلق کام پر لگایا جائے تو یہ کام ان کے لئے کبھی خوش آئند نہیں ہوتا۔ لیکن عورتیں ایسے کام بہت پسند کرتی ہیں۔

عورتوں کے لئے مشکل مقام وہ ہوتا ہے جہاں ان سے کہا جائے کہ وہ کسی مسئلہ کی جزئیات کو پوری پوری صحت کے ساتھ (ACCURATELY) بیان (DEFINE) کر دیں"۔ صفحہ ۳۰۱

یہ کیوں ہوتا ہے؟ اس کے متعلق تو شاید ابھی حتمی طور پر کچھ نہ کہا جا سکے، لیکن ڈاکٹر ہارڈنگ کا بیان ہے کہ یہ وہ خصوصیت ہے جسے اس نے متعدد عملی مثالوں کے بعد عام طور پر عورتوں میں مشترک پایا ہے۔ ----

اگر یہ تحقیق صحیح ہے تو آپ دیکھئے کہ قرآن نے اس کی کس قدر رعایت رکھی ہے۔ مقدمات میں ہمیشہ جزئیات پر بحث و تنقید اور جرح و تنقیح ہوتی ہے۔ مقدمات کی جزئیات کو پوری پوری صحت کے ساتھ بیان (ACCURATELY DEFINE) نہ کرنے سے ہی شہادت خراب ہوتی ہے اور شہادت کی توثیق کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس قسم کے باریک اختلافات کی صحت ہو جائے۔ عورتوں میں ایک تو وہ نفسیاتی کمی ہوگی جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان فرائض کی سرانجام دہی میں مصروفیت کے باعث جو عورتوں سے مخصوص ہیں، ان کے لئے مردوں کے مقابلے میں معاملات میں حصہ لینے کے مواقع بھی کم ہوتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ متنازعہ فیہ معاملات (مقدمات وغیرہ) میں، جہاں بال کی کھال نکالی جائے گی، عورت بالعموم جزئیات کی صراحت میں غیر واضح رہ جائیگی۔ اسی چیز کو قرآن نے دوسرے مقام پر ایک اور انداز سے بیان کیا ہے۔ سورۂ زخرف میں یوں بات چلی آتی ہے کہ عرب کے مشرکین یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ خدا کی بیٹیاں ہوتی ہیں۔ (وہ اپنی دیویوں کو اور فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیا کرتے تھے) اس کے جواب میں قرآن نے کہا کہ (علاوہ اس کے کہ یہ عقیدہ کس قدر باطل ہے کہ خدا اولاد بھی رکھتا ہے) ان کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اولاد میں سے بھی بیٹوں کو تو اپنے لئے مخصوص کرتے ہیں اور خدا کے لئے بیٹیاں مقرر کرتے ہیں جن کی ان کے اپنے دل میں یہ وقعت ہے کہ اگر کسی کو بیٹی کی پیدائش کی "خوشخبری" دی جائے تو اس کے چہرے کی رنگت سیاہ پڑ جاتی ہے۔ اس کے بعد ہے کہ یہ اسے خدا کی اولاد قرار دیتے ہیں۔

مَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ۝ (۴۳/۱۸)

"جو زیورات میں پرورش پاتی تھے اور جھگڑے کے وقت اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی میں غیر مبین (غیر واضح) رہتی ہے۔"

متنازعہ فیہ امور (مقدمات وغیرہ میں "غیر مبین" رہنا، وہی چیز ہے جسے اُوپر بیان کیا گیا ہے اور جسے سورۂ بقرہ میں تضل (ذہنی گھبراہٹ) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کی شہادت عورتوں کے ناقابلِ اعتماد ہونے یا ناقص العقل ہونے کی دلیل نہیں۔ نہ ہی اس سے مقصود یہ ہے کہ اس بنا پر مردوں کو عورتوں پر حقِ حکومت

۱ے عورت کے ذوقِ آرائش کا موضوع الگ ہے۔

حاصل ہے۔ بلکہ (ڈاکٹر ہارڈنگ کی تحقیق کے مطابق)، اگر ایک دائرے (یعنی جزئیات کی کما حقہٗ تبئین) میں عورتیں مردوں سے پیچھے ہیں تو دوسرے دائرے (یعنی انسانی تعلقات کے مسائل کے باب) میں مرد، عورتوں سے پیچھے ہیں۔ ایک کے دائرے میں ایک کی کمی ہے تو دوسرے میں دوسرے کی (فضلنا بعضکم علی بعض) معاشرہ میں ایک دوسرے کی کمی، باہمی تعاون سے پوری ہو سکتی ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ قرآن کریم عمومی گفتگو کیا کرتا ہے۔ مستثنیات سے بحث نہیں کرتا۔ نہ ہی اس سے یہ مقصود ہوتا ہے کہ مناسب تعلیم و تربیت سے انسان کی کسی صلاحیت کی کمی پوری نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ حقیقی معاشرہ میں عورت کے متعلق یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ فصیح البیان (عُرُبًا) ہوگی۔ (۵۶/۳۷)

ان تصریحات کے علاوہ، یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قرآن کریم نے دو عورتوں کے سلسلہ میں یہ نہیں کہا کہ ان کی شہادت یکے بعد دیگرے لی جائے تاکہ وہ دو شہادات مل کر ایک مرد کی شہادت کے برابر ہو جائیں۔ کہا یہ ہے کہ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ط (۲/۲۸۲) اگر ایسا ہو کہ ان میں سے گواہی دینے والی کو گھبراہٹ کی وجہ سے کہیں الجھاؤ پیدا ہو جائے، تو اس کے ساتھ کھڑی دوسری اس کی بہن اسے یاد دلا دے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر شہادت دینے والی عورت کو گھبراہٹ لاحق نہ ہو تو دوسری عورت کی دخل اندازی کا موقعہ ہی نہیں آئیگا اور اس اکیلی کی شہادت کافی قرار پا جائیگی۔

اور اس سے یہ بھی واضح ہے کہ اگر لڑکیوں کی پرورش محض "زیورات" سے نہ کی جائے جس سے وہ معاملات زندگی میں حصہ لینے کے قابل ہی نہ بن سکیں اور ریوں "غیر مبین" (گونگی) بن کر رہ جائیں، بلکہ انہیں زیورِ تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا جائے تو پھر وہ غیر مبین نہیں رہیں گی۔ اس صورت میں دوسری عورت کے ساتھ کھڑے ہونے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ قرآن کریم کے اس قسم کے احکام بعض شرائط کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں۔ جب وہ شرائط باقی نہ رہیں تو وہ احکام بھی نافذ العمل (OPERATIVE) نہیں رہتے، جیسے، جب پانی مل جائے تو تیمم کا حکم ساقط العمل ہو جاتا ہے۔

یہ ہے جو کچھ اس باب میں، میں قرآن سے سمجھ سکا ہوں۔ جیسا کہ میں اپنے خط میں لکھ چکا ہوں، مرد عورت کے باہمی تعلقات[1] اور معاشرہ میں ان کے مقام سے متعلق مختلف گوشے میرے پیش نظر ہیں جو ان خطوط میں رفتہ رفتہ سامنے آتے جائیں گے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

پرویز

---

[1] طلاق کے ضمن میں جو قرآن نے کہا ہے کہ مردوں کو عورت کے مقابلہ میں ایک درجہ زیادہ حاصل ہے۔ اسکا ذکر اپنے مقام پر آئے گا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

طاہرہ کے نام دوسرا خط

(اس خط میں کم و بیش انہی امور کی مزید وضاحت کی گئی ہے جو پہلے خط میں آچکے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ یہ بنیادی چیزیں اچھی طرح سے ذہن نشین ہو جائیں)

میری بیٹی! تم اتنی سی بات سے پریشان ہو رہی ہو کہ اللہ میاں نے قرآن میں مردوں کو ہی کیوں مخاطب کیا ہے، عورتوں کو بھی کیوں مخاطب نہیں کیا؟ اس سوال کا جواب تو بعد میں دوں گا، لیکن اگر ایک بات کہوں تو خفا نہ ہو گی؟ اس قسم کی پریشانیاں درحقیقت غیر شعوری طور پر اس احساسِ کمتری (INFERIORITY COMPLEX) کی مظہر ہیں کہ عورت کی حیثیت مردوں کے مقابلہ میں پست رکھی گئی ہے۔ حیرت ہے کہ تم قرآن کی طالب علم ہونے کے باوجود اس وقت تک اس غیر قرآنی تصور کو اپنے تحت الشعور سے نکال نہیں سکیں؟ میں جانتا ہوں کہ صدیوں سے متوارث چلے آنے والے معتقدات جو دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو چکے ہوں، بڑی مشکل سے نکلا کرتے ہیں۔ تم نے عائشہ کے ابا کو دیکھا تھا۔ تین پشتیں ہو گئی تھیں مسلمان ہوئے لیکن جب چھینک آتی، بے اختیار منہ سے "جے نندی" نکل جاتا۔ اسے چچا مرحوم نے ہزار سمجھایا (اور وہ خود بھی جانتا تھا کہ چھینک آنے پر "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" کہتے ہیں، لیکن چھینک آنے پر پھر "جے نندی" ہی کہتا۔ جب "جے نندی" خون کے

غیر شعوری خیالات

ذرات میں حلول کر جائے تو اس کا باہر نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہم کیا جانیں کتنی "جے نندیاں" ہیں جو اس طرح ہمارے دل کی گہرائیوں میں چھپی بیٹھی ہیں۔ جب قرآن نے بنی اسرائیل کے متعلق کہا تھا کہ وَاُشۡرِبُوۡا فِیۡ قُلُوۡبِہِمُ الۡعِجۡلَ (۲/۹۳) گوسالہ کی محبت ان کے دل کی گہرائیوں میں اتر چکی تھی) تو اس سے یہی مراد تھی۔ لیکن قرآن کا دعویٰ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ (۱۰/۵۷) کا بھی تو ہے۔ وہ "دل کی بیماریوں" کا علاج کرتا ہے۔ (اختلاجِ قلب کا نہیں بلکہ فسادِ قلب کا۔ اور سچ پوچھو تو اختلاجِ قلب بھی بڑی حد تک فسادِ قلب ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اب تو مغرب کے اربابِ تحقیق اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ انسان کے جسم کی بے شمار بیماریاں نفسیاتی عوارض کی وجہ سے ہوتی ہیں اور ان کا صحیح علاج نفسیاتی اصلاح ہے)۔ لہٰذا، قرآن کی رو سے ان غلط خیالات کا

دل سے نکل جانا نہایت ضروری ہے۔

اب آؤ تم اپنے سوال کی طرف۔ تمہیں یہ معلوم ہے کہ قرآن تمام نوع انسانی کے لئے ہے۔ اس کا اوّلین مخاطب انسان ہے۔ (یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ سے یہی مراد ہے) وہ "بنی آدم" کی ہدایت کے لئے آیا ہے۔ اب تم یہ بتاؤ کہ کیا "انسان" اور "بنی آدم" صرف مردوں کو کہا جاتا ہے یا اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں؟ کیا "MANKIND" صرف مردوں تک محدود ہے یا اس میں عورتیں بھی شامل ہیں؟

مذکر کے صیغے

اب رہا یہ کہ قرآن نے جہاں جماعتی حیثیت سے "مومنین" کو مخاطب کیا ہے تو وہاں مذکر ہی کے صیغے آئے ہیں۔ (یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا) تو یہ زبان کا عام قاعدہ ہے کہ جہاں مخلوط جماعت کو مخاطب کیا جائے وہاں صیغے مذکر کے استعمال کئے جائیں۔ خود تمہارے ہاں بھی جب کوئی مقرر کسی مخلوط مجمع کو مخاطب کرتا ہے (جس میں مرد اور عورتیں سب موجود ہوں)، تو شروع میں خواتین و حضرات کی تخصیص کر دیتا ہے۔ لیکن اس کے بعد اپنی ساری تقریر میں صیغے مذکر ہی کے استعمال کرتا ہے۔ وہ بلا تکلف کہتا چلا جاتا ہے کہ "آپ یہ کہتے ہیں کہ..." اور آپ اس کا کبھی خیال نہیں کرتے کہ...." یہ سب مذکر کے صیغے ہیں لیکن اس سے مراد مجمع کے مرد اور عورتیں سب ہوتے ہیں۔ اسکے متعلق تو تم نے کبھی نہیں کہا کہ یہ ہماری توہین ہے کہ ہمیں مجمع میں بلایا گیا لیکن مقرر نے باتیں سب مردوں ہی سے کیں؟ اس لئے کہ تم سمجھتی ہو کہ مقرر نے اگرچہ صیغے مذکر کے استعمال کئے لیکن ان میں مرد اور عورتیں دونوں شامل تھے اس لئے کہ یہ زبان کا قاعدہ ہے کہ مخلوط اور مشترک تخاطب میں صیغے مذکر کے استعمال کئے جائیں یہی انداز قرآن نے اختیار کیا ہے۔ یعنی جہاں اس نے مومنین کو من حیث الجماعت مخاطب کیا ہے، وہاں صیغے اگرچہ مذکر کے استعمال ہوئے ہیں لیکن تخاطب مردوں اور عورتوں دونوں سے ہے۔ اس حقیقت کو اجاگر کرنے کے لئے کہ جماعت مومنین میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں، اس نے ان دونوں طبقات کا الگ الگ ذکر کر کے بھی ان کی خصوصیات بیان کی ہیں، جیسا کہ پہلے خط میں بتایا جا چکا ہے۔ سورۂ احزاب میں دیکھو (33/35) کس طرح اس جماعت کے مرد اور عورتیں دوش بدوش چلے آ رہے ہیں۔ اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ (مسلم مرد اور مسلم عورتیں وغیرہ) آیت کے آخر تک اسی طرح متواتر دونوں صیغے چلے جاتے ہیں۔

کیوں طاہرہ! کیا تمہیں اب بھی گلہ رہے گا کہ قرآن کریم میں عورتوں کو مردوں کے ساتھ مخاطب

نہیں کیا گیا؟

۲۔ تمہارا دوسرا سوال پڑھ کر مجھے بے ساختہ ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ ایک صاحب نے اپنی شادی کے لئے دن کے دن پہنچنا تھا۔ اتفاق سے گاڑی چھوٹ گئی۔ اب کوئی شکل ہی نہ تھی کہ وہ تاریخ اور وقت مقررہ پر وہاں پہنچ سکتے۔ وہ بہت گھبرائے۔ اس بدحواسی میں تار گھر گئے اور جھٹ سے اپنی (ہونے والی) بیوی کے نام تار بھیج دیا کہ "جب تک میں نہ پہنچ جاؤں تم شادی نہ کرنا۔"

تم کہتی ہو کہ قرآن میں یہ تو لکھا ہے کہ جنّت میں مردوں کو اچھی اچھی عورتیں ملیں گی، لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ عورتوں کو بھی مرد ملیں گے یا نہیں؟ ذرا سوچو، طاہرہ! کہ مردوں کو جو عورتیں ملیں گی تو ان عورتوں کو وہ مرد ملیں گے یا نہیں؟ یعنی (مثلاً) وہاں حامد کو عائشہ بطور بیوی کے ملے گی تو کیا عائشہ کو حامد بطور خاوند نہیں ملیگا؟ جب میاں کو بیوی ملتی ہے تو اس بیوی کو وہ میاں بھی تو ملتا ہے!

جنّت کے متعلق، طاہرہ! ایک بنیادی حقیقت اچھی طرح سے سمجھ لینی چاہئے کیونکہ اس کے سمجھے بغیر، بہت سی باتوں میں اُلجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔

جنّت کا مفہوم

قرآن میں ایک تو اس جنّت کا ذکر ہے جو مرنے کے بعد مستقبل کی زندگی میں ملے گی۔ اس کے متعلق واضح الفاظ میں بتا دیا گیا ہے کہ اس کی کنہ وحقیقت اور کیفیت وماہیت، تمہارے شعور کی موجودہ سطح کے مطابق تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتی۔ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۳۲/۱۷) کسی شخص کو معلوم نہیں کہ اس کے اعمال کے بدلے میں اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا جو سامان اس کے لئے مخفی رکھا گیا ہے وہ کیا ہے۔

یہ جنّت، مکان (SPACE) کی چاردیواری میں محصور نہیں، اس کی وسعت ارض وسما کو محیط ہے جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (۳/۱۳۳) لہٰذا، اس جنّت کی زندگی کیسی ہوگی، اسے ہم سمجھ نہیں سکتے لیکن دوسری جنّت وہ ہے جو نظامِ خداوندی کے اتباع سے اسی دنیا میں متشکّل ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ جنّتی معاشرہ جو قرآن کے خطوط کے مطابق قائم ہوتا ہے۔ اس جنّت کی تفاصیل اسی دنیا سے متعلق ہیں۔ اور نہ صرف یہ کہ ہماری سمجھ میں آسکتی ہیں، بلکہ ہم خود اس جنّت کو پیدا کر سکتے اور اس کی فضاؤں میں زندگی گزار سکتے ہیں۔ یہ ہے وہ جنّت جس میں قرآن نے مردوں کے ساتھ عورتوں کا بھی ذکر کیا ہے اور کرنا چاہئے بھی۔ اس لئے کہ وہ کون سا معاشرہ ہے جو عورتوں کے بغیر، تنہا مردوں کے ذریعہ قائم ہو سکتا ہے۔ اس جنّتی معاشرہ کی عورتوں کی خصوصیات کیا ہیں؟ وہی

جنّتی معاشرہ کی عورتیں

جو مومن عورتوں (مؤمنات) کی خصوصیات ہیں۔ مومن عورتوں سے کہا گیا ہے کہ جب وہ چلیں تو شرم و حیا سے اپنی نگاہیں نیچے کئے ہوئے چلیں[1]۔ بیباکانہ انداز سے ہر ایک کو دعوتِ تماشہ نہ دیتی پھریں۔ انہی کو قرآن نے جنّتی معاشرہ میں قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ (۵۵/۵۶) کہا ہے یعنی نگاہیں نیچی رکھنے والیاں۔ قرآن نے مومن عورتوں کے متعلق کہا ہے کہ وہ اپنی عصمت کی پوری پوری حفاظت کرتی ہیں[2]۔ انہی کے متعلق جنّتی معاشرہ میں کہا ہے کہ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ۝ (۵۵/۵۶) انہیں ان کے خاوندوں سے پہلے، اپنوں اور بیگانوں میں سے کسی نے چھوا تک نہیں ہوگا۔ وہاں ہر نوجوان کو جو کسی جگہ شادی کرنا چاہے گا، دل کا پورا اطمینان ہوگا کہ اس کی منگیتر کو کسی دوسرے کا ہاتھ تک نہیں لگا۔ کتنا بڑا ہے یہ اطمینان جو کسی شادی کرنے والے پاک باز انسان کو حاصل ہو جائے۔ انہی بیگمات کو قرآن نے عالی مرتبت، بلند پایہ خواتین کہہ کر پکارا ہے۔ سورۂ واقعہ میں جو فُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ۝ (۵۶/۳۴) آیا ہے تو اس کے یہی معنی ہیں۔ قرآن نے بتایا ہے کہ عہدِ جہالت میں پرورش یافتہ عورت کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ بڑی جذباتی ہوتی ہے اور اس وجہ سے وہ متنازعہ فیہ معاملہ میں اپنے دعوے (CASE) کو اچھی طرح بیان نہیں کر سکتی۔ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ۝ (۴۳/۱۸) لیکن قرآنی معاشرہ میں یہی عورت مناسب تعلیم و تربیت سے یکسر نئی مخلوق بن جائے گی۔ اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ۝ فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ۝ (۵۶/۳۵-۳۶) اور نہایت فصیح البیان ہو جائے گی۔ (اس سے یہ مراد نہیں کہ اس تعلیم و تربیت سے عورت کے جذبات فنا ہو جائیں گے۔ مرد کے مقابلہ میں عورت زیادہ جذباتی واقع ہوئی ہے۔ اور اسے زیادہ جذباتی رہنا چاہئیے۔ کیونکہ اس کے ذمے فطرت کی طرف سے جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ان کا تعلق زیادہ تر جذبات سے ہے۔ مناسب تعلیم و تربیت سے ہوتا یہ ہے کہ یہ جذبات جہالت کے جذبات بننے کے بجائے صحیح مقصد میں صرف ہونے والے جذبات بن جاتے ہیں)۔ اس کے ساتھ ہی بڑی خوش گل اور تندرست ولولہ (عُرُبًا اَتْرَابًا ۝ (۵۶/۳۷)) ایسی عورتیں جن کے گھروں میں آئیں وہ کسقدر صاحبِ یمن و سعادت ہوں گے؟ لِّاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ۝ (۵۶/۳۸) اس قسم کی قلب و نگاہ کی پاکیزگی اور فکر و نظر کی بلندی کی حامل عورتیں، یقیناً انہی جیسے مردوں کے گھروں میں آئیں گی، اس لئے کہ اس معاشرہ کی تشکیل کے بعد عائلی زندگی کا بنیادی اصول یہ ہوگا کہ اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لئے وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ (۲۴/۲۶) طیب عورتیں طیب مردوں کے لئے اور طیب مرد طیب عورتوں کے لئے۔ اس سے گھر کی زندگی

---

[1] مردوں سے بھی یہی کہا گیا ہے۔

جنت کی زندگی بنتی ہے اور جنتی معاشرہ کی ابتدا گھروں ہی سے ہوتی ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کو طاہرہ! بڑے عجیب انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کے نزدیک عورت اور مرد میں فکر و نظر، خیالات و تصورات، معتقدات و اصولات اور مسلک و منہاج کا اختلاف جہنم پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس، ان چیزوں میں ہم آہنگی اور یک رنگی گھر کو جنت بنا دیتی ہے۔ اس کے لئے اس نے مومن اور مشرک کے اختلاف کو بطور مثال بیان کیا ہے کیونکہ، قرآنی نقطۂ نگاہ سے شرک اور توحید کا اختلاف دنیا میں سب سے بڑا اور سب سے شدید (EXTREME) اختلاف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کوئی مومن مرد کسی مشرک عورت سے شادی نہ کرے نہ کوئی مومن عورت مشرک

گھر میں جنت

مرد سے نکاح کرے۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ اس قسم کے ازدواجی رشتوں کو جائز قرار دینے والے يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ تمہیں جہنم کی طرف بلاتے ہیں۔ اسکے برعکس یک رنگی و ہم آہنگی کی شادی سے خدا تمہیں جنت کی طرف دعوت دیتا ہے۔ وَاللَّهُ يَدْعُوا إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ (۲۲۱) گھر کے اندر جنت اور گھر سے باہر ہر قسم کی شرانگیزیوں سے حفاظت۔ یہ ہے طاہرہ! جنتی معاشرہ میں مرد اور عورت کی پوزیشن۔ اب تم بتاؤ کہ تمہارا وہ اعتراض کہاں باقی رہتا ہے کہ قرآن نے جنت میں مردوں کے لئے تو "حوریں" تجویز کی ہیں لیکن عورتوں کے لئے کچھ نہیں کیا؟ ضمناً تمہیں بتا دوں کہ عربی زبان میں حورعین کے معنی ہیں پاکیزہ فکر (PURE AND CLEAN INTELLECT) اور یہ لفظ عورت اور مرد دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا، جنت کے جوڑے پاکیزگی فکر و نظر کے حسین مجسمے ہوں گے۔ سوچو بیٹی! کہ کس قدر "دل کا سرور اور آنکھوں کا نور" لئے ہوگا وہ معاشرہ جس میں مرد اور عورتیں ان خصوصیات کی حامل ہوں گی طُوبَىٰ لَهُمْ وَحُسْنُ مَآبٍ (۱۳/۲۹) پھر یہ بھی یاد رکھو کہ عربی زبان میں "زوج" (جمع ازواج) کے معنی بیوی ہی نہیں۔ اس کے معنی رفیق اور ساتھی کے ہیں۔ اس رفاقت کی وجہ سے میاں، بیوی کا زوج اور بیوی، میاں کی زوج ہوتی ہے۔ لہٰذا، قرآن نے جہاں "ازواج مطہرات" کہا ہے تو اس کے ہر جگہ معنی پاکیزہ بیویاں ہی نہیں اس کے معنی پاکباز رفقاء بھی ہیں۔

اگرچہ دنیا کے کسی مذہب میں بھی (جس شکل میں وہ آج ہمارے سامنے موجود ہیں) عورت کو اس کا صحیح مقام نہیں دیا گیا۔ لیکن اس باب میں عیسائیت انتہا تک پہنچ گئی ہے۔ اس نے یہ عقیدہ پیدا کیا کہ جنت

عیسائیت اور عورت

سے آدم کو نکلوانے کا موجب اس کی بیوی ہی تھی۔ یہ ابلیس کے چکمہ میں آگئی اور اس نے آدم کو پھسلا دیا۔ اس کے بعد اس مذہب میں عورت کے

خلاف انتہائی نفرت کے جذبات پرورش پانے لگے۔ اس پر مستزاد یہ کہ حضرت عیسیٰؑ کی تجرّد کی زندگی نے عیسائیوں کے دل میں عورت کی طرف سے اور بھی بُغض پیدا کر دیا۔ پھر جب عیسائیت اور خانقاہیت لازم ملزوم بن گئے تو تجرّد کی زندگی کو روحانی ترقی کے لئے لازمی جزو قرار دیا گیا۔ انہی اعتقادات کا نتیجہ تھا کہ ان کے ہاں عورت تمام برائیوں کا سرچشمہ قرار پا گئی۔ عیسائی پادریوں کی طرف سے جو آئے دن اعتراضات ہوتے رہتے ہیں کہ قرآن کی جنّت میں عورت دکھائی دیتی ہے، وہ بھی اسی عقیدہ کا نتیجہ ہے۔ قرآن نے سب سے پہلے اس غلط خیال کی تردید کی کہ آدم کو جنّت سے نکلوانے کا موجب اس کی بیوی تھی۔ اس نے کہا کہ آدم اور اس کی بیوی دونوں سے لغزش ہوئی (۲/۳۶) اور پھر ان کی توبہ قبول کر لی گئی (۲/۳۷)۔ (قرآن کے قصۂ آدم کے متعلق کچھ الگ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ تم اسے "ابلیس و آدم" میں خود دیکھ چکی ہو کہ یہ کسی خاص جوڑے کا ذکر نہیں، مرد اور عورت کی عمومی خصوصیات کا تمثیلی بیان ہے)

اس سلسلہ میں ایک اور اہم بات بھی قابلِ غور ہے۔ ہم ہندوؤں کے اس عقیدے پر سخت سے سخت تنقید کرتے ہیں کہ جو برہمن کے گھر پیدا ہو گیا، وہ باقی تمام انسانوں کے لئے واجب العزّت بن گیا اور جس نے شودر کے ہاں جنم لے لیا وہ عمر بھر دوسروں کی خدمت کرتا رہا۔ ہم ان سے کہتے ہیں کہ کسی بچے کا اس میں کیا اختیار ہے کہ وہ کس کے گھر میں پیدا ہو گیا ہے۔ اس لئے جس بات پر کسی کو اختیار ہی نہ ہو، اس کی بنا پر اسے عزّت یا ذلت کا مستحق قرار دینا ظلم و زیادتی اور جہالت و حماقت ہے۔

یہ بات بالکل درست ہے اور قرآن نے یہ کہہ کر اس باطل کو توڑا کہ سب بچے ایک جیسے پیدا ہوتے ہیں اور یکساں واجب التکریم ہیں۔ (۱۷/۷۰)

لیکن ذرا سوچو کہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی مانا جائے کہ ایک بچّہ اگر لڑکا ہے تو ساری عمر وہ محض اپنی اس پیدائشی خصوصیت کی بنا پر دوسرے بچّے سے جو لڑکی ہے، ہمیشہ افضل اور زیادہ عزّت و توقیر کا مستحق ہے تو کیا وہی ہندوانہ عقیدہ نہیں جس کی ہم اس طرح تردید کرتے ہیں۔ ذرا غور کرو کہ لڑکی کا اس میں کیا قصور ہے کہ وہ لڑکی پیدا ہوئی ہے، لڑکا نہیں پیدا ہوئی۔؟ لیکن اس کا قصور ہو یا نہ ہو، ہم اسے عمر بھر اس کی سزا دیتے رہتے ہیں۔

کیا اس کا نام اسلام ہے؟

میں ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا اس لئے زیادہ تفصیل سے خط نہیں لکھ سکتا۔ اُمید ہے انہی مختصر سے اشارات میں تمہیں اپنے سوالات کا اطمینان بخش جواب مل جائے گا۔ سلیم میاں سے میری دعا کہنا۔ ان کے خط کا جواب بھی میرے ذمّہ ہے۔

والسلام

پرویز　-　اکتوبر ۱۹۵۵ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

طاہرہ کے نام تیسرا خط

نکاح - طلاق - تعدّدِ ازدواج

نہیں طاہرہ! حیوان اور انسان کے بچے میں بڑا فرق ہے۔ حیوان کا بچہ اپنی جبلّی خصوصیات (INSTINCTS) لے کر پیدا ہوتا ہے جو تربیت سے بدل نہیں سکتیں۔ اگر کسی کتّے کے پلّے کو پیدا ہوتے ہی، جب اس نے ہنوز اپنی آنکھیں بھی نہ کھولی ہوں، بکری کے تھنوں سے چپکا دیا جائے اور وہ اس کی گود میں پرورش پائے۔ تو اس تبدیلی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ وہ کتّا ہی رہے گا اور کتّا بن کر ہی بڑا ہوگا۔ اس میں تمام خصوصیات کتّے کی ہی ہوں گی، بکری کی ایک خصوصیّت بھی نہیں ہوگی۔ اس کی جبلّت پر نہ بکری کا دُودھ اثر کرے گا، نہ بکری کے بچّوں کے ساتھ کھیلنا۔ دور کیوں جاؤ! تم نے اپنی مرغی کے نیچے بطخ اور مرغی دونوں کے انڈے رکھے تھے۔ پھر دیکھا تھا کہ اس کا نتیجہ کیا نکلا تھا؟ انڈوں سے مرغی اور بطخ کے بچّے نکلے اور سب کے سب مرغی کے پروں کے نیچے پروان چڑھے۔ لیکن جب پہلی مرتبہ پانی سامنے آیا۔ تو تم نے دیکھا تھا کہ بطخ کے بچّے کس طرح اُڑ کر پانی میں جا گھُسے تھے اور مرغی بیچاری پانی کے کنارے ان کا منہ تکتی رہ گئی تھی۔ اس وقت اس کا اضطراب دیکھنے کے قابل تھا۔ لیکن بطخ کے بچّوں کو اس کا احساس تک بھی نہ تھا کہ ان سے کوئی اضطراب انگیز حرکت سرزد ہوگئی ہے۔ ان کے برعکس، مرغی کے بچّے پانی کے قریب بھی نہیں پھٹکتے تھے۔ مرغی کی پرورش اور چوزوں کی رفاقت نے بطخ کے بچّوں پر ذرا بھی تو اثر نہ کیا۔ نہ اُس وقت اثر کیا اور نہ ہی ساری عمر اثر کر سکتے ہیں۔ بطخ کے بچّے بطخ ہی رہتے ہیں۔

برخلاف اس کے، ایک گنوار عورت کے بچّے کو پیدا ہوتے ہی کسی علمی گھرانے میں بھیج دو اور علمی گھرانے کے بچّے کو گنوار عورت کے سپرد کر دو۔ تم دیکھو گی کہ گنوار عورت کا بچّہ مہذّب اور شائستہ بن کر اُٹھے گا، اور اس علمی گھرانے کا بچّہ بالکل گنوار اور دہقان بن جائے گا۔ (اس میں شبہ نہیں کہ بچّوں پر بعض اثرات موروثی بھی ہوتے

ہیں لیکن تعلیم و تربیت اور ابتدائی ماحول کے اثرات موروثی اثرات پر غالب آجاتے ہیں۔ یوں بھی، جنہیں ہم موروثی اثرات کہتے ہیں وہ درحقیقت سوسائٹی (معاشرہ) ہی کے اثرات ہوتے ہیں جو مجموعی طور پر (ACCUMULATIVELY) نسلاً بعد نسلٍ آگے منتقل ہوتے چلے آتے ہیں۔ تعلیم و تربیت کے اثرات کا تو یہ عالم ہے کہ ایک شیعہ ماں باپ کے بچے کو سنیوں کے ہاں پرورش پانے دو۔ وہ سنیوں کے عقائد لے کر بڑا ہوگا۔ حتیٰ کہ ہندوؤں کے بچے کو مسلمان گھرانے کے سپرد کر دو، وہ انہی جیسا مسلمان بن جائے گا۔ یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے جس کے لئے کسی نظری بحث کی ضرورت نہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسان کا بچہ (حیوان کے بچے کی طرح) بنا بنایا پیدا نہیں ہوتا وہ وہی کچھ بن جاتا ہے جو اس کا ابتدائی ماحول، تعلیم اور تربیت اسے بنا دے۔ لہٰذا جو قوم یہ چاہے کہ اس کے آنے والی نسل، انسانیت کی درخشندہ صفات کی حامل ہو، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے بچوں کے لئے اسی قسم کا ماحول پیدا کرے۔ بچے کا ماحول وہ گھر ہوتا ہے جس میں وہ پیدا ہوتا ہے اور پرورش پاتا ہے اور اس کی تربیت کا گہوارہ اس کی ماں کی آغوش ہوتی ہے۔

ماں کی آغوش

میں اس خط میں تفصیل میں جانا نہیں چاہتا ورنہ تمہیں مثالیں دے کر سمجھاتا کہ علم تجزیۂ نفس (PSYCHO - ANALYSIS) کے ماہرین کس طرح اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بچے نے اپنی مستقبل کی زندگی میں جو کچھ بننا ہوتا ہے وہ بنیادی طور پر، اپنی عمر کے ابتدائی دو تین سال میں بن چکتا ہے۔ ڈاکٹر جُنگ (JUNG) کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ اس کے کیرکٹر کی بنیادیں اس عمر میں استوار ہو چکتی ہیں جب وہ ہنوز بولنا بھی نہیں سیکھتا۔ اس عمر میں وہ نہایت خاموشی سے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس ماحول کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے جس میں وہ پرورش پاتا ہے۔ اس کے بعد، اس کی زندگی کی عمارت انہی بنیادوں پر تعمیر ہوتی ہے۔ لہٰذا بچے کی زندگی کے بناؤ اور بگاڑ کا بیشتر انحصار اس کے ماحول پر ہوتا ہے اور اس کے ماحول کا انحصار ہوتا ہے اس کے ماں باپ کے باہمی تعلقات پر۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ یہ ماحول تربیت پاتا ہے میاں اور بیوی کے باہمی تعلقات سے۔

میاں بیوی کے باہمی تعلقات

یہ وجہ ہے کہ قرآن، میاں اور بیوی کے تعلقات کی خوشگواری کو عائلی (گھر کی) زندگی کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ اس سے نہ صرف ایک جوڑے کی زندگی ہی مسرتوں کے جھولے جھولتی آگے بڑھتی ہے بلکہ ان کے بچے، اس مساعد (موافق) ماحول میں پرورش پاکر، اپنی ملت کے لئے باعثِ فخر اور انسانیت کے لئے وجہِ سعادت بنتے ہیں۔ قرآن

یہ کہنا ہے کہ میاں بیوی کے تعلقات اسی صورت میں خوشگوار رہ سکتے ہیں، جب ان دونوں میں مزاج،
خیالات، مقاصد کی ہم آہنگی اور "راستے اور منزل" کی یکسانیت ہو۔ اس قسم کے قلب و نگاہ کی ہم آہنگی اور
یک نگہی رکھنے والے مرد و عورت کا یہ باہمی عہد کہ ہم دونوں مل کر ایک ایسا متوازن اور خوشگوار ماحول پیدا کریں
گے جس میں پرورش پاکر ہمارے بچے شرفِ انسانیت کا حسین پیکر بن کر پروان چڑھیں، قرآن کی اصطلاح
میں نکاح کہلاتا ہے۔ نکاح کے لفظی معنی ہیں ایک دوسرے میں اس طرح جذب ہو جانا جس طرح بارش کے
قطرے زمین میں جذب ہو جاتے ہیں (نَكَحَ الْمَطَرُ الْاَرْضَ)، یا یوں گھل مل جانا جس طرح آنکھوں میں
نیند گھل جاتی ہے (نَكَحَ النُّعَاسُ عَيْنَهُ) وہ اس قسم کا معاہدہ کرنے والے جوڑے میں سے ایک
کو دوسرے کا زوج قرار دیتا ہے اور (جیسا کہ میں پہلے خط میں لکھ چکا ہوں) زوج کے معنی ہیں
'COMPLEMENT' یعنی جس کے بغیر دوسرے کی تکمیل نہ ہو سکے۔ میاں کی تکمیل بیوی سے اور بیوی کی
تکمیل میاں سے۔ ان میں ایک کو بھی نظر انداز کر دیا جائے تو دوسرا نامکمل رہ جائے۔ جس طرح کسی گاڑی کا
ایک پہیہ خراب ہو جائے تو دوسرا خود بخود بے کار ہو کر رہ جاتا ہے، یہ دونوں پہیے ایک دوسرے کے زوج
ہوتے ہیں۔

نکاح

یہ حقیقت ہے کہ وہ عائلی معاہدہ (نکاح) جس میں فریقین میں قلب و نگاہ کی ہم آہنگی ہو جنّتی
ماحول کا ضامن ہوتا ہے اور جس میں اس قسم کی ہم آہنگی اور توافق نہ ہو اس کا نتیجہ جہنّم کا عذاب
ہوتا ہے۔ قرآن نے جامع انداز میں بیان کی ہے۔ اس نکتہ کو میں سابقہ خط میں لکھ چکا ہوں۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کا تعلّق جس کی بنیاد ہم آہنگیٔ فکر و نظر اور یک رنگیٔ خیالات و تصوّرات پر ہو،
تراضیٔ مابین (دونوں کی رضامندی — MUTUAL AGREEMENT) ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ یہی
وجہ ہے کہ قرآن نے نکاح کو معاہدہ سے تعبیر کیا ہے۔ (وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا) (۴/۲۱)
معاہدہ کی پہلی شرط یہ ہوتی ہے کہ فریقین بالغ ہوں، نابالغ کا معاہدہ درخورِ اعتناء ہی نہیں ہوتا۔ اسی لئے

نکاح کی عمر

قرآن کی رُو سے صغر سنی کا نکاح، نکاح ہی نہیں ہوتا۔ قرآن نے تو بلوغت کے معنی
ہی "نکاح کی عمر" بتائے ہیں۔ (وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ) (۴/۶)
معاہدہ کی دوسری شرط یہ ہوتی ہے کہ وہ بلا جبر و اکراہ (فریقین کی پسندیدگی کے مطابق) ہو۔ اسی لئے ایک طرف
مردوں سے کہہ دیا کہ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (۴/۳) عورتوں میں سے جو تمہیں

پسند ہوں ان سے نکاح کرو۔" اور دوسری طرف عورتوں کے متعلق کہہ دیا کہ لَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ کَرْهًا (۴/۱۹)، "تمہارے لئے قطعاً جائز نہیں (حلال نہیں) کہ تم عورتوں کے زبردستی مالک بن جاؤ۔"

لہٰذا نکاح نام ہے ایک بالغ مرد اور ایک بالغ عورت کے برضا و رغبت باہمی معاہدہ کا کہ ہم ایک دوسرے کے رفیق بن کر، ان تمام حقوق و فرائض کا احترام کرتے ہوئے جو قرآن نے عائد کئے ہیں، سکون و محبت اور ہم آہنگی و یک جہتی کی زندگی بسر کریں گے اور اس طرح معاشرے میں ایک ایسا خوشگوار ماحول پیدا کریں گے جس میں پرورش پا کر ہماری آئندہ نسل، متوازن شخصیت کی حامل اور شرفِ انسانیت کی پیکر بنے۔ اگر ان میں سے ایک شق کی بھی کمی ہو تو وہ نکاح کا تعلق نہیں رہتا، محض جنسی اختلاط کا طبعی BIOLOGICAL ذریعہ رہ جاتا ہے۔ ان دونوں قسم کے تعلقات میں جو بنیادی فرق ہے، اس کی تصریح خود قرآن نے کر دی ہے۔ اس نے کہا ازدواجی تعلق کا مقصد ہے مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسَافِحِیْنَ (۴/۲۴)۔ قرآن کا یہ انداز بڑا بلیغ ہے کہ وہ ایک بات کی وضاحت اس کی متضاد بات کو سامنے رکھ کر کر دیتا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ازدواجی تعلقات کا مقصد مُحْصِنِیْنَ ہے مسافحین نہیں ہے۔ یہاں محصنین کی وضاحت مسافحین نے کر دی ہے۔ سَفح (جس سے مسافحین بنا ہے) کے معنی ہیں بہانا (POURING OUT) اور حصن کے معنی ہیں اپنے آپ کو پابندیوں میں رکھنا۔ اگر ان پابندیوں کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا جن کی بنیادوں پر رشتۂ نکاح استوار ہوا تھا تو وہ نکاح نہیں رہتا محض سفح[1] رہ جاتا ہے۔ (امید ہے تم قرآن کے اس استعارہ سے بات سمجھ گئی ہو گی)

اب اس سے آگے بڑھو۔ جب نکاح کا مقصد باہمی رفاقت و مؤدّت کی زندگی بسر کرنا اور اولاد کے لئے ایسا ماحول پیدا کرنا ہے جس میں ان کے جوہرِ انسانیت بالیدگی حاصل کر لیں، تو ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس سے رفاقت و مؤدّت تو ایک طرف، سارا گھر جہنم میں تبدیل

---

[1] عربوں میں قرعہ اندازی تیروں کے ذریعے کیا کرتے تھے۔ وہ باقی تیروں کے ساتھ ایک تیر ایسا بھی پھینکتے جس کے ساتھ کوئی حصّہ وابستہ نہیں ہوتا تھا۔ یعنی (BLANK) اس تیر کو اسفیح کہتے تھے۔ یعنی جو تیر کی طرح لگے تو ضرور لیکن نتیجہ کچھ مرتب نہ ہو۔ اس آیت سے دیگر مفاہیم کیا پیدا ہوتے ہیں ان کے ذکر کرنے کا یہ موقع نہیں۔

ہو جاتا ہے۔ دوسری بیوی کا سوال اس وقت پیدا ہو سکتا ہے جب پہلی بیوی فوت ہو جائے (اور یہ یقین ہو کہ دوسری بیوی سے اولاد کے لئے نامساعد ماحول نہیں پیدا ہو جائے گا) یا ایسے حالات پیدا ہو جائیں جن میں معاہدۂ نکاح فسخ ہو جائے (جسے طلاق کہتے ہیں اور جس کا تفصیلی ذکر ذرا آگے چل کر آتا ہے)، چنانچہ قرآن نے طلاق کے ضمن میں یہ کہا ہے کہ (وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ... (۴/۲۰)، اگر تم پہلی بیوی کی جگہ دوسری بیوی لانا چاہو تو...“ اس سے ظاہر ہے کہ دوسری بیوی پہلی بیوی کی جگہ ہی آسکتی ہے اسکی موجودگی میں نہیں آسکتی۔

تعدد ازدواج

میں یہ لکھ رہا ہوں اور اس کے ساتھ ہی اس اضطراب کا بھی اچھی طرح اندازہ کر رہا ہوں جو ان سطور کے پڑھنے سے تمہارے دل میں تلاطم خیز ہو گا۔ تم یقیناً کہو گی کہ میں یہ دنیا جہاں سے نرالی بات، کیا کہہ رہا ہوں؟ مسلمانوں میں چار بیویوں تک کی اجازت "اسلام کے مسلمات" میں سے ہے۔ گذشتہ زمانہ کو چھوڑو، اس وقت بھی لاکھوں گھرانے ایسے ہیں جہاں ایک شوہر کی ایک سے زیادہ بیویاں ہیں اور ان گھرانوں میں بڑے بڑے مقدس خانوادے بھی شامل ہیں۔ پھر میں نے کیسے کہہ دیا کہ ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تم بھی سچی ہو طاہرہ! اور میں بھی سچا۔ تم یہ کہہ رہی ہو کہ مسلمانوں میں بیک وقت چار بیویاں کر لینے کا معمول ہے اور میں یہ کہہ رہا ہوں کہ قرآن کی رُو سے معمولاً ایک وقت میں ایک ہی بیوی کی اجازت ہے۔ اب تم پوچھو گی کہ مسلمانوں میں ایک وقت میں دو دو، تین تین، چار چار، بیویاں کر لینے کا معمول کیسے ہو گیا؟ یہ بھی سن لو۔

قرآن میں صرف ایک جگہ ایک سے زیادہ بیویوں کا ذکر آتا ہے اور وہ ہے سورۂ نساء کی تیسری آیت۔ اس سورۃ کی دوسری آیت میں ہے:-

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا (۴/۲)

"یعنی جو بچے یتیم رہ جائیں اور ان کی کوئی جائیداد ہو تو ان کے اس مال کی حفاظت اس طرح کرو جس طرح تم اپنے بچوں کے مال کی حفاظت کرتے ہو۔ پھر جب وہ بڑے ہو جائیں تو ان کی امانت ان کے سپرد کر دو۔ یہ نہ کرو کہ ان کی اچھی اچھی چیزیں اپنی نکمی چیزوں سے بدل لو۔ ان کے اموال میں کسی قسم کی دست

اندازی کرنا بڑی ہی بے انصافی کی بات ہے؟

یہ ہے سورۂ نساء کی دوسری آیت۔ اس کے بعد تیسری آیت یہ ہے:-

وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ (۴/۳)

اس آیت کا لفظی ترجمہ یہ ہے:-

"اگر تمہیں ڈر ہو کہ یتیموں کے بارے میں انصاف نہیں کر سکو گے تو تم دو دو، تین تین، چار چار عورتوں سے جو تمہیں پسند ہوں نکاح کر سکتے ہو۔"

یہاں سے ایک بات تو بالکل واضح ہے کہ ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت مشروط (CONDITIONAL)

بنیادی شرط

ہے اور وہ شرط یہ ہے کہ اگر تمہیں ڈر ہو کہ تم یتیموں کے بارے میں انصاف نہیں کر سکو گے تو ایسا کر سکتے ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ اس شرط سے مفہوم کیا ہے؟

اس مفہوم کی طرف سورۂ نساء نے خود ہی اشارہ کر دیا ہے۔ اس سورۃ کے شروع میں یتیموں اور عورتوں سے متعلق احکام اور ترکہ و وصیت کے قوانین درج ہیں۔ اس کے بعد جنگ سے متعلق امور کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ تم ذرا سوچو کہ مسلمانوں کی مختصر سی جماعت کو ہجرت کے بعد، سات آٹھ سال کے عرصہ میں بے شمار لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ ان کی جماعت میں مردوں کی کمی ہو جائے اور بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی تعداد غیر معمولی طور پر بڑھ جائے۔

اس مقام پر یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ ہمارے ہاں یتیم کا لفظ صرف ان بچوں کے لئے بولا جاتا ہے جن کے ماں باپ (یا صرف باپ) مر چکے ہیں۔ لیکن عربی زبان میں یہ لفظ ایسے بچوں کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور ان کے ساتھ ہی ان عورتوں کے لئے بھی، جو خاوند نہ مل سکنے کی وجہ سے تنہا رہ جائیں۔ لہٰذا اس آیت میں جہاں یہ کہا گیا ہے کہ "اگر تمہیں خدشہ ہو کہ تم یتیموں کے مسئلہ کا منصفانہ حل نہیں کر سکو گے" تو اس سے مراد بن باپ کے بچے اور ایسی عورتیں ہیں جو بلا خاوند کے ہوں، خواہ وہ بیوہ عورتیں ہوں اور خواہ ایسی بالغ لڑکیاں

---

[1] مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ کے ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ تم ان عورتوں میں سے جو تمہارے نکاح میں آنا چاہیں نکاح کر سکتے ہو۔

جنہیں خاوند میسر نہ آسکا ہو۔ اس کے بعد آگے بڑھو۔ مدینہ کی ابتدائی زندگی میں مسلسل جنگوں کی وجہ سے اس قسم کی ہنگامی حالت پیدا ہو گئی تھی۔ جس میں اس قسم کے بچوں اور عورتوں کی تعداد میں بڑا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ، مکہ سے مسلمان عورتیں، اپنے غیر مسلم خاوندوں کو چھوڑ کر مدینہ میں پناہ لینے کے لئے چلی آرہی تھیں۔ ان حالات میں ایک مختصر سے معاشرے میں ان یتیموں اور بیواؤں کی موجودگی ایک اہم تمدنی مسئلہ (SERIOUS SOCIAL PROBLEM) بن گیا تھا۔ جس کا تسلی بخش حل نہایت ضروری تھا۔ اگر سوال صرف خورد و نوش تک کا ہوتا تو اس کے کئی حل سوچے جا سکتے تھے۔ لیکن اصل سوال یتیم لڑکیوں اور نوجوان بیواؤں کے DISPOSAL کا تھا۔ اس کے لئے غیر معمولی تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت تھی، بالخصوص اس لئے کہ ان عورتوں کی شادی اپنی جماعت سے باہر نہیں ہو سکتی تھی۔ مسلمان عورتوں کی شادی نہ مشرکین قریش کے ساتھ جائز تھی اور نہ ہی یہود و نصاریٰ کے ساتھ۔ یہ تھے وہ ہنگامی حالات جن کے لئے مندرجہ صدر راہ نمائی ملی۔ یعنی اگر تم دیکھو کہ حالات ایسے پیدا ہو چکے ہیں کہ "یتیموں" کا مسئلہ اس طرح حل نہیں ہو سکتا کہ ان کے تمام حقوق اور تقاضوں کو کماحقہٗ پورا کیا جا سکے تو پھر اس کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایک مرد، ایک سے زیادہ عورتوں کی کفالت اور نگہداشت اپنے ذمے لے لے اور اس طرح معاشرہ کو ان خرابیوں سے بچا لیا جائے جو نوجوان عورتوں کو بلا سرپرست اور یتیم بچوں کو بلا وارث چھوڑنے سے پیدا ہو سکتی تھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ ایسا کرنے سے پہلے یہ بھی دیکھ لو کہ اس سے کہیں تمہارے گھر کا توازن تو نہیں بگڑ جائے گا۔ اگر اس کا اندیشہ ہو تو پھر اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ چنانچہ مذکورہ بالا آیت کے ساتھ ہی ہے۔ (فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً۔ ۴/۳) "اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم عدل قائم نہیں رکھ سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی رہے گی۔"[1]

یہ ہے عزیزہ! سارے قرآن میں تعدد ازدواج (ایک سے زیادہ بیویوں) سے متعلق آیت اور یہ ہے اس کا پس منظر۔ اس کے بعد تم خود ہی سوچو کہ جس طرح مسلمان دھڑا دھڑ شادیاں کرتے ہیں، قرآن سے کسی طرح بھی ان کے جواز کی شکل نکل سکتی ہے؟ ان کے ہاں کوئی شادی بھی ایسی ہوتی ہے جس میں قرآن کی شرط (إِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ ـ ـ ـ ـ اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے بارے میں

---

[1] اس مسئلے کی مزید وضاحت کے لیے چوتھا خط دیکھئے۔

انصاف نہیں کر سکو گے تو ایک سے زیادہ بیویاں کر سکتے ہو، کا کہیں شائبہ تک بھی ہو؟ اس آیت کی آڑ میں عام حالات میں، بلا مشروط، تعدد ازدواج کا جواز پیدا کرنا، قرآن کی کھلی ہوئی تکذیب نہیں تو اور کیا ہے؟
کسی سے پوچھو تو وہ کہہ دیتا ہے کہ صاحب! میرے ہاں اولاد نہیں تھی اس لئے میں نے دوسری شادی کر لی۔ گویا اللہ میاں نے انہیں مکلف ٹھہرایا تھا کہ تم کو فرزندانِ آدم کی تعداد میں اضافہ کرتے مرنا ہے اور کہہ دیا تھا کہ اگر ایسے ہی ہمارے ہاں آجاؤ گے تو تمہیں جہنم میں بھیج دیا جائیگا! اس کے برعکس خدا نے خود کہہ دیا کہ اولاد قانونِ طبعی کے مطابق پیدا ہوتی ہے۔ کسی کے ہاں لڑکیاں، کسی کے ہاں لڑکے، کسی کے ہاں لڑکے لڑکیاں دونوں۔ اور کسی کے ہاں اولاد ہوتی ہی نہیں۔ یَجْعَلُ مَنْ یَّشَآءُ عَقِیْمًا (۴۲/۵۰)
بعض کہہ دیتے ہیں کہ صاحب! بیوی دائم المریض تھی اس لئے دوسری شادی کر لی ہے۔ یعنی ان کے نزدیک رفاقت سے مفہوم یہ ہے کہ جب تک رفیق تندرست رہے، اسے ساتھ رکھا جائے اور جب وہ بیمار ہو جائے تو اسے جہنم رسید کر دیا جائے۔
لیکن اس قسم کے عذرات بھی (خواہ وہ کتنے ہی کمزور کیوں نہ ہوں) اس طبقے کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں جو سمجھتا ہے کہ انسانی معاملات کے لئے کوئی نہ کوئی وجہِ جواز ہونی ضروری ہے۔ مذہب پرست طبقہ کسی عذر کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اس کا جواب صاف ہے کہ جب مذہب نے چار بیویوں کی اجازت دے رکھی ہے تو اس سے بڑھ کر اور کون سی وجہِ جواز چاہیئے؟ چنانچہ اس طبقے کا حال یہ ہے کہ پہلے چار تک کی تعداد پوری کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد ان میں سے کسی ایک کو طلاق دے کر جگہ خالی کر لی جاتی ہے اور پھر خالی جگہ ایک نئی نویلی دلہن سے پُر کر لی جاتی ہے۔ اس طرح نکاح اور طلاق کے احکام کی پابندی سے ثواب بھی ملتا رہتا ہے اور چار بیویوں کی تحدید بھی قائم رہتی ہے۔ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ج وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ ط (۲/۹) "یہ لوگ اللہ کے قانون اور اس کے ماننے والی جماعت کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ مگر ان کا یہ دھوکا خود اپنے آپ کو ہوتا ہے اور وہ اس بات کو سمجھتے نہیں"۔
بہرحال اس حقیقت کو ایک بار پھر سمجھ لو کہ قرآن میں ایک سے زیادہ بیوی کی اجازت کے سلسلہ میں صرف وہی آیت ہے جسے میں نے اُوپر درج کر دیا ہے اور جو ایک اجتماعی مسئلہ کے حل کے لئے ہنگامی تدبیر کے طور پر آئی تھی۔ اس بات کا فیصلہ کہ اس قسم کے حالات پیدا ہو چکے ہیں جن میں قرآنی منشاء کے مطابق

تعددِ ازدواج ضروری ہو گیا ہے، معاشرہ کے کرنے کا ہو گا، نہ کہ افراد کے از خود کرنے کا۔ لہٰذا جہاں تک افراد کا تعلق ہے، اپنے طور پر ایک سے زیادہ بیوی کرنے کی اجازت کہیں نہیں۔

اب ایک قدم اور آگے بڑھو۔ یہ تم نے دیکھ لیا کہ قرآن کی رُو سے نکاح کی غایت رفیقانہ زندگی بسر کرنا ہے۔ جب تک رفاقت موجود ہے، نکاح کا مقصد پورا ہو رہا ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہو گا کہ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ میاں بیوی میں کسی وجہ سے رفاقت نہ رہے اور نہ ہی اس کے پیدا ہونے کی اُمید ہو، تو پھر کیا ہو؟

طلاق

پھر کیا ہو؟ - علیحدگی۔ اور کیا ہو؟ متضاد عناصر کو زبردستی جکڑے رکھنے کا نتیجہ سوائے فساد کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ اسی لئے تو قرآن نے نکاح کو معاہدہ قرار دیا ہے۔ اس علیحدگی کا نام قرآن کی اصطلاح میں طلاق ہے۔ یعنی معاہدہ کی پابندیوں سے آزاد ہو جانا۔ لیکن قرآن نے جس طرح معاہدہ کرنے کے لئے اتنی تاکید کی ہے کہ یہ قدم یونہی بلا سوچے سمجھے نہ اُٹھایا جائے، بلکہ نہایت ٹھنڈے دل سے، تمام احوال و ظروف پر اچھی طرح غور کر کے سمجھ سوچ کر معاہدہ کیا جائے۔ اسی طرح اس نے فسخِ معاہدہ کے لئے بھی ایسی ہی تاکید کی ہے کہ یہ فیصلہ بھی نہایت ٹھنڈے دل سے سب کچھ سوچ سمجھ کر کرنا چاہیئے۔ قرآن کے نزدیک عائلی زندگی کا مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ اس نے فسخِ نکاح کے طریق کی جزئیات تک بھی خود ہی متعین کر دی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اگر میاں بیوی میں اختلاف ہو جائے تو انہیں چاہیئے کہ باہمی افہام و تفہیم سے معاملہ کو سلجھا لیں لیکن اگر بات اس سے آگے بڑھ جائے اور اختلاف کشیدگی کی صورت اختیار کر جائے تو پھر قرآن اس معاملہ کو انہی دونوں پر نہیں چھوڑ دیتا۔ بلکہ اسے ایک اجتماعی، تمدنی مسئلہ بنا کر معاشرہ سے کہتا ہے کہ تم اسے سلجھانے کی کوشش کرو۔ وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا۔ (اگر تمہیں خدشہ ہو کہ میاں بیوی میں تفرقہ پڑ جائے گا)، فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا (تو تمہیں چاہیئے کہ ایک ثالثی بورڈ مقرر کرو جس کا ایک ممبر شوہر کے گھرانے کا ہو اور ایک ممبر بیوی کے خاندان سے)، إِن يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا (۴/۳۵) (اگر یہ پنچ اصلاحِ حال کی کوشش کریں گے تو خدا کا قانون ان کی موافقت کی شکل کو قائم رکھے گا)، کیونکہ مقصود باہمی اختلاف کو رفع کر کے موافقت پیدا کرنا ہے نہ کہ یہ کوشش کرنا کہ ان کے تعلقات منقطع ہو جائیں۔ لیکن اگر اس ثالثی بورڈ کی کوششیں ناکام رہیں اور

وہ اس نتیجے پر پہنچیں کہ ان کی باہمی رفاقت ممکن نہیں تو وہ اپنی رپورٹ عدالت کے سامنے پیش کر دیں گے۔ (اور اگر انہی کو آخری فیصلہ کا اختیار ہو گا تو خود ہی فیصلہ کر دیں گے)، اس طرح یہ معاہدہ فسخ ہو گا۔

یہاں پہنچکر تم پوچھو گی کہ اگر قرآن کی رُو سے طلاق اس طرح ہوتی ہے تو یہ جو ہمارے ہاں ہو رہا ہے کہ کسی دن ہنڈیا میں نمک زیادہ پڑجانے پر میاں کو تاؤ آگیا اور اس نے کہہ دیا "طلاق، طلاق، طلاق" تو بیوی بیچاری روتی دھوتی ماں باپ کے گھر جا بیٹھی تو یہ کیا ہے؟

یا یہ کہ میاں بیوی میں سخت تناؤ ہے۔ دونوں الگ الگ ہو جانے پر راضی ہیں لیکن میاں نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ اسے نہ طلاق دے گا نہ گھر بسائے گا اور اسی طرح رُلا رُلا کر مارے گا۔ تو یہ کیا ہے؟

یہ وہی مذاق ہے جو دین کے ساتھ ہو رہا ہے، اور کیا ہے؟ اور اس کے تحت جذبہ وہی کار فرما ہے کہ مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔ تمام اختیارات انہی کو حاصل ہیں۔ عورتیں ان کی لونڈیاں ہیں۔ یہ ان پر داروغہ ہیں جب تک داروغہ صاحب کے پسندِ خاطر ہوا عورت کو گھر میں رکھا، جب غصہ آگیا باہر نکال دیا۔ یا اسے معلّق چھوڑ دیا کہ نہ اسے بیوی کی طرح رکھا جاتا ہے، نہ مطلقہ کی طرح چھوڑا جاتا ہے۔ ان کوتوالوں کے نزدیک عورت کی حیثیت کیا ہے کہ وہ اتنا بھی پوچھ سکے کہ بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ آخر کس جرم کی پاداش میں مجھے ذبح کیا جا رہا ہے۔

پھر طلاق کے بعد کیا ہو گا؟ ان دونوں کو اجازت ہو گی کہ چاہیں تو اپنے لئے اور رفیق تلاش کر لیں لیکن اس کے لئے عورت کو تھوڑی سی مدت تک انتظار کرنا ہو گا۔ یہ مدت (جسے عدت کہتے ہیں) عام حالات میں تین ماہ کی ہو گی لیکن اگر وہ حاملہ ہو تو پھر وضع حمل تک انتظار کرنا ہو گا۔ اس دوران میں اس کے تمام اخراجات کی ذمہ داری اس کے سابقہ شوہر پر ہو گی۔

عدت

عدت کے دوران میں عورت کسی سے نکاح نہیں کر سکتی۔ لیکن اگر اس مدت میں اس کا سابقہ خاوند جس نے اسے طلاق دی تھی، اپنے کئے پر پچھتائے تو یہ اس سے دورانِ عدت میں نکاح کر سکتا ہے۔ بس یہ ایک فائق حق ہے جو مردوں کو دیا گیا ہے۔ یعنی مرد کے لئے عدت نہیں اور عورت کے لئے عدت ہے۔

مرد کا حق فائق ہے

(اور اس کی مصلحت واضح ہے) اس کے لئے قرآن نے کہا ہے کہ عام اصول تو یہ ہے کہ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (۲/۲۲۸) جو حقوق مردوں کے عورتوں پر ہیں بالکل ویسے ہی حقوق عورتوں کے مردوں پر ہیں۔ لیکن عدت کے زمانے میں اس کا

ئے یہودیوں کی شریعت میں سالن میں نمک زیادہ پڑ جانے سے بھی "شرعی طلاق" دی جا سکتی ہے۔

سابقہ شوہر اس سے پھر شادی کر سکتا ہے۔ یہ ہے مرد کا زائد حق۔ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (۲/۲۲۸) اگر زمانۂ عدت میں یا اس کے بعد، ان دونوں نے باہمی رضامندی سے پھر رشتۂ نکاح استوار کر لیا تو ان کی ازدواجی زندگی پھر شروع ہو جائیگی۔ اگر اس کے بعد پھر کبھی کشیدگی کی صورت پیدا ہو جائے اور نوبت پھر طلاق تک پہنچ جائے تو اس مرتبہ بھی، عدت کے دوران میں یا عدت کے بعد، انہیں معاہدۂ نکاح کی تجدید کا موقع رہے گا۔ (کیونکہ

تین طلاق کا مفہوم

یہ دوسری مرتبہ کی طلاق تھی) لیکن اگر اس کے بعد تیسری مرتبہ بھی طلاق تک نوبت پہنچ گئی تو (یہ تیسری طلاق ہوگی، جس کے بعد) نہ زمانۂ عدت میں اور نہ ہی اس کے بعد، ان میں باہمی نکاح ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ زندگی کی کشتی کا کھینا ہے، بچوں کا کھیل نہیں! اب یہ عورت کسی اور ہی سے نکاح کر سکتی ہے، پہلے خاوند سے نہیں۔ (ہاں! اگر کبھی ایسا ہو کہ یہ دوسرا خاوند اسے طلاق دیدے یا یہ بیوہ ہو جائے تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں کہ یہ پہلے خاوند سے از سر نو نکاح کر لے)

جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے، طلاق کا فیصلہ انفرادی نہیں۔ یعنی یہ نہیں کہ جب مرد کا جی چاہا طلاق دے دی۔ یہ ایک معاشرتی مسئلہ ہے جس کا فیصلہ معاشرتی نظام (عدالت) کی طرف سے ہوگا۔ اس کے لئے جس طرح مرد کو حق حاصل ہے کہ وہ اختلافی صورت میں عدالت کی طرف رجوع کرے، اسی طرح عورت کو بھی حق حاصل ہے۔ جس طرح عورت، مرد کو مجبور نہیں کر سکتی کہ وہ اسے اپنے نکاح میں رکھے اسی طرح مرد بھی عورت کو مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ اس کے نکاح میں جکڑی رہے۔ نکاح کی غایت اور بنیادی شرط رفاقت ہے اور رفاقت اور جبر متضاد باتیں ہیں۔ جب رفاقت نہ رہے تو نکاح کیسے رہ سکتا ہے۔

یہ ہیں عزیزہ! قرآن کی رُو سے نکاح اور طلاق کے احکام۔ ان پر غور کرو اور سوچو کہ ان میں کہیں بھی عورت کے حقوق مردوں سے کم رکھے گئے ہیں اور کہیں بھی مردوں کو عورتوں پر حاکم اور داروغہ بنایا گیا ہے؟ اب رہا تمہارا یہ سوال کہ قرآن کی ان تصریحات کے باوجود، جو کچھ ہمارے ہاں ہوتا چلا آرہا ہے وہ کہاں سے آگیا۔ تو اس کا جواب آسان ہے۔ جہاں سے ہمارا باقی "مذہب" آگیا وہیں سے یہ کچھ آگیا۔ ہمارے ہاں "مذہب" کا کونسا گوشہ ہے جو قرآن کے مطابق ہے جو عائلی زندگی کے باب میں اس قدر حیرت ہو؟ دنیا کی ابتدائی سوسائٹی (PRIMITIVE SOCIETY) میں بالعموم معاشرہ کا انداز وہ ہوتا تھا جسے (MATRIARCHAL) کہتے ہیں۔ اس میں عورت کی حیثیت خاندان کے حاکم کی ہوتی تھی۔ عربوں کی پرانی معاشرت میں بھی معاشرہ کا یہی نظام تھا۔ لیکن ان کے دائیں بائیں جو دو بڑی بڑی (بازنطینی اور ایرانی) تہذیبیں تھیں۔ ان میں معاشرہ

کا انداز 'PATRIARCHAL' تھا جس میں حکومت مرد کے پاس رہتی ہے۔ اسلام سے ذرا پہلے عربوں نے بھی ان تہذیبوں سے متاثر ہونا شروع کر دیا تھا۔ اور ان کے معاشرے میں مرد کی حکومت کے آثار

اسلام کی خصوصیت

پیدا ہونے لگے تھے۔ اسلام آیا تو اس نے نظم معاشرہ کا تصور ہی بدل دیا۔ اس میں نہ حکومت مرد کے لئے تھی نہ عورت کے لئے۔ یہاں دونوں کو مساوی حیثیت دی گئی تھی اور انہیں سفر زندگی میں دوش بدوش چلایا گیا تھا۔ یہ تھے قرآن کے احکام۔ اس کے بعد جب مسلمانوں میں ملوکیت آئی اور ایرانی اور بازنطینی (بالخصوص ایرانی) تہذیب ان کی جلوت اور خلوت میں سرایت کر گئی تو ان کے معاشرہ میں مرد نے حاکم کی حیثیت لے لی۔ یہ وہ دور تھا جب قرآنی اسلام کی جگہ ایک نیا اسلام مرتب ہو رہا تھا اور جو ہمارے ہاں اس وقت تک رائج ہے۔ ہماری عائلی زندگی سے متعلق احکام بھی اسی جدید اسلام کے پیدا کردہ ہیں جن کا قرآن سے کچھ تعلق نہیں۔ چونکہ یہ "اسلام" ملوکیت اور پیشوائیت کا تخلیق کردہ ہے اس لئے اس کی مابہ الامتیاز خصوصیت استبداد ہے۔ مُلّا اور مُلّا دونوں کی دنیا میں استبداد، ایسے استبدادی نظام معاشرہ میں جس میں

ہر گرگ کو ہے برّہ معصوم کی تلاش

عورت کے لئے مقام انسانیت کی توقع رکھنا خیال خام ہے۔ اسی استبداد کا یہ نتیجہ ہے کہ آج جس جگہ عورت کو کچھ آزادی ملی ہے، اس نے مرد سے انتقام لینا شروع کر دیا ہے۔ لہٰذا رفاقت کا تصور نہ ہمارے قدیم معاشرے میں ہے نہ اس جدید میں۔ نہ وہ قرآنی خطوط پر متشکل تھا، نہ یہ ہے۔ ہمارا سارا معاشرہ اس افراط و تفریط کے جھولے میں جھول رہا ہے۔ اس میں سکون اور قیام کی اس کے سوا کوئی اور شکل نہیں کہ ہم پرانے، انسانوں کے خود ساختہ معاشرہ کو بھی چھوڑ دیں اور نئی حدود فراموشیوں کو بھی الگ رکھ دیں اور معاشرہ کی بنیاد از سرنو قرآن کی حدود پر قائم کریں۔ اسی سے وہ جنت مل سکتی ہے جس سے نکلا ہوا آدم اس طرح مارا مارا پھر رہا ہے۔

اب رہیں ہمارے معاشرہ کی مظلوم عورتوں کی دکھ بھری داستانیں۔ سو تم نے تو شاید یہ داستانیں اپنے قیاس سے لکھی ہیں لیکن میرے سامنے اس قسم کے بیچ واقعات صبح سے شام تک آتے رہتے ہیں۔ میری حالت تو بیچ ایک ڈاکٹر کی سی ہو چکی ہے کہ اس کے پاس جو آتا ہے روتا ہوا آتا ہے۔ ڈاکٹر تو شاید

اپنے دل کو کڑا کر لیتے ہیں، لیکن مجھے تو تم جانتی ہو کہ میں کس قدر حساس واقع ہوا ہوں، بالخصوص عورتوں اور بچوں کے معاملے میں۔ کہنے والا اپنی یا کسی کی بپتا کی کہانی کہہ کر چلا جاتا ہے اور مجھ پر رات کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ تم کیا جانو طاہرہ! کہ کتنی معصوم لڑکیاں ہیں جو ماں باپ کے سر پر بوجھ بنی بیٹھی ہیں۔ کیونکہ ان غریبوں کے پاس اتنی دولت نہیں جس کا مطالبہ ان "شریفوں اور شریف زادوں" کی طرف سے ہوتا ہے جو انہیں بیاہ کر لے جانا چاہتے ہیں۔ ان بیچاریوں کے لب سیئے ہوتے ہیں۔ لیکن اپنی حالت کا احساس اُن کی ہڈیوں کے گودے تک کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتا ہے۔

مصیبت زدہ عورتیں

کتنی مظلوم لڑکیاں ہیں جنہیں ان کی مرضی کے خلاف اُن انسان نما درندوں کے ساتھ جکڑ دیا جاتا ہے، جن کے متعلق علم ہوتا ہے کہ ان میں دنیا بھر کے عیب موجود ہیں۔ لیکن وہ بچاریاں زبان سے ایک لفظ تک نہیں کہہ سکتیں۔ کتنی معصوم بچیاں ہیں جنہیں ہماری سوسائٹی کے "مہذب بدمعاش" اس قدر تنگ کرتے ہیں کہ وہ خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ جب اُن کے زیور کا آخری چھلہ تک چھین لیا جاتا ہے تو انہیں مجبور کیا جاتا ہے کہ اپنے ماں باپ کے گھر سے روپیہ لائیں اور جب وہ روپیہ نہیں لا سکتیں تو مار مار کر ان کی ہڈیاں توڑ دی جاتی ہیں۔ کتنی لڑکیاں ہیں جنہیں نہ گھر میں بسایا جاتا ہے اور نہ ہی طلاق دی جاتی ہے اور دندناتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ یا تو اتنا روپیہ دو اور یا ساری عمر اسی طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرو۔ اس سے بھی آگے بڑھو تو کتنی کمزور اور بیمار لڑکیاں ہیں جن کے ہاں بیس بیس سال کی عمر تک چار چار، پانچ پانچ بچے پیدا ہو جاتے ہیں اور گھر میں اتنا بھی نہیں ہوتا کہ ان کا پیٹ بھر سکے۔ وہ دن بھر محنت مزدوری بھی کرتی ہیں اور اتنے بچوں کو بھی سنبھالتی ہیں اور ساتھ ہی اپنے "مجازی خداوند" کے ظلم بھی برداشت کرتی ہیں۔ پھر کتنے ایسے گھر ہیں جن میں غریبی کے زمانہ میں تو کسی نہ کسی طرح گزران ہو جاتی ہے، لیکن جونہی میاں صاحب کی جیب میں چار پیسے آ جاتے ہیں، ان کے سر پر دوسری شادی کا بھوت سوار ہونا شروع ہو جاتا ہے اور ان بیچاریوں کو بچوں سمیت ان کے ماں باپ کے گھر بھیج دیا جاتا ہے۔ اور ولایت جانے والوں کا تو پوچھو ہی نہیں، جو گیا، آتے وقت ایک میم صاحبہ ساتھ لے آیا۔ اب پہلی بیوی کا یہ ہے کہ بچوں کو لے کر در بدر ماری ماری پھر رہی ہے اور میم صاحبہ گلچھرے اڑا رہی ہیں۔ کوئی اُن سے پوچھنے والا نہیں کہ تمہیں ان بے گناہوں کو تباہ و برباد کرنے سے ذرا شرم محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن شرم کیسی؟ وہ کہتے ہیں کہ جب "شریعتِ حقّہ" نے اس کی اجازت دے رکھی ہے تو کون ہے جو ہمیں ٹوک سکتا ہے؟

ہمارے معاشرہ کے اس عذابِ جہنّم کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں کی کم ازکم ساٹھ ستّر فیصد لڑکیاں تپِ دق میں مبتلا ہوتی ہیں اور بیچاریاں گھُل گھُل کر مرجاتی ہیں۔ مجھے ڈاکٹر صاحب ہر دوسرے تیسرے دن آکر بتا دیتے ہیں کہ آج ایک مریضہ لڑکی آئی۔ حالت یہ تھی کہ تپِ دق دوسرے تیسرے درجے تک پہنچ چکا ہے لیکن ایک بچّہ گود میں ہے اور ایک پیٹ میں۔ طاہرہ بیٹی! میں تجھے کیا بتاؤں کہ ان واقعات سے مجھ پر کیا گزرتی ہے؟ کسی کے ایک بیٹی ہوگی تو اسے اسی کا غم ستائے گا لیکن میں ان سب بیٹیوں کے غم میں خون کے آنسو روتا ہوں۔ یہ آنسو ان کے غم میں نہیں روتا۔ اپنی بے بسی پر روتا ہوں۔ جب کسی کے جورو تشدد کی کہانی سنتا ہوں تو جی میں آتا ہے کہ اس ناہنجار کو سخت سے سخت سزا دوں۔ لیکن اس داستانِ غم کے ختم ہوجانے کے بعد جب سوال یہ آتا ہے کہ اب کیا کیا جائے تو سوائے اس کے کہ سنانے والا بھی روئے اور میں بھی روؤں اور کچھ بن نہیں پڑتا۔ یہ ہے وہ عذابِ مسلسل طاہرہ! جس سے تمہارے چچا گزر رہے ہیں!

اب تم پوچھتی ہو کہ اس کا علاج؟ اس کا علاج انفرادی اصلاح سے تو ہو نہیں سکتا۔ جب کسی معاشرہ کی خرابیاں اس حد تک عام ہو چکی ہوں تو ان کا انفرادی علاج ہوا ہی نہیں کرتا۔ اس کا علاج پورے کے پورے معاشرہ کے بدل دینے سے ہو سکتا ہے۔ وہی چیز جسے قرآن نے "تبدل الارض غیر الارض والسمٰوٰت" سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی اس زمین کو بدل دیا جائے، اس آسمان کو بدل دیا جائے۔ جب تک ہمارے معاشرہ کو بدل کر اس کی جگہ قرآنی معاشرہ قائم نہیں کیا جاتا، اصلاحِ حال کی کوئی صورت ممکن نہیں اگر اس کے سوا کوئی اور صورت ممکن ہوجائے تو قرآن کا یہ دعویٰ باطل ہوجائے کہ انسانوں کا بنایا ہوا کوئی قانون اور کوئی نظام، اس کی جگہ لے ہی نہیں سکتا۔ اس سے پہلے (انگریز کی محکومی کے زمانے میں) ہمارے لئے اس قسم کا معاشرتی انقلاب ممکن نہیں تھا۔ لیکن حصولِ پاکستان کے بعد اس انقلاب میں کوئی دشواری نہیں ہونی چاہئے تھی اب ہم اپنے لئے خود قوانین وضع کر سکتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جس قسم کے قوانین ہوں گے اسی قسم کا معاشرہ کا چلن ہوگا۔ قوانین کے علاوہ اب ہمارا نظامِ تعلیم بھی ہمارے اپنے ہاتھ میں ہے۔ ہم صحیح تعلیم سے اپنے بچّوں (لڑکوں اور لڑکیوں) کے دماغ کو صحیح سانچے میں ڈھال سکتے ہیں جس سے وہ معاشرہ کے غلط خطوط کو بطیبِ خاطر بدل کر رکھ دیں۔ یہ سب کچھ ہمارے اپنے اختیار میں ہے۔ کس قدر بدقسمت ہے وہ قوم کہ وہ ان مصیبتوں میں مبتلا ہے جن کا علاج ان کے اپنے ہاتھ میں ہو! خود ہی اندر سے کُنڈی بند کئے بیٹھے ہیں اور خود ہی رو رہے ہیں کہ

طاہرہ کے نام

تیسرا خط

باہر نکلنے کا راستہ نہیں!

اچھا خدا حافظ! سلیم کی واپسی کی امید کب تک ہے۔ اسی ڈاک میں اس کے نام بھی ایک خط بھیج رہا ہوں۔

والسلام!

پرویز

۱۵۔ اگست ۱۹۵۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طاہرہ کے نام چوتھا خط

(دوسری بیوی)

نہیں بیٹی! یوں نہیں۔ صابرہ بیچاری کے ساتھ تو وہ ہوا جو اس شاہزادی کے ساتھ ہوا تھا جو جادو کی سوئیاں نکالتی رہی تھی۔ تمہیں وہ کہانی یاد ہے یا اب بھول گئیں؟ بچپن میں تو تم اسے بڑے شوق سے سُنا کرتی تھیں۔ اس وقت تم اس لئے کہانیاں سُنا کرتی تھیں کہ نیند آجائے۔ لیکن اب میں تمہیں وہی کہانیاں اس لئے سناتا ہوں کہ تم نیند سے جاگ اُٹھو۔ کہانیاں وہی ہیں، صرف ان کا مقصد بدل گیا ہے اور یہ بات کچھ تمہارے ساتھ ہی مخصوص نہیں۔ بڑی بڑی قوموں کے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہے۔ تنزّل کے زمانے میں قومیں اپنی ماضی کی کہانیاں اس لئے سُنتی ہیں کہ انہیں نیند (بلکہ موت) آجائے۔ اور بیداری کے زمانے میں وہی کہانیاں قوم کے لئے حیاتِ تازہ کا موجب بن جاتی ہیں۔ کہانی کے اثر کا انحصار کہانی سے زیادہ، کہانی سُننے والے پر ہوتا ہے۔ اگر میں بھولا نہیں تو اس شہزادی کی کہانی یہ تھی، کہ اس نے ایک دن اپنے باغ میں دیکھا کہ ایک نہایت خوبصورت شاہزادہ خاموش لیٹا ہوا ہے۔ ساکت وصامت، بیہوش پڑا ہے اور اس کا سارا جسم سوئیوں سے چھدر رہا ہے۔ یہ سماں دیکھ کر شاہزادی سہم سی گئی۔ وہ چیخ مار کر بھاگ جانا چاہتی تھی کہ کہیں سے آواز آئی، کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ اس شہزادے پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ اس کے بدن سے یہ سوئیاں نکل سکتی ہیں لیکن ایک دن میں ایک سوئی نکلے گی۔ جب آخری سوئی نکلے گی تو شہزادہ آنکھیں کھول کر اُٹھ بیٹھے گا اور جس عورت پر سب سے پہلے اس کی نگاہ پڑے گی اس سے شادی کر لے گا۔ یہ سُن کر شاہزادی کو اطمینان ہوا اور اس نے اس کے بدن سے سوئیاں نکالنی شروع کر دیں۔ وہ ایک ایک سوئی ہر روز نکالتی۔ دن مہینوں میں اور مہینے برسوں میں بدلتے گئے اور شاہزادی دنیا وما فیہا سے بے خبر، سوئیاں نکالنے میں مصروف رہی۔ اس کی جوانی کے دن ڈھلتے جارہے تھے۔ ماں، باپ، خویش واقارب، اپنے پرائے سب اس سے کہتے کہ وہ کس وہم میں پڑ کر اپنی زندگی برباد کر رہی ہے۔ لیکن وہ کسی کی نہ سنتی۔ اس نے

شاہ زادی کی کہانی

دنیا کا ہر عیش اور آرام اپنے اُوپر حرام کر لیا۔ وہ اپنی دُھن میں بالکل بیراگن بن گئی۔ بس اسے خیال تھا تو شہزادے کا اور اس کی سوئیوں کا۔ بارہ برس تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اب سوئیاں گنتی کی رہ گئیں۔ آٹھ، آٹھ سے چھ۔ چھ سے چار، چار سے دو، دو سے ایک، جب آخری سوئی باقی رہ گئی تو شاہزادی کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اب ساری دنیا اس کی نگاہوں میں پھر سے زندہ ہو رہی تھی۔ وہ تصوّر ہی تصوّر میں سوچتی کہ شاہزادہ کس طرح مسکرا کر اُٹھے گا، اور پھر کس طرح ان کی شادی ہوگی! اس کے بارہ برس کے خواب کس طرح ایک ایک کر کے سچ ہو جائیں گے! اس نے سوچا کہ آخری سوئی نکالنے سے پہلے اسے شادی کا جوڑا پہن لینا چاہئیے۔ چنانچہ وہ اس تیاری میں مصروف ہو گئی۔ اسکی ایک لونڈی تھی جسے اس تمام ماجرا کا علم تھا۔ شاہزادی اُدھر گئی تو لونڈی نے چپکے سے آ کر وہ آخری سوئی نکال لی۔ سوئی کا نکلنا تھا کہ شاہزادہ آنکھیں کھول کر مسکراتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ سوئی نکالنے والی کا ہزار ہزار شکریہ ادا کیا اور اس کے ساتھ شادی کرنے کے لئے اُٹھ کر چلا گیا۔ جب شہزادی نہا دھو، کپڑے بدل کر واپس آئی تو اس نے دیکھا کہ شاہزادہ وہاں سے گم ہے۔ وہ اس صدمہ کو برداشت نہ کر سکی اور پاگل ہو گئی۔ وہ لونڈی تو شہزادی بن گئی اور پاگل شہزادی لبنیٰ لبنیٰ اور جنگل جنگل شہزادے کی تلاش میں ماری ماری پھرنے لگی۔

یہ تھی وہ کہانی جو تمہیں تمہاری نانی امّاں رات کو سونے سے پہلے سنایا کرتی تھیں اور جسے سُن کر تم بڑے غصّے سے کہا کرتی تھیں کہ اگر وہ لونڈی کہیں مل جائے تو میں اسے درخت کے ساتھ باندھ کر اتنا پیٹوں کہ وہ لہولہان ہو جائے اور اسے اس وقت تک نہ چھوڑوں جب تک وہ اس شہزادے کو شہزادی کے حوالے نہ کر دے۔

زیدی اور صابرہ صابرہ کے ساتھ، بیتی بھی کچھ ہؤا ہے۔ زیدی اور صابرہ نے ایک ہی گھر میں اکٹھے پرورش پائی تھی۔ زیدی کا باپ بچپن میں فوت ہو گیا تھا اور اس کے چچا نے اس یتیم بچّے کو اپنے ہی بچّوں کے ساتھ شامل کر لیا تھا۔ صابرہ اور زیدی اس طرح اکٹھے کھیلتے بڑے ہوئے۔ یوں تو بالعموم ہر لڑکی، لڑکوں کی نسبت زیادہ حسّاس اور رقیق القلب ہوتی ہے۔ لیکن صابرہ نے اپنے سینے میں خاص طور پر ایک دلِ درد آگیں پایا تھا۔ جب اسے معلوم ہؤا کہ زیدی یتیم ہے تو اس کے ساتھ اسکی ہمدردیاں اور بھی بڑھ گئیں۔ اس کی کیفیت یہ تھی کہ اگر اسے کوئی پھل یا مٹھائی کھانے کو ملتی تو وہ اسے خود نہ کھاتی بلکہ اُٹھا رکھتی اور جب زیدی اسکول سے آتا تو چپکے سے اسے دے دیتی۔ اسی طرح اگر اُسے عید بقرعید پہ پیسے ملتے تو وہ انہیں بھی زیدی کو دے دیتی۔ بچپن میں اس کی معصوم ہمدردیوں کا جذبۂ محرکہ محض یہ احساس تھا

کہ زیدی کا باپ نہیں ہے۔ شاید ان ہمدردیوں کی وجہ سے یا کسی اور غیر شعوری جذبے کے ماتحت زیدی بھی اپنے دل میں صابرہ سے زیادہ قریب ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ جب اس نے میٹرک پاس کر لیا تو ایک دن چپکے سے اپنی چچی کے کان میں کہہ دیا کہ وہ چاہتا ہے کہ اس کی شادی صابرہ کے ساتھ ہو جائے۔ گھرانے میں اس تجویز کی سخت مخالفت ہوئی اور مخالفت کرنے والوں میں خود صابرہ کی ماں بھی تھی۔ زیدی کی بیوہ ماں تو چاہتی تھی کہ یہ رشتہ ہو جائے لیکن اپنی غریبی اور بیوگی کی وجہ سے اس بات کو زبان تک لانے کی جرأت نہیں کرتی تھی۔ یہ کشمکش ایک عرصہ تک جاری رہی اور صابرہ یہ کچھ خاموش آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ ایک دن کسی پڑوسن سے باتیں کرتے ہوئے صابرہ کی ماں کے منہ سے نکل گیا کہ میں اس لڑکے کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کس طرح کر دوں جس نے خود ہمارے گھر میں خیرات کے ٹکڑوں پر پرورش پائی ہے۔ جب یہ بات صابرہ نے سنی تو اس سے نہ رہا گیا۔ اس نے اپنے لبوں سے مہرِ خاموشی کو توڑا اور اپنی ماں سے کہہ دیا کہ تم اس یتیم کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہو، یہ بہت بری بات ہے۔ ہمارے خدا کا حکم ہے کہ یتیموں کی عزت کرو۔ اب کچھ بھی ہو میں اسی یتیم اور غریب کے ساتھ شادی کروں گی۔

زیدی ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ اس کی زندگی میں وہ دن انتہائی خوش بختی کا تھا جب صابرہ نے اپنی ماں سے یہ کہا تھا۔ چنانچہ ان دونوں کی شادی ہو گئی۔

صابرہ بڑی سلیقہ شعار لڑکی تھی۔ ایک کلرک کی بساط ہی کیا ہوتی ہے اس پر زیدی کا کنبہ کھانے والا

صابرہ کی سلیقہ شعاری

دو بھائی، بہن، بیوہ ماں، خود صابرہ، پھر باپ کا چھوڑا ہوا کچھ قرضہ بھی۔ لیکن صابرہ نے اس سلیقے سے گھر چلانا شروع کیا کہ کسی کو شبہ تک نہیں گزر سکتا تھا کہ ان کی آمدنی اس قدر قلیل ہو گی۔ اس میں سلیقے سے زیادہ صابرہ کے ایثار کو دخل تھا۔ وہ اپنی تمام ضروریات کو پس پشت ڈال دیتی اور اپنے میاں اور اس کے کنبے کی ضروریات کو مقدم رکھتی۔ ذرا وقت ملتا تو اڑوس پڑوس سے سینے پرونے کا کام لے آتی اور اس سے بھی کچھ آمدنی کی صورت پیدا کر لیتی۔ صابرہ کو اس قدر مشقت کی زندگی تو بسر کرنی پڑتی تھی لیکن اس کے دل کو بڑا اطمینان تھا، بالخصوص اس خیال سے کہ اس کا میاں اس سے خوش ہے اور وہ ایک نادار اور کسمپرس گھرانے کی پرورش و کفالت میں پورا پورا حصہ لے رہی ہے۔

زیدی یوں تو بڑا مطمئن تھا لیکن ایک خیال اسے رہ رہ کر ستاتا تھا۔ یعنی یہ کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکا۔ صابرہ نے جب دیکھا کہ زیدی اس خیال سے افسردہ خاطر رہتا ہے تو اس نے اس کا حوصلہ بندھانا شروع

کیا۔ اس نے پہلے یہ تجویز کی کہ وہ دفتر کے اوقات کے بعد، ایک کالج میں شام کی کلاسز میں داخل ہو جائے لیکن اس کے لئے زیدی کو وہ ٹیوشن چھوڑ دینی پڑتی تھی جو اس نے سال بھر سے رکھی تھی اور جس سے انہیں بیس پچیس روپے مہینہ مل جاتے تھے۔ زیدی کے راستے میں یہ خیال حائل ہو رہا تھا۔ صابرہ نے اس کا حل یہ نکالا کہ محلے کے تین چار بچوں کو رات کے وقت خود پڑھانا شروع کر دیا اور اس طرح بیس پچیس روپے کے بجائے تیس روپے ماہوار کی آمدنی کی شکل پیدا کر لی۔ اس طرح زیدی نے آہستہ آہستہ بی۔ اے پاس کر لیا۔ بی۔ اے کے بعد اس نے چاہا کہ وہ کسی طرح ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان پاس کر کے وکیل بن جائے۔ لیکن اس کے لئے اسے ملازمت چھوڑنی پڑتی تھی۔ کیونکہ اس زمانے میں وکالت کی تعلیم کے لئے شام کی کلاسز نہیں ہوتی تھیں۔

محنت اور ایثار

یہ مرحلہ بڑا مشکل (بلکہ ناممکن) تھا۔ لیکن صابرہ نے زیدی سے کہا کہ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ اگر آپ کا یہ ارادہ ہے تو آپ ملازمت چھوڑ دیں۔ میں دن میں بھی بچے پڑھانا شروع کر دوں گی اور سلائی کے کام میں بھی زیادہ محنت کر لوں گی۔ آپ شوق سے وکالت کی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دیں، میں اپنا گزارہ بھی کر دوں گی اور آپ کی تعلیم کا خرچ بھی مہیا کر دوں گی۔ چنانچہ زیدی نے لاء کالج میں داخلہ لے لیا اور دنیا یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی کہ صابرہ نے واقعی وہ سب کچھ کر کے دکھایا جو اس نے زبان سے کہا تھا۔ اس کی مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ ہفتے میں کئی دن ایسے آتے جن میں اُسے بمشکل تین یا چار گھنٹے سونے کے لئے ملتے۔ وہ دن رات مسلسل محنت کرتی اور اس حالت میں محنت کرتی کہ اس کی بچی بھی اس کی گود میں ہوتی۔ بچی بڑی خوبصورت اور بھولی بھالی تھی۔

صابرہ اس طرح مسلسل "شاہزادے" کی سوئیاں نکالنے میں مصروف رہی۔ زیدی نے وکالت کا امتحان پاس کیا تو صابرہ نے سمجھا کہ اب اس کے امتحان کے دن بھی ختم ہو گئے، اور اسے اطمینان کا سانس لینا نصیب ہو جائے گا۔ شبانہ روز کی اس جان کاہ محنت نے اس کی صحت کا ستیاناس کر دیا تھا لیکن اسے اس کی بھی کچھ پرواہ نہ تھی۔ اسے خوشی اس کی تھی کہ اس کے میاں کی آرزو پوری ہو گئی (اور شاید اس سے بڑھ کر یہ لاشعوری احساس کہ جن چیزوں سے زیدی اس لئے محروم ہو گیا تھا کہ وہ یتیم تھا، وہ ان چیزوں کو پورا کرنے کا موجب بن رہی تھی)

لیکن صابرہ نے دیکھا کہ زیدی اب بھی مطمئن نہیں۔ اور کوئی خیال ہے جو اسے رہ رہ کر ستا رہا ہے۔ اس نے کئی مرتبہ پوچھنے کی کوشش کی لیکن زیدی ٹال جاتا رہا۔ بالآخر ایک دن اس کے اصرار پر زیدی نے کہا کہ بات یہ

ہے کہ بچپن سے میری آرزو یہ تھی کہ میں ولایت جاؤں اور وہاں سے بیرسٹر بن کر آؤں پھر یہاں بہت بڑا لیڈر بن جاؤں۔ لوگ میری تقریریں سننے کے لئے آیا کریں۔ میرے جلوس نکلا کریں۔ زندہ باد کے نعرے لگا کریں۔ پھر میں اسمبلی کا ممبر بن جاؤں۔ اس کے بعد وزیر بن جاؤں۔ لیکن میری یہ سب آرزوئیں سینے ہی میں مدفون رہتی نظر آرہی ہیں۔ اب میں والدہ کی طرف سے تو بے فکر ہوں کیونکہ وہ چھوٹے بھائی کے ساتھ ہیں۔ فکر صرف تمہاری ہے۔ اگر کوئی ایسی صورت نکل آتی کہ تم اپنا گزارہ چلا سکتیں تو میں ولایت میں اپنی تعلیم کے لئے کچھ نہ کچھ کر ہی لیتا لیکن اس کی کوئی شکل نظر نہیں آتی۔

صابرہ نے یہ سب کچھ بڑے غور سے سنا۔ لیکن اس کا جواب نہ دیا۔ دو چار روز کے بعد اس نے زبیدی سے کہا کہ میں نے اس مسئلے پر غور کر لیا ہے۔ آپ میری فکر نہ کیجئے۔ میں اپنا اور بچی کا گزارہ کسی طرح چلا لوں گی آپ بسم اللہ کیجئے۔ خدا آپ کے ارادوں میں برکت دے۔ میری انتہائی خوشی آپ کی آرزوؤں کی تکمیل میں ہے۔ سب سے بڑا سوال ولایت تک کے کرائے کا ہے۔ اس کے لئے میرا زیور موجود ہے، فکر کس بات کی ہے؟

زبیدی نے یہ سنا تو سکتے کے عالم میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور زبان خاموش۔ وہ بے اختیار آگے بڑھا اور صابرہ کو گلے سے لگا لیا اور بے اختیار رونے لگ گیا۔ جب ذرا جذبات کا طوفان تھما، تو لڑکھڑاتی زبان سے اتنا کہا کہ صابرہ! تم عورت نہیں آسمان کا کوئی فرشتہ ہو۔ تم پرستش کے قابل ہو۔ میں قطعاً تمہارے شایان شان نہ تھا۔ آج اس زمین پر کوئی شخص مجھ سے زیادہ خوش بخت نہیں ہے جسے تمہارے جیسی بیوی مل گئی جو کچھ اس وقت میرے دل میں اٹھ رہا ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا کس طرح اظہار کروں۔ صابرہ! تم سچ مچ پرستش کے قابل ہو! تمہاری ساری زندگی مسلسل ایثار اور محبت کی زندگی رہی ہے اور میں بے حد شرمسار ہوں کہ میں تمہیں کوئی بھی آرام نہ پہنچا سکا۔ بلکہ ساری عمر تکلیفوں اور پریشانیوں ہی کا باعث بنا رہا۔ یہ یونہی میرا بچپن تھا کہ میرے دل میں ولایت جانے کی خواہش پیدا ہو گئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے تمہیں کس قدر پریشانیاں اٹھانی پڑیں گی۔ میں اب تمہارے لئے مزید مصیبتوں کا موجب نہیں بننا چاہتا۔ میں اپنے خیال کو ترک کرتا ہوں۔ یہ کیا انصاف ہے کہ میری ہر خواہش پوری ہوتی رہے اور تم مسلسل پریشانیوں کی زندگی بسر کرو۔ نہیں صابرہ! میں ایسا نہیں کرنا چاہتا۔

زبیدی نہ معلوم اور کیا کچھ کہنا چاہتا تھا کہ صابرہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ اور کہا کہ اگر میاں اور بیوی

ہیں بھی "تیرے اور میرے" کا امتیاز پیدا ہونے لگ جائے تو پھر دنیا میں یگانگت کی زندگی کہاں سے مل سکے گی؟ آپ ہی نے تو بتایا تھا کہ نکاح کے لفظی معنی اس قسم کے تعلق کے ہیں جیسے آنکھوں میں نیند گھل جائے۔ لہٰذا میاں اور بیوی میں آرام اور مسرت کی تمیز کا کیا سوال۔ آپ کی ہر خواہش کی تکمیل میں میری خوشی پوشیدہ ہوتی ہے۔ میرا فیصلہ ہے کہ آپ ضرور ولایت جائیں گے بلکہ یہ کہئے کہ یہ اب میری خواہش ہے جس کا پورا کرنا آپ کے لئے ضروری ہے۔

اتنے میں بچی کے رونے کی آواز آئی اور صابرہ اُدھر چلی گئی۔

کچھ دن اسی اصرار و تکرار میں گذر گئے۔ زیدی کہتا کہ اب میں نہیں جاؤں گا اور صابرہ کا اصرار تھا کہ تم ضرور جاؤ۔ بالآخر وہ دن آگیا جب صابرہ زیدی کو الوداع کہنے کے لئے اسٹیشن تک گئی۔ زیدی کی آنکھوں سے آنسو تو پہلے ہی رواں تھے۔ جب بچی کو گود میں لیا تو سسکیاں لے کر رونے لگ گیا۔ اب صابرہ سے

زیدی ولایت چلا گیا

بھی ضبط نہ ہو سکا اور اس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسوؤں کے چند قطرے ڈھلک کر نیچے آگرے۔ گاڑی روانہ ہو گئی اور جب صابرہ واپس لوٹی تو اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ وہ کرایہ ادا کر کے اپنے باپ کے گھر پہنچ سکتی۔ زیدی نے یہ سب کچھ اپنے اس آرٹیکل میں لکھا تھا جو اس نے ولایت پہنچنے کے ساتھ ہی وہاں کے ایک میگزین میں شائع کرایا تھا اور جس کا عنوان تھا "ناقابلِ یقین" "UN-BELIEVABLE"

صابرہ اپنی ایک سہیلی پروین کے ہاں گئی کہ اس سے کچھ قرض لے کر میکے تک پہنچے۔ پروین نے جب یہ سنا تو اس نے یونہی ہنسی میں کہہ دیا کہ تمہیں خود بھی زیدی کے ساتھ ولایت چلے جانا چاہئے تھا۔ ان مردوں کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا۔ اگر وہ وہاں سے کوئی میم لے آیا تو کیا کرو گی؟

پروین نے تو یہ کچھ ہنسی میں یونہی کہا لیکن صابرہ کی حالت یہ تھی کہ اس کے بس میں ہوتا تو اس کا گلا گھونٹ دیتی۔ اس نے بڑی مشکل سے ضبط کیا اور صرف اتنا کہا کہ پروین! تم نے یہ کہہ کر میری اس قدر توہین کی ہے جس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتیں! تم نے یہ سمجھا ہی نہیں کہ تم کس کے متعلق کہہ رہی ہو؟ تم ناہید کے ابا کو مطلق نہیں سمجھ سکیں۔ تم جانتی ہی نہیں کہ وہ دنیا کے عام مردوں سے کتنے اونچے ہیں۔ تمہیں علم ہی نہیں کہ وہ کیا ہیں؟ پروین! دنیا ادھر سے اُدھر ہو جائے وہ کسی دوسری عورت کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گے۔

پروین کو افسوس تھا کہ اس نے صابرہ کا دل کیوں دکھا دیا۔

صابرہ اپنے باپ کے گھر چلی گئی۔ وہ غریب آدمی تھا۔ اس پر وہ قصبہ جہاں وہ رہتے تھے چھوٹا سا تھا جس

صابرہ کی مشکلات

میں صابرہ کے لئے نہ بچّے پڑھانے کا کام تھا نہ سینے پرونے کا زیادہ دھندا۔ اب اسے مشکلات کے ہجوم نے آگھیرا لیکن اس نے ہمّت کو ہاتھ سے نہ چھوڑا اور اپنی ذہانت اور محنت سے ایسے راستے نکالتی رہی جس سے وہ نہ صرف اپنا اور اپنی بچّی کا گزارہ چلا سکے بلکہ وقتاً فوقتاً تحفے کے طور پر خود زبیدی کو بھی کچھ نہ کچھ بھیج سکے۔ اس کی صحت پر البتّہ اس جانکاہ مشقّت کا سخت اثر پڑ رہا تھا۔ اس کٹھن زندگی میں اگر اس کے لئے کوئی چیز شگفتگی اور شادابی کا باعث تھی تو وہ ناہید کی مسکراہٹیں اور زبیدی کے محبت آمیز اور سپاس گزاریوں سے لبریز خطوط تھے۔ چنانچہ جب وہ رات کو تھک کر لیٹتی اور بچّی کو کھینچ کر چھاتی سے لگا لیتی تو اس کے اُفقِ ذہن پر مستقبل کی زندگی کے درخشندہ و تابناک ستارے چمکنے لگ جاتے۔ وہ زبیدی کی واپسی کے دن گنتی۔ پھر تصوّر ہی تصوّر میں اس قسم کے نقشے اس کے سامنے آجاتے کہ اس کے آنے کے بعد ان کا گھر کس قدر جنّت نگاہ اور فردوسِ گوش بن جائے گا۔ وہ ہوگی، زبیدی ہوگا، ناہید ہوگی اور دنیا بھر کی خوشیاں اور شادمانیاں ان پر نچھاور ہوتی چلی جائیں گی۔ وہ مسرّتوں کے جھولے جھولے گی اور تبسّموں کے گیت گائے گی۔ ان تصوّرات سے اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو ڈبڈبا آتے جنہیں وہ اسطرح آنکھوں کی ڈبیا میں بند کرکے سوجاتی جیسے صدف، قطراتِ نیساں کو اپنے آغوش میں لے کر دریا کی پُرسکوت پہنائیوں میں محوِ خواب ہو جاتی ہے۔

صابرہ اسی طرح "شاہزادے" کے جسم سے جادو کی سوئیاں نکالنے میں مصروف رہی تا آنکہ سوئیاں گنتی کی باقی رہ گئیں۔ جوں جوں یہ سوئیاں کم ہوتی جاتی تھیں، صابرہ کے زرد اور افسردہ چہرے پر سُرخی کی لہریں دوڑتی چلی آتی تھیں۔ اب زبیدی کی واپسی میں چند مہینے باقی تھے۔ لیکن صابرہ نے محسوس کیا کہ اس کی بیتابئ تمنا تو بڑھ رہی ہے۔ لیکن زبیدی کے خطوط میں کسی چیز کی کمی آتی جا رہی تھی وہ کچھ مشینی قسم کے ہوتے جا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ان کی رفتار میں سستی واقع ہو رہی ہے۔ پہلے ایک سلسلہ بندھا رہتا تھا اور صابرہ کو اپنے ہر خط میں تاخیرِ جواب کی معذرت کرنی پڑتی تھی۔ اب یہ ہوا کہ اُلٹا صابرہ کو اپنے خطوں کے جواب نہ ملنے کی شکایت کرنی پڑتی۔ سوئیاں کم ہوتی جا رہی تھیں، لیکن صابرہ کے دل کی دھڑکن بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ تبدیلی کیا ہو رہی ہے۔ کبھی اس کے دل میں عجیب و غریب قسم کے خیالات گزرنے لگ جاتے لیکن

وہ خود ہی ان خیالات کو توہمات قرار دے کر جھٹک دیتی۔ وہ زیدی سے پوچھتی کہ اس کی واپسی کی تاریخ کون سی ہوگی، لیکن وہ یونہی ٹال مٹول کر دیتا۔ چنانچہ اسی میں اندازہ کہ وہ تاریخ بھی گذر گئی اور زیدی نہ آیا۔ اب صابرہ کو چپ سی لگ گئی۔ کئی ہفتے اسی میں گذر گئے۔ زیدی کی طرف سے خط آئے بھی کتنے ہی دن ہو گئے۔ ایک دن صابرہ اسی فکر میں خاموش بیٹھی تھی کہ ڈاک والے نے آواز دی۔ صابرہ لپک کر دروازہ پر پہنچی۔ ڈاکیے سے خط لیا۔ خط ولایتی ڈاک کا تھا۔ اسے جلدی سے کھولا تو دیکھتی ہے کہ لفافہ کے اندر ایک اخبار کا تراشہ ہے جس پر

زیدی کی نئی شادی

ایک تصویر چھپی ہوئی ہے۔ تصویر میں زیدی ہے اور اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی اور تصویر کے نیچے لکھا ہے "یہ جوڑا اپنے جشن عروسی کے لئے سوئٹزر لینڈ جا رہا ہے۔"

صابرہ لڑکھڑا کر گر پڑی۔ جب اس نے آنکھ کھولی تو وہ ایک ہسپتال میں تھی۔ ڈاکٹر کے اشارے پر نرس نے جلدی سے نابید کو آگے بڑھایا۔ صابرہ نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں کہا کہ میری بچی! مجھے ابھی تمہارے لئے زندہ رہنا ہے۔ یہ کہہ کر اسے پھر غش آ گیا۔

کچھ دن کے بعد سخت جان صابرہ گھر آ گئی۔ اس دوران میں اس نے زیدی کو کچھ نہ لکھا۔ نہ ہی اس کی طرف سے کوئی خط آیا۔ البتہ صابرہ کے بوڑھے باپ نے زیدی کو خط لکھا جس کے جواب میں اس نے لکھا کہ میں نہیں سمجھتا کہ میں نے کیا جرم کیا ہے جو آپ لوگ اس طرح مجھ پر برس پڑے ہیں۔ جب شریعت اس کی اجازت دیتی ہے تو آپ اس پر بگڑنے والے کون ہیں؟ مجھے صابرہ کا آپ سے بھی زیادہ خیال ہے۔ اس کی اور اس کی بچی کی پرورش کا میں شرعاً اور اخلاقاً ذمہ دار ہوں۔ میں کمینہ نہیں جو اپنی ذمہ داریوں سے آنکھ چراؤں گا۔ میں ایک شریف انسان ہوں اور شریفوں کی طرح ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ صابرہ جہاں رہنا چاہیے خوشی سے رہ سکتی ہے۔ مجھے اس کی خوشی سے خوشی ہے۔ میں اس کے لئے (MAINTENANCE) نان و نفقہ دیتا جاؤں گا۔ اور اگر وہ اس زندگی سے خوش نہیں اور اپنے لئے کوئی اور راستہ اختیار کرنا چاہتی ہے تو میں اس کی راہ میں مزاحم نہیں ہوں گا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ مجھے اس کی خوشی سے خوشی ہے۔

صابرہ کے باپ نے اس خط کا جواب لکھا تو اس کے بعد زیدی کے خط میں صابرہ کے لئے طلاق نامہ موجود تھا۔

طاہرہ بیٹی! ہمت سے سنو! آنسو پونچھو اور پورا خط پڑھو۔ میری طرف دیکھو کہ میں کس طرح چھاتی پہ پتھر رکھ

تمہیں یہ داستانیں سنانے پہ آمادہ ہو جاتا ہوں یا تو تم ان باتوں کو چھیڑا نہ کرو اور جب چھیڑتی ہو تو جی کڑا کر کے پوری بات سن لیا کرو۔

اب جناب صلاح الدین احمد زیدی، بارایٹ لا، نہایت طمطراق کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ رہنے کو پیلس ہے، سواری کو موٹریں ہیں، نوکر چاکر ہیں۔ میم صاحبہ کے لئے الگ خادم اور نرسیں ہیں۔ بچوں کے لئے آیا ہیں۔ ماڈرن سوسائٹی میں ان کا مقام بہت اونچا ہے۔ کیونکہ میاں بیوی دونوں بڑے سوشل واقع ہوئے ہیں۔ کلبوں میں ان کے چرچے ہیں، اخباروں میں ان کے تذکرے ہیں۔ اب ان کے دماغ میں لیڈری کا خناس بھی سما رہا ہے اور چونکہ مذہب کے راستے لیڈری آسانی سے آجاتی ہے اس لئے اب زیدی صاحب نیر سے قوم کو "سچے اور پکے مسلمان" بننے کی تلقین فرماتے رہتے ہیں۔ اسلام پہ دھواں دھار تقریریں بھی ہوتی ہیں۔ بڑے بڑے آرٹیکل بھی لکھے جاتے ہیں۔ جن میں اسلامی زندگی کے "صحیح خدوخال" پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اب وہ لیڈر بنا ہی چاہتے ہیں اور لیڈری کے بعد منسٹری تو تم جانو، دو ہی قدم رہ جاتی ہے۔

صابرہ کی حالت

یہ ادھر ہو رہا ہے اور ادھر صابرہ غریب باپ کے گھر زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔ اسے کسی نے آج تک اس موضوع پہ ایک لفظ بھی کہتے نہیں سنا۔ البتہ کہتے ہیں کہ جب کسی رات ناہید کہانی کے لئے تنگ کرتی ہے تو وہ اسے سوئیوں والے شاہزادے کی کہانی سنا دیتی ہے۔ جس پہ ناہید تو سو جاتی ہے اور وہ رات بھر پاگلوں کی سی ہنسی ہنستی رہتی ہے۔ کبھی کبھی "شریعت" "اخلاق" "شرافت" "ذمہ داری" کے الفاظ خود بخود اس کی زبان پہ آجاتے ہیں جن پر وہ اس زور سے قہقہہ لگاتی ہے کہ بعض اوقات گھر کے لوگ جاگ اٹھتے ہیں۔ بوڑھا باپ آتا ہے اور صرف اتنا کہتا ہے کہ صابرہ بیٹی! ہوش میں آؤ۔ تم نے تو کہا تھا کہ میں ناہید کی خاطر زندہ رہوں گی۔ اس پہ صابرہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ وہ آنسو جنہیں پونچھنے کے لئے دامن مریم آگے بڑھتا ہے ———— اور صابرہ سو جاتی ہے۔

مجرم کون ہے؟

میں تم سے متفق ہوں طاہرہ! کہ اس میں تنہا زیدی ہی مجرم نہیں، بلکہ اس سے بڑھ کر مجرم ہے ہمارا معاشرہ، جو اس قدر انسانیت کش

سنگین مجرموں کو نہ صرف سوسائٹی میں جگہ دیتا ہے بلکہ عزت کے مقام پر بٹھاتا ہے۔ حالانکہ یہ لوگ ایسے ہیں کہ شریف انسان کو انہیں اپنے پاس تک پھٹکنے نہیں دینا چاہئے۔ انسانیت کی سطح تو خیر بہت اونچی ہے، اگر عام معاملاتی دنیا کے نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہے کہ جو شخص اپنی ہوسناکیوں کی خاطر صابرہ جیسی بیوی کے ساتھ اس قسم کی غداری کر سکتا ہے اس پر کس معاملہ میں بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس میں قصور ہمارے معاشرے کا ہے۔ اگر ہمارا معاشرہ صحیح نگاہ رکھتا ہو تو اس قسم کے انسان نما درندوں کا ایک دن میں علاج ہو جائے۔

لیکن طاہرہ! میں تمہاری توجہ دوسری طرف بھی مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ زبیدی اور معاشرہ کو چھوڑو، اس عورت کے متعلق تم کیا کہو گی؟ جو دیدہ دانستہ ایک بھرے گھر کو اس طرح اجاڑنے کا موجب بن گئی؟ اسے تمام حالات کا علم تھا لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی ایک "ہم جنس" پر ایسا ظلم کیا! اگر اسے اس کا ذرا سا بھی خیال ہوتا تو زبیدی اس انسانیت سوز جرم کا مرتکب کبھی نہ ہو سکتا! لیکن جہاں ہمارے معاشرے کے مرد زبیدی کو سر آنکھوں پر اٹھائے پھر رہے ہیں، وہاں ہماری سوسائٹی کی عورتیں بھی، جن کی مظلومیت پر تم اس طرح اشکبار رہتی ہو مسز زبیدی کو نیاز کے دانے کی طرح لئے لئے پھرتی ہیں۔ کہو! ان کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔

سو بیٹی! یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ کیا مرد کیا عورتیں، سب ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ شکر کرو سلیم میاں خیریت سے واپس آ گئے۔ ورنہ اگر وہ بھی اگر کہہ دیتے کہ "شریعت حقّہ" اس کی اجازت دیتی ہے تو تم کیا کر لیتیں اور میں ان کا کیا بگاڑ لیتا؟ اور یہ خطرہ ولایت جانے والوں تک ہی محدود نہیں۔ یہاں بھی ہر روز یہی کچھ ہوتا رہتا ہے۔ وہ کون سا محلّہ ہے جس میں بستے گھر اجڑتے دکھائی نہیں دیتے اور وہ کون سی گلی ہے جس میں صابرہ کی سی ہچکیاں سنائی نہیں دیتیں۔ خواہ وہ ہچکیاں ان کی ہوں جنہیں اسطرح طلاق دے کر الگ کر دیا گیا ہو اور خواہ ان کی جو بعد میں آنے والیوں کے ساتھ رہنے پر مجبور ہو چکی ہیں۔ اس لئے بیٹی! میں تو تمہارے لئے (اور تمہارے ساتھ تمہارے جیسی اور بیٹیوں کے لئے) دعائیں مانگتا رہتا ہوں کہ تمہارے سہاگ قائم رہیں۔ تم دودھوں نہاؤ، پوتوں کھلاؤ، مسرتوں کے جھولے جھولو، اور تمہارے ہرے بھرے گھر ہر نظر بد سے محفوظ رہیں۔ میں دعاؤں سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہوں اگرچہ جانتا ہوں کہ اس

دستم کے بگڑے ہوئے معاشرہ کا علاج خالی دعاؤں سے نہیں ہوا کرتا۔ اس کا علاج صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ اس کی تشکیل بالکل نئے سرے سے قرآنی خطوط پر کی جائے۔

اچھا خدا حافظ

پرویز

اپریل ۱۹۵۴ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

طاہرہ کے نام پانچواں خط

(ان جوڑ شادیاں)

ہاں بیٹی! مودّۃ کے معنی تم نے درست سمجھے ہیں۔ جاہلیت عرب میں یہ رواج تھا کہ لوگ اپنی لڑکیوں کو اپنے ہاتھوں زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ قرآن کریم ہر قسم کی سبعیت و بربریت اور ہر نہج کا جور و استبداد مٹانے کے لئے آیا تھا۔ اس لئے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اس قسم کے وحشیانہ رواج کو باقی رہنے دیتا۔

دختر کشی کی رسم

چنانچہ اس نے اسے مٹا دیا اور چند ہی سال میں یہ بہیمانہ رسم، کہ جس کے تصور سے انسانی روح کانپ اٹھتی ہے۔ صحیفۂ کائنات سے حرفِ غلط کی طرح نابود ہو گئی۔ قرآن کریم نے اپنے مخصوص دل کش اسلوب اور معجزانہ انداز سے اس کا ذکر کیا ہے کہ جب وہ معصوم بچی اپنے قاتل باپ کا دامن پکڑے خدا کے حضور استغاثہ پیش کرے گی تو مجرم سے کہا جائے گا (بِاَیِّ ذَنۡۢبٍ قُتِلَتۡ) بالآخر کس جرم کی پاداش میں اس بے کس و بے بس ننھی سی جان پر یہ ظلم ڈھایا گیا تھا۔ اس کا کیا جواب بن پڑے گا؟ ظاہر ہے!

مسلمان خوش ہیں کہ اللہ کی رحمتِ عامہ نے اس لرزہ خیز اور وحشت انگیز رسم کا سدِ باب کیا۔ اور بات ہے بھی فخر و مسرت کی۔ لیکن طاہرہ! ذرا نگاہِ تعمق سے دیکھو گی تو تمہیں نظر آئے گا کہ وحشت و درندگی کی یہ انسانیت سوز رسم آج بھی دنیا میں موجود ہے۔ تم شاید حیران ہو گی کہ آج اس دورِ تہذیب و تمدن، اس عہدِ علم و دانش میں وہ کون سی سرزمینِ بے آئین ایسی ہے جہاں اپنے ہاتھوں لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینے کی رسم جاری ہے۔ لیکن تمہاری حیرت کی انتہا نہیں رہے گی جب تمہیں یہ بتایا جائے گا کہ یہ جگہ پاش رسم آج خود ہمارے ملک میں، ہماری قوم میں، اور ہمارے گھروں میں رائج ہے۔ لیکن ہم ہیں کہ اپنی آنکھوں سے اس قسم کے خونِ ناحق کو دیکھتے ہیں اور محسوس تک نہیں کرتے۔ ہم قرآن کے ان مقامات سے یہ کہہ کر گذر جاتے ہیں کہ یہ عرب کے ایام

یہ رسم آج بھی موجود ہے

جاہلیت کی ایک بھیانک رسم کا تذکرہ ہے۔ ہم اس سے متعلق نہیں۔ طاہرہ! تم جانتی ہو کہ قرآن نے ہر قتلِ ناحق کو سنگین ترین جرم قرار دیا ہے۔ لیکن اس قسم کے قتل (یعنی لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینے) کو سب سے زیادہ وحشتناک اس لئے کہا ہے کہ اس میں ایک کمزور، ناتوان بچی کی کسمپرسی، بے زبانی، اور قوتِ مدافعت سے محرومی کا ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ اب ذرا اپنے گردوپیش نظر دوڑاؤ اور دیکھو کہ اس قسم کے کتنے خون ہر روز تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں اور لطف یہ کہ قاتل اپنی خون آلود آستینوں کو سینہ تان کر لئے پھرتا ہے اور تمہارے آئین و ضوابط کا کوئی ہاتھ اس کی کلائی تک نہیں پہنچ پاتا۔

طاہرہ! میں اس طلسم پیچ وتاب کا خوب اندازہ کر رہا ہوں جس میں ان سطور کے مطالعہ سے تمہارا دل اُلجھ رہا ہے اور تمہاری وہ نگہِ تجسس بھی میرے سامنے ہے جو اس قسم کے خونِ ناحق کے دھبّوں کی تلاش میں ہر طرف پریشان پھر کر ناکام ونامراد اپنے نشیمن میں واپس آرہی ہے۔ لیکن میں حیران ہوں کہ تمہاری نگاہ اتنے اتنے دور دراز گوشوں تک تو پہنچ رہی ہے لیکن اس چھوٹی سی بچی زبیدہ کی طرف نہیں اٹھتی جو اپنی ماں کی آغوشِ محبت سے محروم ہو کر اپنی نانی کے دامنِ عاطفت میں پرورش پا رہی ہے۔ تم نے غالباً اس بیچاری کی مرحوم ماں کو نہیں دیکھا، نہ ہی شاید یہ سنا ہوگا کہ اس کی موت کیسے واقع ہوئی؟

رشید کی آوارگی

حتیٰ کہ تمہیں شاید یہ بھی معلوم نہ ہوگا کہ یہ بچی اس رشید کی بیٹی ہے جو اگلے دنوں قمار بازی کے اڈے سے گرفتار ہو کر حوالۂ قید وبند کیا گیا ہے۔ رشید کی یہ آوارگی کوئی نئی چیز نہیں۔ یہ بچپن ہی سے ایسا تھا۔ ابھی خوردسال تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ جس قوم کی اجتماعی زندگی برباد ہو چکی ہو، اس کے یتیم بچوں سے اکثر یہی ہوتا ہے کہ وہ یا تو بھوکوں مرجاتے ہیں اور اگر گھر میں پرورش کا سامان میسّر ہو تو چونکہ کسی کا دستِ تادیب وتہدید سر پہ نہیں ہوتا، اس لئے بالعموم آوارہ اوراوباش ہوجاتے ہیں۔ (یتیمی کی حالت میں زندگی بسر کرکے اخلاق کا اعلیٰ نمونہ پیش کرنا فی الواقعہ بہت بڑی سعادت ہے) رشید بچپن میں ماں کا لاڈلا رہا۔ بڑا ہوا تو بُری صحبت میں پڑ گیا۔ اس کی آوارہ مزاجی کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ کبھی کبھار بڑے بوڑھے سمجھاتے بجھاتے بھی، لیکن باپ کا سا درد کسے کہ پیچھے سے گالیاں کھا رہا ہے لیکن اس کی خیراندیشی کی فکر نہیں چھوڑتا۔ ماں ہزار کڑھتی، لیکن اس کی سنتا کون؟

شاکرہ کی ماں

رشید آوارہ تھا، ناکارہ تھا، کوئی اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ لیکن نہ معلوم شاکرہ کی ماں کے سر میں کیا سودا سمایا تھا کہ وہ شاکرہ کی زندگی رشید کے سپرد کر دینے پر تُلی بیٹھی تھی۔ اس کے گھر والے مخالف، عزیز رشتہ دار مخالف، ہمسائے اور اہلِ محلہ مخالف، غرضیکہ جو بھی سنتا مخالفت کرتا لیکن اس نے کچھ ایسا کانوں میں تیل ڈال رکھا تھا کہ کسی کی سنتی ہی نہ تھی۔ اور تو اور خود رشید اس رشتہ کا مخالف تھا۔ لیکن اگر راضی تھی تو شاکرہ کی ماں یا رشید کی۔ شاکرہ کی ماں سے جب بھی کوئی پوچھتا تو صاف کہہ دیتی کہ میں نے تو شاکرہ اس وقت سے اپنی بہن کو دے رکھی ہے جب یہ ابھی دودھ پیتی تھی۔ اسلئے اب یا تو اس کی ڈولی بہن کے گھر بھیجوں گی، یا اس دہلیز سے اس کا جنازہ نکلے گا۔

شاکرہ ایک متین، سنجیدہ، خاموش، سمجھدار لڑکی تھی اور انتہائی بدبختی کہ پہلو میں ایک حساس دل رکھتی تھی۔ یوں تو ہماری موجودہ معاشرتی پابندیوں کے خیال سے بھی کسی لڑکی کا اپنے رشتہ کے متعلق ایک لفظ تک زبان پر لانا گناہِ عظیم سمجھا جاتا ہے جس کا کفارہ ہی نہیں۔ اس پر شاکرہ کی خاموشی پسند طبیعت۔ بایں ہمہ ہمجولیوں، سہیلیوں کی باتوں میں کبھی کبھی کنایۃً ظاہر ہو جاتا تھا کہ زندگی کا بھیانک مستقبل اس کی آنکھوں کے سامنے تھا اور اس کی ماں کی ضد اس کے نزدیک کھلا ہوا پیام موت۔ اس کی اُمید دل کا آخری سہارا یہ خیال تھا کہ رشید چونکہ خود بھی اس رشتے کے مخالف ہے اس لئے شاید وہ اس جہنم سے بچ جائے۔ لیکن اِدھر رشید کی ماں کی ضد کہ بیٹا! اگر اس معاملے میں میری مرضی کے خلاف چلے تو یاد رکھو زہر کھا کر مر جاؤں گی۔

شادی

میں اپنی بہن کو قول دے چکی ہوں۔ اب اس سے پیچھے نہیں ہٹ سکتی۔ نتیجہ یہ کہ دن مقرر ہو گئے۔ بارات آگئی۔ تمام رسومات ادا ہو گئیں۔ آخر میں رخصتی سے ذرا پہلے ایک اور رسم کا بھی خیال آگیا۔ نکاح خواں کو معلوم، گواہوں کو معلوم، خود دولہا کو معلوم کہ کس طرح ان دونوں کی مرضی کے خلاف یہ جوڑ جوڑا گیا ہے۔ لیکن دولہا کی ماں کی ناراضگی کا خیال، دلہن کی معاشرتی بدنامی کا ڈر، گواہوں کو اپنی "چودھریت" کا پاس، مولوی صاحب کو سوا روپیہ کا لالچ۔ ان تمام "مقتضیات شرعیہ" کے یکجا جمع ہونے کے بعد "منشائے خداوندی" کی تکمیل اور "سنّتِ پیغمبر ﷺ" کی تقلید میں اور کس چیز کی کمی رہ سکتی تھی" ایجاب و قبول ہوا۔ خطبۂ مسنونہ پڑھا گیا۔ لمبی لمبی دعائیں مانگی گئیں۔ شادیانے بجے، مبارکبادیاں ملیں۔ دلہن گھر میں آئی۔ گھر کی رونق بڑھی۔ طاہرہ! ذرا غور کرو کہ وہ رشتۂ مناکحت جسے قرآن کریم نے عہدِ استوار (میثاق غلیظا) کہا ہے۔ جسے ایک محکم معاہدہ قرار دیا ہے، جس کے لئے یہ شرط عاید کی گئی ہے کہ فریقین برضا و رغبت پورے عقل و شعور کے

ساتھ معاملہ کے ہر پہلو پر کامل غور و خوض کے بعد، اپنے مستقبل کے متعلق کسی فیصلہ پر پہنچیں، اس عہد و معاہدہ کو اس طرح سے استوار کرنا اگر شریعت حقہ سے کھلا مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟ لیکن ہمارے ہاں تو نکاح سے اب مفہوم صرف اشارہ گیا ہے کہ رسماً و تبرکاً وہ چند الفاظ دہرا دیئے جائیں جو نکاح خواں نے ایسی تقریب کے لئے یاد کر لئے ہیں۔ حالانکہ ان الفاظ کی روح بھی اگر سامنے ہو تو ازدواجی زندگی کی ہزاروں پوشیدہ جنتیں بے نقاب ہو جائیں۔ (اور ایک نکاح ہی پر کیا موقوف ہے ہمارے ہاں تو تمام کا تمام دین ہی ایک رسم بن کر رہ گیا ہے جس میں زندگی کی رمق تک باقی نہیں رہی۔)

بہرحال شاکرہ اس طرح اپنے سسرال میں آئی۔ دن گذرتے گئے۔ یوں تو کوئی خاص واقعہ رونما نہ ہوا۔ لیکن ایک غائر نگاہ سے دیکھنے والا محسوس کرتا تھا کہ شاکرہ کے چہرے سے شگفتگی و بشاشت آہستہ آہستہ ایک شاخ خزاں دیدہ کے زرد پتے میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ ہر چند وہ اپنی سلیقہ شعاری، فطری ایثار اور جذبۂ خدمت گذاری سے رشید کو اس کی بدعنوانیوں سے روکنے کی کوشش کرتی لیکن اس کا مرض ان تمام تدابیر کی حد سے آگے بڑھ چکا تھا۔ رشید کی طرف سے بے رخی اور بے اعتنائی تو پہلے دن سے تھی رفتہ رفتہ یہ کشیدگی نفرت اور نفرت دشمنی میں تبدیل ہو گئی۔ گھر میں ساس کا دم شاکرہ کی تسلی کا باعث تھا۔ لیکن چونکہ مصیبتیں تنہا نہیں آیا کرتیں، ایک برس بھی گذرنے نہ پایا تھا کہ وہ بھی چل بسی۔ اب جس قدر شاکرہ بے بس تھی، رشید اسی قدر زیادہ آزاد، رفتہ رفتہ گھر کی آمد و رفت کم ہونے لگی۔ اکثر باہر رہتا۔ گھر میں اس کے لئے اگر کوئی وجۂ کشش تھی تو وہ شاکرہ کے چار زیور تھے۔ جب ضرورت پڑتی، آتا اور چھینا جھپٹی سے کچھ نہ کچھ کھسوٹ کر لے جاتا۔ شاکرہ کا باپ سیدھا سادھا غریب آدمی تھا۔ اگرچہ شاکرہ کے لئے وہاں روٹی موجود تھی لیکن شاکرہ صحیح معنوں میں شاکرہ تھی۔ فاقوں پہ فاقے آتے، لیکن کیا مجال کہ دوسرے دروازے تک خبر ہو جائے۔ گلی کے باہر میکا تھا لیکن شاکرہ نے کبھی ظاہر نہ ہونے دیا کہ اسے کوئی تکلیف ہے۔ چپکے چپکے کچھ محنت مزدوری کرتی لیکن ایسی مزدوری بھی کون سی ہو سکتی تھی جس سے ایک مظلوم لڑکی مستقل طور پر اپنا گذارہ کر سکتی۔ دن رات ایک کر دیتی تو بمشکل ایک وقت کی روٹی میسر آتی۔ اللہ رکھے سارا محلہ اپنا تھا۔ سب قریبی رشتہ دار تھے۔ اس کے سامنے دوسرے گھروں میں ہزاروں نعمتیں آتیں لیکن وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی کئی دفعہ ایسا ہوا کہ دو تین وقت کے فاقے کے بعد روٹی کا انتظام ہوا کہ رشید کہیں سے دندناتا ہوا آ گیا۔ شاکرہ نے خاموشی سے روٹی اس کے سامنے رکھ دی۔ اس نے روٹی اٹھائی، گالی گلوچ سے اس کا صلہ دیا۔ دکیا عجیب کہ

مار پیٹ تک بھی اُتر آتا ہو) اور جو چیز گھر میں نظر آئی لے کر چلتا بنا۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی بتایا ہے، سارا محلہ رشتہ داروں کا تھا لیکن طاہرہ! انفرادی زندگی کی سب سے بڑی لعنت تو یہی ہے کہ مصیبت تنہا اسی کی مصیبت سمجھی جاتی ہے جس کے سر پر آپڑے۔ شاکرہ کا باپ جیسا کہ تم نے دیکھا ہی ہے ایک سیدھا سادھا غریب آدمی تھا۔ اس کے پاس شرافت کا آخری حربہ یہی تھا کہ وہ رشید کی منت سماجت کرتا۔ مقدور بھر اس کی خدمت کرتا، لیکن ایثار و قربانی کا اثر تو وہیں ہوتا ہے جہاں انسانیت کی کوئی حس باقی ہو۔ رشید ان بیچاروں سے یہ سب کچھ اپنا حق سمجھ کر وصول کرتا۔ اور اُلٹا ان کے سر پر احسان دھرتا۔ یہ سب کچھ تھا لیکن شاکرہ کی زبان پر حرف شکایت نہ آیا۔ آتش خاموش نے اندر ہی اندر اس کی ہڈیوں تک کو خاکستر کر دیا۔ لیکن کیا مجال جو اس نے اس کا دھؤاں بھی اُبھرنے دیا ہو۔ رات کی تنہائیوں میں رو لیتی۔ لیکن کسی کے سامنے آنکھوں کو نمناک تک نہ ہونے دیتی۔ اس کی اس حالت کا علم اس وقت ہؤا جب تنہائیوں کے اس مسلسل رونے نے آشوب چشم کی صورت اختیار کر لی۔ دو ماہ تک بیچاری کی آنکھیں دکھتی رہیں۔ آرام ہؤا تو دیکھا کہ بینائی بے حد کمزور ہو چکی ہے۔ اب یہ اس مزدوری سے بھی معذور ہو گئی جس سے گزر اوقات ہو جاتی تھی۔ گھر میں جو کچھ تھا رفتہ رفتہ رشید کی آوارگی کی نذر ہو گیا۔ اب شاکرہ کا روگ چھپائے نہیں چھپ سکتا تھا۔ سُوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی۔ سہیلیاں ہمجولیں اسے سمجھاتیں کہ غم نہیں کھانا چاہیئے۔ ایسے فکر سے کیا بنتا ہے۔ وہ ان کی سنتی اور ایک ہلکے سے تبسم سے جو آنکھوں ہی آنکھوں میں سمجھنے والے کو سب کچھ کہہ دیتا، سُن کر چُپ ہو جاتی۔ شاکرہ کی حالت روز بروز خراب ہوتی چلی گئی۔ لیکن رشید کی جانے بلا کہ ایک قیمتی جان کس طرح تلف ہو رہی ہے۔ پتہ نہیں اس بیچاری کو کب سے تپ آ رہا تھا لیکن اس نے کسی سے ذکر ہی نہ کیا۔ جب وہ دن رات مسلسل رہنے لگا تو معلوم ہؤا کہ تپ کہنہ ہے۔ جاڑے کا موسم تھا۔ سخت سردی کے دن۔ ایک شام کسی نے ذکر کیا تھا کہ تھانے والے رشید کو کسی آوارگی کے سلسلے

آخری دھچکا

میں گرفتار کر کے لے گئے ہیں اور دس روپے کی عدم ادائیگی میں حوالات میں دے رکھا ہے۔ شاکرہ کی زندگی کا سہارا ایک گرم چادر تھی جسے وہ اوڑھے بیٹھی تھی۔ چپکے سے اُٹھی اور چادر ایک پڑوسن کے پاس بھیج دی۔ چادر اگرچہ قیمتی تھی لیکن اسے بمشکل دس رُپے مل سکے۔ روپے لے کر رشید کے چچا کو دیئے کہ جرمانہ ادا کر دیں۔ اب اس کے پاس سردی سے بچنے کے لئے کپڑا بھی نہ رہا۔ تپ مزمن ہو گیا۔ زندگی چراغِ سحری نظر آنے لگی۔ اس کی ماں اب بمشکل اسے اپنے ہاں لے آئی۔ جو کچھ بن پڑا علاج

معالجہ کیا لیکن　ے

ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کرے

شاکرہ کو اب پہلے سے بھی زیادہ چپ لگ گئی۔ گھر والوں کو دوا، دعا کے لئے دوڑ دھوپ کرتے دیکھتی تو کسی سہیلی سے کہہ دیتی کہ انہیں سمجھاؤ کہ

قصۂ غم نہ بڑھاؤ مجھے مر جانے دو

رشید شاکرہ کی بیماری میں کبھی بھولے سے بھی اِدھر نہ آیا۔ ایک دن نہ معلوم جی میں کیا آیا کہ چلا آیا اور شاکرہ کے سرہانے آکر بیٹھ گیا۔ اس نے پلک اٹھائی رشید کو دیکھا، پھر وہی غیر محسوس سا تبسم، اسکی

اور سکوت

آنکھوں میں دکھائی دیا جو ہر نئی مصیبت کے وقت اس کے دل کی گہرائیوں کی غمازی کیا کرتا تھا اور جو درحقیقت ہماری معاشرت کے خانہ ساز آئین وضوابط پر ایک بے پناہ تنقیدی نشتر تھا۔ قلب کا آبگینہ پگھل کر ایک شفاف آنسو کی شکل میں سرِ مژگاں چمکا۔ آنکھیں بند ہوگئیں، ایک ہچکی آئی جس کے جھٹکے نے سازِ حیات کی آخری تاریں توڑ کر رکھ دیں اور شاکرہ۔ آہ! غم وحرماں کی داستانِ خموش شاکرہ۔ ہمیشہ کے لئے چپ ہوگئی۔

طاہرہ بیٹی! سوچو تو سہی کہ کیا یہ اس موءدہ سے کم انسانیت سوز اور دل گداز واقعات ہیں اور غور کرو کہ ایسی کتنی معصوم زندگیاں ہیں جو اس طرح گھل گھل کر تلف ہو رہی ہیں اور تمہاری سوسائٹی کو اس کا احساس تک بھی نہیں ہوتا۔ طاہرہ! تم کہہ دوگی کہ اس قسم کے مظالم سے نجات حاصل کرنے کے لئے اصلاحی قدم اُٹھ رہے ہیں۔ چنانچہ سال گزشتہ جس قانونِ خلع کا نفاذ ہؤا ہے وہ اسی قسم کے مشکلات کا علاج ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کی اصلاحی تجاویز نیک ارادوں کی حامل ہوتی ہیں لیکن ہوتا اکثر و بیشتر یہی ہے کہ ایسی اصلاحات حقیقی ستم رسیدہ واقعات (GENUINE CASES) میں جائز فائدہ اُٹھانے کی بجائے فریب کار لوگوں کے لئے ناجائز فائدہ اُٹھانے کا ذریعہ بن جاتی ہیں اور یہ اس لئے کہ ہمارے اصلاحی اقدامات علتِ مرض کے بجائے علاماتِ مرض کا علاج سوچتے ہیں۔ جس مریض کا تمام خون خراب ہو چکا ہو اس کے پھوڑے پھنسیوں پر مرہم لگانے سے

اصلاح کی صورت

کیا فائدہ ہوگا۔ ایک پھنسی دب جائے گی تو دوسری جگہ دو اور نکل آئیں گی۔ حقیقی علاج تو اس کے خون کی صفائی ہے۔ آج ہماری معاشرتی زندگی کا پورے کا پورا

ڈھانچہ بگڑ چکا ہے۔ اس لئے اس کا اصلی علاج اس کی تشکیلِ جدید ہے، از سرِ نو تعمیر ہے۔ ایسی تعمیر جس کی بنیادیں قوانین کے الفاظ پر نہیں بلکہ قلوب کی گہرائیوں پر ہوں گی کہ جب تک قلوب و اذہان میں تبدیلی نہیں ہوتی نظامِ زندگی کا کوئی شعبہ درست نہیں ہو سکتا اور قلوب کی تبدیلی ماحول اور فضا کی تبدیلی پر منحصر ہے اور یہ تبدیلی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ انسانی دماغ کے تراشیدہ نظامِ زندگی کے بجائے قوانینِ الٰہیہ کا متعیّن فرمودہ نظامِ حیات دنیا میں رائج نہیں ہو جائے گا۔ وَفِيهَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ

مارچ سنہ ۱۹۴۰ء والسلام

پرویزؔ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

طاہرہ کے نام چھٹا خط

(جہیز کے مطالبات)

اس دفعہ عزیزہ! تمہارا خط بہت دیر میں ملا، لیکن سلیم میاں کے خط سے تمہاری خیریت معلوم ہو گئی تھی۔ میں نے دیکھا یہ ہے کہ عمر کے متعلق تمہارے اندازے عام طور پر غلط ہوتے ہیں۔ شفقت کی عمر کم از کم بھی ہو گی تو ستائیس اٹھائیس سال کی ہو گی۔ اس نے تمہیں گود میں کھلایا ہے۔ اگرچہ اس وقت وہ بھی کچھ زیادہ عمر کی نہیں تھی لیکن اگر اس وقت اس کی عمر چھ سات سال کی بھی تھی تو بھی وہ اب ستائیس اٹھائیس برس سے کم کی نہیں ہے۔ اس لئے کہ تم پچھلی شبِ برات میں اللہ رکھے اکیس برس کی ہو چکی ہو۔ میں جانتا ہوں کہ شفقت بڑی سلیقہ شعار لڑکی ہے۔ گھر کا سارا کام کاج اس کے سپرد ہے۔ بڑی سمجھدار ہے، پڑھی لکھی ہے۔ خوش گل بھی ہے۔ ہمارے ہاں کے شریف گھرانوں کی بچیوں کی خوبصورتی صحت اور حیا سے ترکیب پاتی ہے۔ اس کی تندرستی بھی اچھی ہے اور حیا کا تو پوچھنا ہی کیا۔ میں نے آج تک کبھی اس کا ماتھا تک کھلا نہیں دیکھا۔ بات کرتی ہے تو نگاہیں زمین پر گڑی ہوئیں۔ اور تو اور کبھی میرے سامنے سے بھی گزرنا پڑ جائے تو اس طرح سمٹی سمٹائی ہوئی چلتی ہے کہ بس چلے تو زمین میں دھنس جائے حالانکہ وہ میرے ہاتھوں میں اپنی بیٹیوں کی طرح پل کر اتنی بڑی ہوئی ہے۔ تمہاری حیرت بالکل بجا ہے کہ اتنی خوبیوں کے باوجود اس کے لئے آج تک رشتہ کیوں نہیں مل سکا۔ یہ محض تمہاری بدگمانی ہے کہ اس کے باپ کی نگاہ میں کوئی لڑکا جچتا ہی نہیں یا اس کی ماں بہت اونچا گھرانا چاہتی ہے۔ بات اس کے بالکل برعکس ہے۔ اگلے دنوں بھائی چراغ علی بچارا خون کے آنسو رو کر اپنا دکھڑا

بر نہیں ملتا

سناتا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ موزوں رشتے ملتے ہیں۔ عورتیں لڑکی کو دیکھنے کے لئے بھی آتی ہیں اور بہت پسند کرتی ہیں۔ لیکن اس کے بعد یہ پوچھا جاتا ہے

کہ لڑکی کو جہیز میں کیا دیا جائیگا۔ اس نے کہا کہ شفقت کی ماں نے سب لڑکیوں کے لئے شریفانہ جہیز بنا رکھا ہے۔ ہمارے گھروں میں جہیز تو اس وقت سے بننا شروع ہو جاتا ہے جس دن لڑکی پیدا ہوتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ کپڑا لتا، دو چار زیور، برتن اور گھر کی ضروری چیزیں سب تیار ہو جاتی ہیں۔ شفقت کے لئے بھی یہ سب کچھ موجود ہے۔ لیکن ان چیزوں کو تو اب جہیز سمجھا ہی نہیں جاتا۔ کوئی موٹر مانگتا ہے، کوئی کوٹھی چاہتا ہے، کوئی دس ہزار روپیہ نقد چاہتا ہے۔ اس نے بتایا کہ اگلے دنوں، تیر گروں کے محلہ سے پیغام آیا۔ لڑکا میٹرک پاس ہے اور ساٹھ روپے کا ملازم۔ لیکن مطالبہ یہ ہے کہ ولایت کی تعلیم کا خرچ دو جب شادی کریں گے۔ (حالانکہ شفقت کی تعلیم بی۔ اے تک کی ہے) شفقت کا باپ یہ داستان سنا رہا تھا اور غم اور غصے سے اسکی حالت دگرگوں ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا کہ میں نے روکھی سوکھی کھائی، تنگی ترشی سے گزارہ کیا۔ لیکن ان بچیوں کو عمدہ سے عمدہ تعلیم دلائی اور ان کی اچھی سے اچھی تربیت کی۔ اب انہیں گھر سے اُٹھانے کے لئے ہزاروں روپے درکار ہیں۔ میں نے جو کچھ ان کی تعلیم پر خرچ کیا ہے اگر اسی کو الگ رکھتا جاتا تو یقیناً اتنی رقم ہو جاتی جس کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ زمانہ کی حالت یہ ہے کہ جاہل لڑکی اگر دس ہزار روپیہ ساتھ لے آئے تو قابلِ قبول ہے، لیکن اگر وہی روپیہ اس کی تعلیم و تربیت پر صرف ہو چکا ہو تو اس کی نہ کوئی قدر ہے نہ قیمت۔ اس بیچاری کو پوچھتا کوئی نہیں! اس کا جرم؟ اس کا جرم اس کے سوا اور کیا ہے، کہ اس کا باپ پہلے "بیوقوف" تھا، جس نے جہالت پر تعلیم کو ترجیح دی اور اب غریب ہے جو جہیز میں کوٹھیاں اور موٹریں نہیں دے سکتا۔ اسی لئے اس جرم کی سزا ان شریف بچیوں کو بھگتنی پڑتی ہے۔ میں نے، بھائی جی! (وہ مجھے ہمیشہ بھائی جی کہتے ہیں حالانکہ عمر میں مجھ سے بڑے ہیں۔ کیسے محبت اور اخلاص کے پتلے ہیں یہ لوگ۔ طاہرہ بیٹی! ان کے بعد تم چراغ لیکر ڈھونڈو گی تو ان کی مثال نہیں ملے گی۔ کم ہی لوگ ہوں گے جنہیں اس کا علم ہو کہ بھائی چراغ علی کے ساتھ ہمارے صرف محلہ داری کے تعلقات ہیں۔ ورنہ عام طور پر لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ میں ان کا بڑا بھائی ہوں) ہاں تو بھائی چراغ علی نے کہا کہ میں نے عصمت کو جس مشکل سے گھر سے وداع کیا ہے

جہیز کا مطالبہ

وہ میں جانتا ہوں یا میرا خدا۔ اب شفقت ہے اور اتنی ہی بڑی، اس سے نیچے دو اور بچیاں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ اس عمر میں ان تینوں بچیوں کے لئے جہیز کے مطالبات کہاں سے پورے کر دوں! میں بھائی جی! جب شام کو گھر جاتا ہوں تو اتنی اتنی بڑی عمر کی تین برابر کی بچیوں کو دیکھ کر میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے لیکن اس خیال سے کہ میری افسردگی سے یہ

معصوم بھی مرجھا جاتی ہیں، ان کے سلام کا جواب جھوٹی ہنسی سے دیتا ہوں۔ کھانا سامنے آتا ہے تو ایک ایک نوالہ زہر بن کے حلق سے نیچے اُترتا ہے۔ جب آپکی بہن پوچھتی ہے کہ کہیں کوئی سلسلہ ہؤا تو میں ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتا ہوں اور اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔ میرے پاس کوئی مکان نہیں کہ اسے بیچ دوں، کوئی جائیداد نہیں کہ اسے گروی رکھ دوں۔ اوّل تو کوئی اتنی بڑی رقم قرض پر کیوں دینے لگا اور اگر کہیں سے مل بھی جائے تو تنخواہ قسطوں میں چلی جائے گی۔ بچوں کو کھلاؤں گا کہاں سے؟

طاہرہ بیٹی! تم نے سُن لیا کہ شفقت بیچاری کو بر کیوں نہیں ملتا؟ بھائی چراغ علی اپنی یہ دُکھ بھری داستان جب بھی مجھے سناتے ہیں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ہم لوگوں پر آسمان کیوں نہیں ٹوٹ پڑتا۔ زمین کیوں نہیں پھٹ جاتی! ذرا سوچو کہ ہم میں سے ہر ایک کے ہاں لڑکیاں بھی ہیں اور لڑکے بھی (چراغ علی بچارے کے ہاں تو لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں، لڑکا کوئی نہیں۔ لیکن اور گھروں میں تو لڑکے لڑکیاں سبھی ہوتے ہیں)۔ ہماری حالت یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک، لڑکے کے رشتے کے وقت ہزاروں روپے کے جہیز کا مطالبہ کرتا ہے اور اس کا کبھی خیال نہیں کرتا کہ کل کو مجھے بھی اپنی لڑکیوں کو گھر سے اُٹھانا ہے ان کے لئے اتنا روپیہ کہاں سے لاؤں گا۔ ہم میں سے (امیر ہو یا غریب) ہر ایک کو لڑکی کے رشتے کے سلسلے میں ان پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن کوئی نہیں جو اس عالمگیر (اور خود پیدا کردہ) مصیبت کا علاج سوچے۔

تم نے کبھی اس پر غور کیا ہے طاہرہ! کہ جہیز کے یہ مطالبات کس ذہنیت کی پیداوار ہیں؟ اس ذہنیت کی جس کی رُو سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ عورت کا درجہ مرد سے بہرحال کمتر ہے، عورت مرد سے 'INFERIOR' ہوتی ہے اس لئے جب مرد کسی عورت کو اپنی بیوی بننے کا شرف عطا فرمائے تو اس سے اس اعزاز بخشی کی قیمت وصول کرے۔ اس قیمت کا نام جہیز ہے۔

غلط ذہنیت

تم گاؤں گئی تھی تو رحموں کمہار کی گائے کا سودا ہوتے دیکھا تھا نا! بیل والا، گائے کے بدلے میں بیل دینے پر رضامند نہیں تھا۔ رحموں کو گائے کے ساتھ پچاس روپے دینے پڑے تھے جب جا کر اسے بیل ملا تھا۔ لیکن ہماری لڑکیوں کی حیثیت تو گائے بھینس سے بھی کمتر ہے۔ رحموں نے گائے کے ساتھ پچاس روپے دیئے تو بیل تو مل گیا۔ لیکن یہاں لڑکی والا، اپنی لڑکی دیتا ہے، ساتھ دس ہزار روپیہ دیتا ہے اور لڑکے والا یہ سب کچھ لے کر اپنے لڑکے کو بھی ساتھ ہی لے جاتا ہے۔ گویا پچاس روپے، گائے اور بیل، سب بیل والے کی ملکیت! کہو؟ تم نے کہیں ایسا سودا بھی دیکھا ہے؟ کہیں ایسی "ناکارہ جنس" بھی نظر پڑی ہے جسے گھر سے اُٹھانے

کے لئے دس دس ہزار روپے ساتھ دینے پڑیں؟ یہ ہے، میری بیٹی! ہمارے ہاں لڑکیوں کی حیثیت! پچھلے دنوں تمہارے رزاق چچا نے مجھ سے کہا کہ بچی کے لئے ایک اچھا سا رشتہ مل رہا ہے لڑکے کا باپ زندہ نہیں اس لئے وہ خود ہی بات کرنے کو آئیگا۔ مجھے کچھ حجاب سا آتا ہے، اس سے تم بات کر لینا۔ چنانچہ لڑکا میرے ہاں آیا۔ اچھا شریف زادہ تعلیم یافتہ، سمجھدار، مجھے بھی رشتہ پسند آیا۔ جب معاملہ کی بات کی تو اس نے نہایت سادگی سے کہہ دیا کہ جہیز میں موٹر ضرور ہونا چاہئے۔ غصّہ تو مجھے بہت آیا لیکن بچی کا معاملہ تھا۔

سودابازی

پی ہی گیا اور نرمی سے پوچھا کہ میاں صاحبزادے! یہ آپ کس چیز کی قیمت طلب فرما رہے ہیں؟ لڑکی آپ جتنی تعلیم یافتہ ہے۔ جہاں تک آپ کی آمدنی کا تعلق ہے وہ ایک بڑھئی سے بھی کم ہے۔ بڑھئی کو چھ روپے روزانہ ملتے ہیں۔ یعنی ایک سو اسی روپے ماہوار اور جناب کی تنخواہ ڈیڑھ ہی سو روپے ہے۔ لڑکی ملازمت کرنا چاہے تو یقیناً آپ سے زیادہ پا سکتی ہے۔ وہ آپ کی خاطر یہ ایثار کر رہی ہے اور آپ ہیں کہ بجائے اس کے کہ اس کے شکر گزار ہوں، اُلٹے موٹر بھی مانگ رہے ہیں! ظاہر ہے کہ اس کے پاس اس کا جواب کیا ہو سکتا تھا، لاجواب تو ہو گیا۔ لیکن ہمارے ہاتھ سے رشتہ چلا گیا۔ اس نے کہیں اور سودا کر لیا۔

تأسف بالائے تأسف کہ یہ سب کچھ ان لوگوں کے ہاں ہو رہا ہے جو اپنے آپ کو خیر سے مسلمان کہتے ہیں اور مسلمان کہہ کر ساتھ ہی الحمدللہ بھی کہتے ہیں جس اسلام کی طرف ہم اپنی نسبت کرتے ہیں، میں تمہیں پچھلے خطوط میں بتا چکا ہوں کہ اس کے نزدیک زندگی کے تمام دیگر شعبوں میں تو مرد اور عورت دوش بدوش چلتے ہیں لیکن نکاح کے معاملہ میں اس نے عورت کی حیثیت مرد سے اُونچی رکھی ہے۔ اس نے مرد سے کہا ہے کہ وہ نکاح کرنا چاہتا ہے تو تنہا اپنے آپ کو عورت کے برابر نہ سمجھ لے۔ اسے اپنے ساتھ کوئی

مہر

تحفہ بھی دے تاکہ اس طرح اس کا وزن عورت کے برابر ہو سکے۔ اس پاسنگ کو جس سے مرد کے وزن کی کمی پوری ہوتی ہے، مہر کہتے ہیں۔ لہٰذا یہ مساوات یوں بنتی ہے۔

مرد + مہر = عورت

قرآن نے کہیں یہ نہیں کہا کہ نکاح کے وقت عورت اپنے ساتھ کچھ لے کر آئے۔ اس نے مرد سے کہا کہ وہ اپنی قیمت کی کمی مہر سے پوری کرے اگر اس کے پاس دینے کو کچھ نہیں تو وہ حضرت موسیٰؑ کی طرح

آٹھ دس سال تک بیوی کے باپ کا اجیر (مزدور) بن کر رہے ۲۸۔ یہ ہے قرآن کی رُو سے عورت کی حیثیت لیکن اس کے برعکس مسلمان کی اب یہ حالت ہے کہ مہر بالکل ایک رسم بن کر رہ گیا ہے کبھی محفل نکاح سے آواز آتی ہے کہ مہر سوا لاکھ روپیہ۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دینا دلانا ایک پیسہ بھی نہیں فخریہ سوا لاکھ کا اعلان کر دو۔ اور کسی محفل سے آواز آتی ہے کہ "مہر شرعی" جسکا مطلب بتیس روپے ہوتا ہے (معلوم ان سے کس نے کہہ دیا کہ شریعت نے بتیس روپے مہر مقرر کیا ہے۔ بہرحال مہر وہ پاسنگ ہے جسے مرد، عورت کے مقابلے میں اپنے وزن کی کمی کو پورا کرنے کے لئے پیش کرتا ہے۔ لیکن اب ہمارے ہاں معاملہ بالکل اُلٹ ہو گیا ہے یعنی مہر تو ایک رسم بن کر رہ گیا ہے اور عورت کو اپنے ساتھ کچھ دے کر بیوی بننا پڑتا ہے، جسے جہیز کہتے ہیں اور جو غریب آدمی اس کی استطاعت نہیں رکھتا اس کی بچیوں کے سر، ماں باپ کے گھر میں بیٹھے بیٹھے سفید ہو جاتے ہیں۔ بعض بدقماش تو اس سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں وہ جہیز وصول کرکے بیوی پر سختی شروع کر دیتے ہیں تاکہ وہ نکاح کے بعد بھی اپنے ماں باپ کے ہاں سے نچوڑ کر لاتی رہے جب تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے اسے گھر میں رکھا جاتا ہے اور جب وہ سوت خشک ہو جاتی ہے تو اسے گھر سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔ کبھی کالمعلقہ (بیچ میں لٹکائی ہوئی) اور کبھی بالکل مطلقہ۔ لڑکی بیچاری روتی دھوتی (بچوں کو لے کر) باپ کے دروازے پر آجاتی ہے اور میاں صاحب کہیں اور سودا بازی شروع کر دیتے ہیں۔ ہمارے معاشرہ میں روز یہ کچھ ہوتا ہے اور کوئی نہیں جو اس کے خلاف آواز تک بھی بلند کرے۔

ہندوانہ رسم

ہندوستان میں جہیز کی رسم ہندوؤں کے ہاں سے شروع ہوئی۔ ان کے ہاں لڑکی کو باپ کی جائیداد سے کچھ نہیں ملتا۔ اسلئے اسے کچھ بطور خیرات دے دیا جاتا ہے۔ اسے وہ دان پُن کہتے ہیں۔ یعنی وہ خیرات جس سے ثواب (پُن) ہوتا ہے۔ گئو دان کی طرح ان کے ہاں کنیا دان بھی مقرر ہے۔ ان کے ہاں عورت ساری عمر خیرات پر گزارہ کرتی ہے، نہ اسکا بیٹی کی حیثیت سے باپ کی جائیداد میں حصہ ہوتا ہے، نہ بیوی کی حیثیت سے خاوند کی، اور نہ ہی ماں کی حیثیت سے بیٹے کی جائیداد میں۔ اس لئے باپ اسے گھر سے وداع کرتے وقت کچھ "دان پُن" کر دیتا ہے۔ اس نے رفتہ رفتہ جہیز کی شکل اختیار کر لی اور وہیں سے مسلمانوں نے بھی اسے اختیار کر لیا۔ اب ہندوؤں نے تو اپنے ہاں سے اس قبیح رسم کو قانوناً مٹا دیا ہے لیکن مسلمانوں میں "بحمدللہ" یہ چیزیں ترقی پذیر ہیں اور جہیز کے مطالبات دن بدن بڑھتے چلے جا رہے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس بیچارے کے ہاں دو چار لڑکیاں پیدا ہو جاتی ہیں وہ عمر بھر کے لئے سینکڑوں من بوجھ کے نیچے

دب جاتا ہے۔ حساس لڑکیاں اپنے غریب باپ کی اس مصیبت کو آنکھوں ہی آنکھوں میں بھانپتی ہیں۔ اس سے پہلے تو ان کی اپنی نگاہ میں اپنی قیمت گرنی شروع ہو جاتی ہے اور احساس کمتری سے انہیں گوناگوں اعصابی بیماریوں کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ جب وہ زیادہ عمر کی ہو جاتی ہیں تو یا آوارگی کی زندگی اختیار کر لیتی ہیں، یا تنگ آکر خودکشی کر لیتی ہیں۔ معاشرہ دونوں صورتوں میں ان پر لعنت بھیجتا ہے اور اس پر قطعاً نہیں شرماتا کہ اس لعنت کی مستحق وہ مظلوم اور بے گناہ بچیاں نہیں، اس کا سزاوار خود یہ معاشرہ ہے جو ان معصوموں کے لئے اس قسم کے حالات پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن یہاں تو ظاہر ہو بھی یہ رہا ہے کہ

وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

پتہ نہیں ہمارے ہاں کب قرآن کا قانون غالب آئے گا اور کب مظلوموں کے سر سے یہ ہزاروں من کے پتھر اٹھیں گے! میری تو بیٹا! ساری عمر اسی کشمکش میں گزر گئی ہے۔ اسکے نتائج شاید تم دیکھ سکو۔

اس شفقت بیچاری کے لئے تم ہی کچھ سوچو۔ اس کا تم پر بھی تو حق ہے اور ویسے سمجھو تو اس ایک کا کیا، ہم پر تو ہر مظلوم کا حق ہے۔ اس لئے کہ ان کی مظلومیت کے ذمہ دار بھی تو ہم ہی ہیں۔ اس لئے بیٹی! اس بیچاری کے لئے ضرور کچھ کرنا۔

اچھا خدا حافظ   پرویز

جون ۱۹۵۴ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طاہرہ کے نام ساتواں خط

ساس ۔ بہو کی کشمکش

ہاں بیٹی! تمہاری سہیلی رشیدہ بالآخر چل بسی۔ تمہیں اس پر حیرت ہے کہ وہ اتنی سی عمر میں کس طرح گئی اور مجھے اس پر تعجب ہے کہ وہ اتنے دنوں تک جیتی کیسے رہی؟ اس کی عمر بمشکل اکیس بائیس برس کی ہو گی۔ پانچ چھ برس ہوئے جب اس کی شادی ہوئی تھی مجھے شروع ہی سے محسوس ہوتا تھا کہ کوئی غم ہے جو اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ معلوم کرنے کی بھی کوشش کی لیکن اس نے اپنے دل کی کھڑکی کو اس انداز سے مقفل کر رکھا تھا کہ اس کے اندر کوئی بھی جھانک نہ پایا۔ دو تین برس تو اس نے اس طرح گزار لئے۔ لیکن اس کے بعد اس کی چُپ اس کے غم کی پردہ داری نہ کر سکی اس کے چہرے کی افسردگی، اس کی آنکھوں کی اداسی، اس کی رنگت کی زردی اس کا کھویا کھویا پن یہ سب مل کر اس کے دل کی گہرائیوں کے غماز بنتے چلے جا رہے تھے۔ یہ سب کچھ اندر ہی اندر ہو رہا تھا لیکن اس نے اس پر بھی اپنی زبان نہ کھولی، پھر ہلکا ہلکا تپ رہنے لگ گیا۔ اب معلوم ہوا کہ اس آتش خاموش نے اسکے مغز استخواں تک کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ بس اس میں وہ چل بسی۔

رشیدہ بڑی سمجھدار بچی تھی۔ معاملہ فہم، سلیقہ شعار، اپنی عمر کی لڑکیوں سے کہیں زیادہ سنجیدہ، لیکن اس کے ساتھ ہی بڑی حساس۔ تیرہ چودہ برس کی ہو گی کہ اس کے باپ نے مولوی صاحب سے یہ مسئلہ سُن لیا کہ جب لڑکی جوان ہو جائے تو اس کے ہاتھ کا کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے۔ جب تک اس کی شادی نہ کر دی جائے۔ لہٰذا اب اس کے باپ کے سامنے سوال یہ نہیں تھا کہ اس کے لئے موزوں رشتہ کون سا ہو گا۔ سوال یہ تھا کہ اسے گھر سے دھکا دے کر باہر کیسے نکالا جائے تاکہ "حرام کا پانی پینے" کے گناہِ عظیم سے بچ جائے۔ اس شرعی ضرورت کے ماتحت بیٹی کو گھر سے وداع کرنے کی فکر باپ کے سر پر سوار ہو گئی۔

یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ ہمارے گھروں میں اور ہر قسم کی باتیں کھلے کھلے کی جا سکتی ہیں۔ لیکن رشتہ ناطہ کے متعلق تجویزوں کو بڑے راز میں رکھا جاتا ہے۔ اور اس کی تو خاص طور پر احتیاط کی جاتی ہے کہ جس لڑکی کی شادی کا مسئلہ درپیش ہے اس کے کان میں اس کی بھنک تک نہ پڑنے پائے۔ چنانچہ رشیدہ کے ماں باپ بھی لڑکی کے رشتہ کے متعلق آپس میں کھسر پھسر کرتے رہتے۔ محلہ میں شدہ شدہ کچھ باتیں بھی نکلتی رہتیں۔ لیکن رشیدہ سے سب کچھ راز میں رکھا جاتا۔ لیکن اگر اسے یقینی طور پر کچھ

رازداری

معلوم بھی ہو جاتا (اور خواہ معلوم بھی اپنی ماں ہی سے ہو جاتا) تو بھی اس سے کیا فرق پڑتا؟ یہ ناممکن تھا کہ وہ یہ کہہ دیتی کہ مجھے فلاں رشتہ ناپسند ہے۔ ہمارے ہاں اگر کوئی لڑکی اپنے رشتہ کے متعلق ایک لفظ بھی زبان تک لے آئے تو "باغیرت" باپ اس "بے حیا" کا گلا گھونٹ دے۔ لہٰذا اس کا سوال ہی نہ تھا کہ اس کے رشتہ کی تجویزوں کو رشیدہ سے خفیہ رکھا جاتا تھا یا اسے اس کا علم ہو جاتا تھا۔ البتہ جس جگہ اس کے رشتہ کی بات ٹھہرائی جا رہی تھی وہ اسے دل سے ناپسند تھی۔ مگر اس سے بھی کیا فرق پڑتا تھا۔ ہمارے ہاں لڑکیوں کو شروع ہی سے یہ سبق دیا جاتا ہے کہ روحیں ازل کے دن ہی سے جوڑ دی جاتی ہیں

قسمت کا لکھا

اس لئے جس جس روح کا آپس میں جوڑ ہوتا ہے، ان کا رشتہ ہو کر رہتا ہے۔ ہر ایک کے ماتھے کا لکھا اس کی جھولی میں پڑتا ہے۔ لیکھ کی ریکھ مٹائی نہیں جا سکتی، یہ بندھن تو آسمانوں پر بندھ جاتے ہیں۔ اصلی نکاح تو فرشتوں نے پہلے ہی سے پڑھا دیا ہوتا ہے۔ زمین پر محض رسم پوری کی جاتی ہے۔ یہ تمام باتیں "شریعت کے مسائل" کی حیثیت سے ہمارے ہاں بیان ہوتی ہیں اس لئے رشتہ میں انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

رشیدہ بڑی سمجھدار لڑکی تھی اس لئے وہ محسوس کرتی تھی کہ یہ چیزیں غلط ہیں۔ اس نے کئی بار چاہا کہ اپنی ماں سے اس کے متعلق بات کرے۔ لیکن اس نے جب بھی کچھ کہنے کی کوشش کی، کوئی چیز تھی جو اس کے گلوگیر ہو جاتی تھی اور وہ پھر خاموش کی خاموش رہ جاتی تھی۔

تم جانتی ہو طاہرہ! یہ کیا چیز تھی جو یوں اس کے گلوگیر ہو جاتی تھی؟ یہ تھا وہ ہوا جسے ہم نے "ضمیر کی آواز" کا نام دے کر اتنا مقدس بنا رکھا ہے کہ اس کے فیصلے، خدا کے فیصلے اور اس کا حکم آسمان کا حکم سمجھا جاتا ہے

ضمیر کی آواز

اور جسے ہر معاملہ میں غلط اور صحیح کا معیار قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس "مقدس آواز" کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ ہماری تعلیم، تربیت، ماحول، عقائد

وغیرہ کے مجموعی اثرات کا نتیجہ ہوتی ہے جو چپکے چپکے آہستہ آہستہ بچپن سے ہمارے دل کی گہرائیوں میں نقش اور بالآخر پختگی حاصل کرکے ایک خاص شکل اختیار کر لیتی ہے۔ تمہیں یاد ہے کہ امرتسر میں تمہارے پڑوس میں جو جینی رہا کرتے تھے، ان کے بچوں کو گوشت کا نام سن کر قے ہوجاتی تھی۔ حالانکہ اسی عمر کا تمہارا جاوید دن بھر ہڈی چوستا رہتا تھا۔ جینیوں کے بچے کی ضمیر کی آواز کہتی تھی کہ گوشت ناپاک شے اور بہت بری چیز ہے۔ لیکن ہمارے جاوید میاں کی ضمیر اسے گوشت کھانے پر کبھی ملامت نہیں کرتی تھی۔ یہ تھی وہ "ضمیر کی آواز" جو رشیدہ کو ہوا بن کر ڈراتی تھی کہ تو لڑکی اور ایک مسلمان لڑکی ہو کر اپنے رشتے کے متعلق لب کشائی کرتی ہے؟ اگر اس کے سامنے کہیں قرآن کی تعلیم ہوتی تو وہ غلط تربیت، غلط تعلیم، غلط ماحول اور غلط عقائد کی اس آواز کو (جسے وہ ضمیر کی آواز سمجھتی تھی) جھٹک کر الگ کر دیتی اور کہہ دیتی کہ جب میرے خدا کا حکم ہے کہ نکاح، لڑکے اور لڑکی کی باہمی رضامندی ہی سے ہو سکتا ہے تو اس کے خلاف جو آواز بھی اٹھے گی وہ خدائی حکم سے سرکشی کی آواز ہو گی خواہ وہ آواز باہر سے آئے یا انسان کے اپنے سینے سے اٹھے۔ دنیا میں صرف ایک آواز ہے۔ جس میں غلطی اور گمراہی کا امکان نہیں۔ اور وہ آواز ہے خدا کی جو آواز قرآن کے الفاظ میں موجود ہے۔

ادھر یہ ہو رہا تھا اور ادھر حمید کے ہاں بھی اس کی شادی کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اگرچہ اس باب میں حمید کی بھی یہ پوزیشن نہیں سمجھی جاتی تھی کہ اس سے اس کی شادی کے متعلق مشورہ کیا جائے لیکن اس سے یہ تجاویز اس طرح پوشیدہ نہیں رکھی جاتی تھیں جس طرح ایک لڑکی سے مخفی رکھی جاتی ہیں۔ حمید بھی سمجھدار لڑکا تھا۔ اس نے اپنی ماں سے کہہ دیا کہ ہمارے حالات ایسے ہیں کہ مجھے ابھی شادی نہیں کرنی چاہیئے۔ (اباجان ایک عرصے سے بیمار چلے آتے ہیں اور کچھ کمانے کے قابل نہیں)، میری تنخواہ بہت قلیل ہے اور سارے گھر کا اسی پر گزارہ ہے۔ اول تو شادی کے اخراجات کے لئے جو روپیہ قرض لیا جائیگا اس کی ادائیگی کی کوئی صورت نہیں ہو گی، پھر اس آنے والی کا بھی تو کچھ خرچ پڑے گا۔ یہ تمام اخراجات اس تنخواہ سے کس طرح پورے ہو سکیں گے؟ گرانی کا زمانہ ہے، اخراجات دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس لئے ابھی اس شادی کے سوال کو رہنے دو۔

ماں نے یہ کچھ سنا تو ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا کہ بیٹا! لوگ سچ کہتے تھے کہ لڑکے کو کالج میں نہ

بھیجو۔ وہاں کی تعلیم اچھے بھلے مسلمان بچّوں کو بے دین بنا دیتی ہے۔ میں اسے نہیں مانتی تھی لیکن اب مجھے یہ

خدا رازق ہے

ماننا پڑا کہ وہ سچ کہتے تھے۔ حمید بیٹا! تجھے تو خدا پہ ذرّہ برابر بھی ایمان نہیں رہا۔ کیا تو اُسے رازق نہیں مانتا جو ایسے حساب کرنے بیٹھ گیا ہے؟ یہ کہاں سے آئے گا؟ وہ کہاں سے آئے گا؟ یعنی جس خدا نے پیدا کیا ہے اسے ہمارے رزق کی فکر ہی نہیں؟ وہ خدا جو پتھر میں کیڑے کو بھی رزق پہنچاتا ہے، ہمیں رزق نہیں دے گا؟ بیٹا! توبہ کرو۔ خدا سے معافی مانگو، تمہارے دل میں یہ کیسے خیالات آنے لگ گئے! وہ آنے والی آئے گی تو کیا اپنا رزق ساتھ نہیں لائے گی؟ تمہاری یا میری کیا حیثیت ہے جو ہم کسی کو کھانے کو دیں۔ سب کو وہی خدا کھانے کو دیتا ہے جس کی قسمت میں جو کچھ لکھا ہے وہ اسے مل کر رہے گا۔ ہماری قسمت کو ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ اور اگر ہماری تقدیر میں غریبی لکھی ہے تو اسے کوئی امیر سے نہیں بدل سکتا۔ اگر خدا نے ہماری قسمت میں فاقے لکھ دیئے ہیں تو ہمیں فاقوں سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ خدا کے نیک بندے وہ ہیں جو قسمت پر شاکر رہتے ہیں۔ اس سے انسان کے دل میں قناعت پیدا ہوتی ہے اور قناعت ایسی دولت ہے جو خدا کے خاص بندوں ہی کو نصیب ہوتی ہے۔ خدا کے بڑے بڑے پیر پیغمبر، بڑے بڑے قطب اولیا، بڑے بڑے خدا رسیدہ بزرگ، ان کے حالات پڑھو اور دیکھو کہ ان پر اللہ کی طرف سے کس قدر مصیبتیں آئیں لیکن انہوں نے ان سب کو برداشت کیا۔ ان کے پاس نہ کھانے کو روٹی تھی نہ پہننے کو کپڑا، نہ رہنے کو مکان نہ بچھانے کو بستر۔ لیکن انہوں نے خدا پر توکّل رکھا اور اپنی تقدیر پر شاکر

توکّل

رہے۔ اللہ نے انہیں بڑے بلند مرتبے عطا کر دیئے۔ حضرت ایوبؑ خدا کے بڑے پیارے بندے تھے۔ ان کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ سارے بدن میں کیڑے پڑ گئے تھے۔ جب کوئی کیڑا ان کے جسم سے نیچے گر جاتا تو وہ اسے اُٹھا کر پھر اپنے زخموں میں رکھ لیتے اور کہتے کہ اگر تو زمین پر رہ گیا تو تجھے کھانے کو کہاں سے ملے گا! اللہ نے ان کے صبر کا اجر دیا اور ان کو اپنا رسول بنا لیا۔ یہ ہے بیٹا! خدا پہ سچّا ایمان۔ تمہارے دل میں شیطان نے وسوسہ ڈال دیا ہے جو تم سوچنے لگ گئے ہو کہ شادی کر لی تو اس تنخواہ میں گزارہ کیسے ہو گا جن لوگوں کی تنخواہیں نہیں لگی ہوئیں انہیں بھی تو کہیں سے رزق ملتا ہے ہی! کیا ہمارے رسولِ خدا کی تنخواہ لگی ہوئی تھی؟

حمید کی ماں ایک ہی سانس میں اتنا کچھ کہہ گئی کہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کی کس کس بات کا جواب دے۔ اس نے بات ختم کرنے کے لئے کہا کہ "امّی جان" میں تو صرف اتنا ہی کہتا ہوں کہ ابھی شادی

نہ کرو، تھوڑے دن اور ٹھہر جاؤ۔ جب میری تنخواہ بڑھ جائے یا کم از کم مجید کے کالج کا خرچ نہ رہے اور وہ بھی کچھ کمانے کے قابل ہو جائے، اس وقت شادی کر دینا، میں شادی سے انکار تھوڑا کر رہا ہوں۔

اس کی ماں نے بات کاٹتے ہوئے کہا کہ بیٹا! اچھے رشتے روز روز نہیں ملا کرتے۔ یہ محض خدا کی طرف سے ہے جو اس نے بہن صابرہ کے دل میں یہ بات ڈال دی ہے، ورنہ ہم کب اس قابل تھے کہ رشیدہ جیسی لڑکی ہمیں مل جاتی؟ شکل سے چاند کا ٹکڑا۔ عقل دیکھو تو سو ہزار میں ایک۔ پڑھی لکھی، سمجھدار، سلیقے والی، جس دن سے اس نے گھر کا کام کاج سنبھالا ہے، اس گھر کا نقشہ بدل گیا ہے۔ دُور دُور سے عورتیں دیکھنے آتی ہیں۔ ایسی لڑکی کہیں سے مل سکتی ہے؟ اور پھر پیر جی عبدالصمد کہتے تھے کہ اس کا ستارہ بڑا نیک ہے۔ جس گھر میں اس کا قدم پڑ جائے گا وہ گھر جنت بن جائے گا۔ میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر کرتی ہوں کہ میری بہن نے میری بات کی لاج رکھ لی اور تم کہتے ہو کہ ابھی شادی نہ کرو، ٹھہر جاؤ۔ بھلا سوچو تو، اس کا باپ تمہاری خاطر بیٹی کو گھر بٹھا رکھے گا کہ تمہاری ترقی ہو جائے تو پھر شادی کرے۔ خواہ اتنے میں بیٹی کا سر سفید ہی کیوں نہ ہو جائے۔

حمید کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ اس کا باپ ہانپتے کانپتے کمرے میں آگیا اور بیوی سے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ جس پر جھگڑا ہو رہا ہے؟ بیوی نے بتایا تو اس نے کہا کہ حمید بیٹا! میں تو صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ میری بیماری اتنی بڑھ چکی ہے کہ معلوم نہیں مجھے کتنے دن اور جینا ہے۔ دل میں اب ایک ہی آرزو ہے اور وہ یہ کہ مرنے سے پہلے تمہارے سر پر سہرا باندھ لوں۔ بس اس کے بعد اطمینان کی موت مروں گا۔ کیا تم اپنے بیمار اور بوڑھے باپ کی یہ آخری آرزو بھی پوری نہ کرو گے۔

حمید نے کچھ کہنا چاہا تو باپ نے غصے میں آکر کہا کہ حمید! آخری بات یہ ہے کہ یہ میرا حکم ہے بس اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

اتنے میں محلہ کی مسجد میں جمعہ کی اذان ہوگئی اور حمید نماز کے لئے چلا گیا۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ اس دن مولوی صاحب نے خطبہ سے پہلے وعظ میں ماں باپ کی اطاعت کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ انہوں نے بتایا کہ شریعت کی رُو سے ماں باپ کی اطاعت عین فرض ہے۔ ماں باپ کا درجہ، خدا کے درجے کے برابر ہوتا ہے۔ جو شخص ان کا حکم نہیں مانتا اسے خدا کبھی نہیں بخشتا۔ وہ سیدھا ہاویہ (دوزخ) میں جاتا ہے۔ پھر انہوں نے بتایا کہ انگریزی تعلیم نے

ماں باپ کی اطاعت

آجکل کے نوجوانوں کو کس قدر خود سر بنا دیا ہے کہ نہ ان کی آنکھوں میں بزرگوں کا کوئی لحاظ ہے، نہ ماں باپ کی اطاعت!

حمید یہ کچھ سن رہا تھا اور اس کا دل عجیب و غریب کشمکش کی آماجگاہ بن رہا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ وہ شادی نہ کرائے۔ علم، عقل، تجربہ، واقعات سب اس فیصلہ کی تائید میں جاتے ہیں۔ اس بے وقت شادی کے نقصانات ایک ایک کر کے اس کے سامنے آتے تھے۔ جنہیں وہ دو اور دو چار کی طرح صحیح پاتا تھا۔ لیکن دوسری طرف اسے کہا جا رہا تھا کہ اس کے خدا کا حکم ہے کہ ماں باپ کی اطاعت کرو۔ اُن کے فیصلے کے سامنے اُف تک نہ کرو۔ اسے بے چون و چرا مان لو۔ ایسا نہ کرو گے تو خدا کے مجرم ہو جاؤ گے! چونکہ بچپن کے تعلیم و تربیت سے اسکے دل پر مذہب کی بڑی گرفت تھی اس لئے اس کشمکش میں "خدا کا حکم" واقعات کے تقاضوں پر غالب آگیا۔ اس نے نماز کے بعد، اپنی حماقت پر خدا سے معافی مانگی۔ مسجد سے سیدھا گھر گیا اور باپ سے با ادب عرض کیا کہ مجھے معاف کر دیجئے۔ میں آپ کی آزردگیٔ خاطر کا موجب بن گیا۔ مجھے آپ کے حکم کی اطاعت میں ذرا بھی تامل نہیں۔ آپ جو کچھ چاہتے ہیں کیجئے۔ میں آپ کا فرمانبردار بیٹا ہوں گا۔

ماں کی آنکھیں فرطِ مسرت سے جگمگا اٹھیں۔ اس نے اُٹھ کر بیٹے کو گلے سے لگالیا۔ بہت بہت دعائیں دیں۔ ماں نے "صدقے واری" کیا اور یوں معاملے کا فیصلہ ہو گیا۔

والدین کے متعلق قرآن کا حکم

ذرا سوچو طاہرہ! کہ خدا کا حکم اس قسم کا بھی ہو سکتا ہے کہ تم عقل و ہوش کو بھی ایک طرف رکھ دو۔ سمجھ سوچ سے بھی کام نہ لو۔ نفع نقصان کی کسی قسم کی پرواہ نہ کرو۔ اور جو کچھ تمہارے بوڑھے ماں باپ حکم دیں۔ آنکھیں بند کئے اس کی اطاعت کئے جاؤ؟

تم کہو گی کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، یہ درست معلوم ہوتا ہے لیکن پھر اس کا کیا جواب ہے کہ خدا کا حکم ہے کہ ماں باپ کی اطاعت کرو۔

لیکن تمہیں تعجب ہوگا جب میں کہوں گا کہ یہ خدا کا حکم ہے ہی نہیں کہ ماں باپ کی اطاعت کرو۔ اس کا حکم صرف یہ ہے کہ ماں باپ سے حُسنِ سلوک سے پیش آؤ۔ کیونکہ وہ ضعیف ہو چکے ہیں اور ہمدردی کے مستحق ہیں۔

تم کہو گی کہ یہ بات تو ایک مسلّمہ کے طور پر مانی جاتی ہے کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے۔ یعنی یہ ایسی بات ہے جس میں کسی کو بھی اختلاف نہیں۔

اور میں کہوں گا کہ کتنی ہی غلط باتیں ہیں جو وقت گزرنے کے ساتھ مسلّمہ بن جاتی ہیں۔ اگر میں ان باتوں کی لسٹ مرتّب کر کے تمہارے سامنے رکھوں جو ہمارے مروّجہ مذہب میں بطور مسلّمات مانی جاتی ہیں، لیکن جو درحقیقت غلط ہیں تو تم سر پکڑ کر بیٹھ جاؤ۔ ذرا سوچو کہ مسلّمہ بنتا کس طرح ہے؟ کوئی بات جو دو تین نسلوں تک متوارث چلی آئے، بعد میں مسلّمہ بن جاتی ہے۔ صحیح اور غلط کے پرکھنے کا ایک ہی معیار ہے یعنی یہ کہ اس کے متعلق قرآن کا کیا فیصلہ ہے! جسے قرآن صحیح قرار دے وہ صحیح ہے۔ خواہ اسے ایک آدمی بھی صحیح نہ مانتا ہو اور جسے وہ غلط قرار دے وہ غلط ہے خواہ اسے ساری دنیا مسلّمہ کی حیثیت سے مانتی ہو۔

تم یہ بھی کہو گی کہ "ماں باپ کی اطاعت فرض ہے" ایک "ایسی" حقیقت ہے جسے صرف مسلمانوں کے ہاں ہی بطور مسلّمہ نہیں مانا جاتا بلکہ دنیا کا ہر مذہب اور ہر ضابطۂ اخلاق اسے بطور مسلّمہ مانتا چلا آرہا ہے۔

اور میں کہوں گا کہ قرآن کے منجانب اللہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ وہ اس کی پروا نہیں کرتا کہ ساری دنیا کیا مانتی ہے۔ وہ صرف اسی بات کو صحیح قرار دیتا ہے جو فی الحقیقت صحیح ہو۔ اگر قرآن کسی انسان کی تصنیف ہوتا تو وہ ان تمام باتوں کو علیٰ حالہٖ اپنے اندر شامل کر لیتا جنہیں دنیا بطور مسلّمات مانتی چلی آرہی تھی۔ لیکن وہ دنیا کے پیچھے چلنے کے لئے نہیں آیا تھا۔ دنیا کو اپنے پیچھے چلانے کے لئے آیا تھا۔ اس لئے اُسے اس کی پرواہ نہیں کہ ایسے تصوّرات اور عقائد جنہیں دنیا کے مذاہب نے اس لئے مسلّمات کی حیثیت سے تسلیم کر رکھا ہے کہ ان کے ہاں خدا کے احکام اپنی اصلی شکل میں باقی نہ رہے تھے' باقی رہتے ہیں یا ختم ہوتے ہیں۔ اس کا کام حقائق کو پیش کرنا تھا۔ سو اس نے پیش کر دیئے۔ اسی ایک سوال (ماں باپ کی اطاعت کے سوال) ہی کو لو۔ یہ ٹھیک ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب اسے بطور مسلّمہ کے مانتے ہیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ یہ حقیقت ہے کہ وَمَنۡ نُّعَمِّرۡهُ نُنَكِّسۡهُ فِى الۡخَـلۡقِ‌ؕ (۳۶/۶۸) بڑھاپے کی عمر میں پہنچ کر انسان کی عقل اوندھی ہو جاتی ہے یہ انسانی عمر کا ارزل (نکما) حصّہ ہوتا ہے۔ جس میں حالت یہ ہوتی ہے کہ انسان سمجھ بوجھ کا درجہ پا کر پھر ناسمجھی کی حالت میں پہنچ جاتا ہے (وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ

لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا (۲۲/۵) یہ وہ حقائق ہیں جن سے نہ دنیا کا کوئی مذہب انکار کر سکتا ہے نہ ضابطۂ اخلاق۔ لیکن اس کے باوجود وہ سب یہ کہتے ہیں کہ وہ نوجوان جسے خدا نے علم و عقل

قرآن اور دیگر مذاہب

عطا کیا ہے، جسے قوتِ فیصلہ دی ہے، جس کے قویٰ میں مضبوطی اور اعصاب میں طاقت ہے جس کا دماغ تازہ اور دل تنومند ہے وہ اپنے معاملات میں ان لوگوں کے فیصلوں کا پابند ہو جن کی عقل فرسودہ ہو چکی ہے اور علم بے کار۔ جنکے قویٰ افسردہ ہو چکے ہیں اور اعصاب مضمحل، جن کے دماغ کہنہ اور بوسیدہ ہو چکے ہیں اور دل کمزور۔ جن پر عقل و فہم کے بجائے جذبات کا اثر غالب ہے جو اس زمانے کے تقاضوں کو سمجھ ہی نہیں سکتے جس میں یہ نوجوان اُبھر رہا ہے جو دنیا کی دوڑ میں پچاس سال پیچھے چل رہے ہیں۔ اس قسم کا حکم وہ اخلاقی ضابطے تو دے سکتے ہیں جنہیں بڑے بوڑھوں نے بنایا ہو اور وہ نوجوانوں سے اپنی اطاعت کرانا چاہتے ہوں۔ لیکن قرآن (جو خدا کے دین کا ضابطہ ہے) کبھی اس قسم کا حکم نہیں دے گا۔ ان اخلاقی ضوابط (یا انسانی مذاہب) کا ہیرو، مہاراجہ رام چندر ہو سکتا ہے جو باپ کے اس حکم کی اطاعت کو بھی اپنا فرض سمجھتا ہے جسے خود باپ بھی غلط سمجھتا ہے اور محض اپنی مجبوری کی بنا پر اسے نافذ کرتا ہے۔ لیکن قرآن کا ہیرو، ابراہیمؑ ہے جو باپ سے علانیہ کہہ دیتا ہے کہ تم جس روش پر چل رہے ہو وہ روش غلط ہے۔ اس لئے میں اس روش پر نہیں چلوں گا اور قرآن (حضرت) ابراہیم (علیہ السلام) کے اس فیصلہ کو آنے والوں کے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیتا ہے (۴/۶۰)۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ قرآن سرکشی سکھاتا ہے۔ وہ اطاعت سکھاتا ہے۔ لیکن اطاعت کس کی؟ خدا کے احکام کی۔

اطاعت کی شکل؟

یہی وجہ ہے کہ وہ جہاں ایک طرف (حضرت) ابراہیمؑ کو اسلام کا ہیرو قرار دیتا ہے وہاں (حضرت) اسماعیلؑ کو بھی ایسا ہی ہیرو قرار دیتا ہے جس نے باپ کی چھری کے نیچے اپنی گردن رکھ دی۔ لیکن کیوں رکھ دی؟ باپ کے حکم کی تعمیل کے لئے نہیں بلکہ اس لئے کہ اس نے اس حکم کو خدا کا حکم سمجھا تھا۔ اسی لئے اس نے کہا تھا کہ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ (۳۷/۱۰۲) "اے باپ! جو کچھ تجھے حکم ملا ہے تو اس کی تعمیل کر۔" (یہ الگ بات ہے کہ وہ حکم خدا کا تھا ہی نہیں۔ اسے ایسا سمجھ لیا گیا تھا)۔ لہٰذا قرآن کی رُو سے اطاعت خدا کے احکام کی ہے، ماں باپ (یا کسی اور کے) حکم کی نہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ جب تک بچہ سنِ بلوغت کو نہ پہنچے، اس کے معاملات کے فیصلے اور ان کی نگہداشت اس کے ماں باپ یا ولی (GUARDIAN) کے ذمّے ہے اس لئے اسے اپنے معاملات کے فیصلے

خود نہیں کرنے چاہئیں، اُسے ان بزرگوں کے فیصلوں کے مطابق چلنا چاہیئے۔ لیکن اس کے بعد جب وہ خود صاحبِ عقل و شعور ہو جائے اُسے خدا کے احکام کی روشنی میں اپنے معاملات کے فیصلے خود کرنے چاہئیں۔ لہٰذا ایک صحیح العقل نوجوان کے لئے ماں باپ کی اطاعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ تو غنیمت ہے کہ نوعِ انسانی نے اس اخلاقی ضابطہ (ماں باپ کی اطاعت فرض ہے) پر بہ ہیئت مجموعی عمل نہیں کیا (اور نہ ہی یہ ممکن العمل تھا) ورنہ اگر انسانیت اس پر مجموعی طور پر عمل پیرا ہو جاتی تو دنیا آج وہیں ہوتی جہاں وہ پہلے دن تھی اس میں ذرا سی بھی علمی اور عملی ترقی نہ ہوتی۔ اس لئے کہ جب ہر آنے والی نسل جانے والی نسل ہی کے فیصلوں کی پابند رہتی تو آنے والی نسل کا قدم آگے کیسے بڑھتا؟ جانے والی نسل کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے گذرے ہوئے دَور کو انسانیت کا بہترین زمانہ قرار دیتی ہے اور جو اس سے ایک اِنچ بھی اِدھر اُدھر ہٹتا ہے، اس کے خلاف دانت پیستی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر بوڑھا آدمی اپنے زمانے کو یاد کر کے روتا ہے اور آنے والے کو کوستا ہے کہ اسے ہر اچھائی اپنے زمانے میں نظر آتی ہے اور ہر برائی آنیوالے زمانہ میں۔ حالانکہ کائنات اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اُوپر کو اُٹھ رہی ہے۔ نیچے کو نہیں جا رہی، آگے بڑھ رہی ہے، پیچھے نہیں ہٹ رہی۔

بہرحال یہ ہے عزیزہ! قرآن کا فیصلہ اس بات میں جسے تم بھی اب تک مسلّمہ سمجھ رہی تھی!
اب آئی بات تمہاری سمجھ میں کہ اس مسجد کے خطیب نے اپنی جہالت کی وجہ سے حمید بیچارے کو کس پٹڑی پر ڈال دیا تھا۔

بہرحال اس طرح رشیدہ کی شادی حمید کے ساتھ ہوئی۔ شروع کے ایک دو مہینے تو چاؤ چونچلوں میں گذر گئے لیکن اس کے بعد اس غلط اقدام کی تلخیاں سامنے آنی شروع ہو گئیں۔

ساس کا مسئلہ

انسانی معاشرہ میں "ساس" کا مسئلہ ایسا پیچیدہ اور دقیق ہے کہ ابھی تک کوئی دماغ اس کا حل سوچ نہیں سکا۔ مشرق ہو یا مغرب، ساس کا سوال ہر جگہ موجود ہے۔ مشرق میں چونکہ (بالعموم) بیوی شریکِ مغلوب اور کمزور ہوتی ہے۔ اس لئے یہاں ساس اپنی بہو کے لئے وبالِ جان بنتی ہے۔ لیکن مغرب میں چونکہ مرد بیچارہ مغلوب ہوتا ہے اس لئے وہاں کی ساس، اپنے داماد کے لئے ہوّا بنی رہتی ہے۔ (اس میں شبہ نہیں کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ

ساس خود اپنی ماں سے بھی زیادہ شفیق اور ہمدرد مل جاتی ہے لیکن یہ مستثنیات میں سے ہے۔ عام انداز وہی ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔) جہاں تک میں نے غور کیا ہے، ساس کا مسئلہ معاشرتی یا معاشی سے کہیں زیادہ نفسیاتی (PSYCHOLOGICAL) ہے۔ ماں نے جس انداز سے اپنے بیٹے کو پرورش کیا ہوتا ہے اس کی بنا پر وہ اسے اپنی "واحد ملکیت" سمجھتی ہے، وہ اس کے جملہ حقوق اپنے حق میں محفوظ خیال کرتی ہے۔ وہ اس کی محبت اور توجہ میں کسی اور کو شریک دیکھنا نہیں چاہتی۔ ماں کے دل میں یہ تمام جذبات غیر شعوری طور پر موجزن رہتے ہیں تا آنکہ بیٹا جوان ہو جاتا ہے۔ اور وہ اس کی شادی کی فکر کرنے لگتی ہے۔ اس وقت اس کے دل میں قطعاً یہ خیال نہیں گزرتا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے ایک ایسی چیز کو گھر میں لا رہی ہے جو اس کے بیٹے کے لئے اس سے کہیں زیادہ وجۂ جاذبیت بن جائے گی۔ وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ میں اپنے بیٹے کے لئے بیوی لا رہی ہوں اور چونکہ بیٹا میری واحد ملکیت ہے اس لئے جو کچھ بیٹے کا ہو گا وہ میری ہی ملکیت ہو گا۔ وہ اگر اس آنے والی کو کچھ حیثیت دیتی ہے تو فقط اتنی کہ وہ اس کے لئے پوتے اور پوتیاں پیدا کرنے کا ذریعہ بنے گی۔ وہ یہ سب کچھ اس جذب و انہماک سے کرتی ہے کہ اس کا خیال کبھی اس طرف آنے ہی نہیں پاتا کہ میں اپنے ہاتھوں سے اپنا "شریک" پیدا کر رہی ہوں۔ لیکن بہو کو گھر لانے کے بعد، اس پر یک لخت یہ راز کھلتا ہے کہ اس کا بیٹا اس کے ہاتھوں سے نکل گیا ہے اور چونکہ اس کی وجہ وہی بہو ہوتی ہے اس لئے وہ اسے اپنی متاع برده کا رہزن سمجھتی ہے۔ اور اپنی شکست کا پورا پورا انتقام اس سے لینے پر تل جاتی ہے۔ اس کی اس نفسیاتی کیفیت کا اندازہ نہ تو اس کا بیٹا کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کی بہو (اس لئے کہ ان کا خیال بھی اس طرف نہیں جا سکتا کہ انہوں نے اس کا کچھ چھین لیا ہے)۔ اس لئے وہ اس کی ناراضگی کی وجوہات اور گوشوں میں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اور معاملہ دن بدن بگڑتا چلا جاتا ہے۔ (چونکہ باپ اپنے بیٹوں کے متعلق اس قسم کا تصور ذہن میں نہیں رکھتا جس قسم کا تصور ماں رکھتی ہے۔ اس لئے وہ اپنی بہو کی آمد پر اس قسم کی نفسیاتی الجھن میں گرفتار نہیں ہوتا۔ اس کی شکایات اگر کبھی ہوتی ہیں تو وہ اور نوعیت کی ہوتی ہیں۔)

بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ چونکہ ہر بہو کے ساتھ ساس اسی قسم کا سلوک کرتی ہے۔ اس لئے جب یہی بہو کچھ عرصہ کے بعد خود ساس بنتی ہے تو وہ اپنی ساس کی زیادتیوں کا انتقام اپنی بہو سے لیتی ہے اور یہ سلسلہ مسلسل آگے بڑھتا رہتا ہے۔

بہرحال اس کی وجہ کچھ بھی ہو، حقیقت یہی ہے کہ ہمارے معاشرہ کے ۹۹ فیصد گھروں میں جس جہنّم کا عذاب دکھائی دیتا ہے اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ شادی سے پہلے لڑکے کی ماں، لڑکے کی اس نئی زندگی کے لئے اپنے آپکو بالکل تیار نہیں کرتی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود بھی اس عذاب میں جلتی ہے اور اس نئے جوڑے کی زندگی کو بھی عذاب بنا دیتی ہے۔ اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کچھ کیوں ہو رہا ہے اور اس کا علاج کیا ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا طاہرہ! کہ ایسے گھروں میں جس قدر جھگڑے اُٹھتے ہیں جب ان کا تجزیہ کیا جائے تو بات کچھ بھی نہیں نکلتی۔ بات درحقیقت کچھ ہوتی بھی نہیں۔ اصل بات تو وہی ہوتی ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ لیکن اس کا شعوری طور پر علم نہ ماں کو ہوتا ہے نہ بیٹے کو، اور نہ ہی اس بیچاری نووارد کو۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں ان جھگڑوں کو لاعلاج تصوّر کر لیا گیا ہے اور یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ ایسا ہوا ہی کرتا ہے۔ لیکن طاہرہ بیٹی! یہ سب جہالت کا نتیجہ ہے۔ اس کا ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ شادی کرنے کی تجویز سے پہلے ماں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اب اس کے بیٹے نے اپنی نئی

لڑکے کو الگ کر دیا جائے

زندگی شروع کرنی ہے جس میں اس کی محبت اور جاذبیت بیوی کی طرف منتقل ہو جاتی ہے اور ماں سے صرف حسنِ سلوک کا تعلق باقی رہتا ہے اگر وہ اسے سمجھ لیتی ہے تو پھر اس کے بعد، اس کی عملی شکل یہ... ہے کہ شادی کے ساتھ ہی بیٹے کو اپنی زندگی بسر کرنے کے لئے الگ کر دیا جائے۔ وہ اپنے گھر میں اپنی ذمہ داری کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرے اور ان کے معاملات میں قطعاً دخل نہ دیا جائے۔ اس طرح تم دیکھو گی کہ وہ بیٹا بھی ماں کا خدمتگذار رہے گا اور بہو بھی ساس کی تعظیم کرے گی اگر اس خاندان کی معاشی حالت ایسی ہو کہ دو گھروں کے الگ الگ اخراجات کی صورت ممکن نہ ہو تو پھر لڑکے کی شادی اس وقت تک کبھی نہیں کرنی چاہیئے جب تک اس کے الگ گزارے کی صورت پیدا نہ ہو جائے۔ اس کے سوا اس جہنّم سے بچنے کی کوئی صورت نہیں جس کے شعلے اس وقت ہمارے گھروں کو اسطرح خاکستر بنائے جا رہے ہیں۔

حمید کے معاملے میں ماں کی اس نفسیاتی کشمکش کے علاوہ معاشی مشکل بھی تھی۔ جس سے وہ بیچارہ پہلے ہی خائف تھا: شادی کے اخراجات کا قرض، گھر کا بڑھتا ہوا خرچ، باپ کی مسلسل بیماری جب ان تمام باتوں کا مجموعی اثر مرتّب ہوا تو ساس کا نزلہ غریب رشیدہ پر گرنا شروع ہوگیا۔ وہی رشیدہ جس کے متعلق ابھی چند دن (شادی سے) پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ وہ بیحد سمجھدار، سلیقہ شعار، کم سخن، نیک، اطاعت

شعار ہے ، اب اس میں کیڑے پڑنے شروع ہو گئے۔ " منحوس ، سبز قدم ، جس دن سے ہمارے گھر میں آگئی ہے گھر کی برکت اٹھ گئی ہے ۔ اسی آمدنی میں یہ گھر بھرا ہوا نظر آیا کرتا تھا۔ اب ایسی نابرکتی ہوئی ہے ، کہ گھر بھائیں بھائیں کرتا ہے ، نہ کوئی سلیقہ ، نہ تمیز ، نہ کھانے پکانے کا ڈھنگ ، نہ رکھنے سنبھالنے کا خیال ، معلوم نہیں اس کی ماں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ بیٹی کو ساری عمر اپنے گھٹنے سے باندھے رکھنا ہے اور کسی پرائے گھر بھیجنا ہی نہیں جو اسے ایسی لاڈلی بنا رکھا ہے " یہ اور اسی قسم کی اور ہزار باتیں۔ اِدھر صبح حمید گھر سے نکلا اور اُدھر یہ کلکل شروع ہوئی اور شام تک لعن طعن کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ رشیدہ نے ہزار جتن کئے کہ کسی طرح اس کی ساس اس سے راضی رہے لیکن جہاں قصور یہ ہو کہ " آٹا گوندھتی کا سر کیوں ہلتا ہے " وہاں خوش رکھنے کی تدبیر کیا نکل سکتی ہے ۔ رشیدہ یہ سب کچھ اپنے آپ پر سہتی اور کسی کو کانوں کان اس کی خبر

کشمکش

نہ ہونے دیتی تھی۔ اس نے حمید سے بھی اس کا ذکر نہ کیا۔ جب اس کی ساس نے دیکھا کہ حمید اپنی بیوی کو کچھ نہیں کہتا تو اس نے خود حمید سے بھی رشیدہ کی شکایات شروع کر دیں اور اس طرح جہنم کی آگ کے وہ شعلے جنہیں رشیدہ اپنے دامن میں سمیٹتی چلی آرہی تھی ، حمید کے گریبان تک بھی جا پہنچے ۔ وہ مالی مشکلات کی وجہ سے پہلے ہی پریشان تھا ، اب اس کے سر پہ نئی قیامت ٹوٹی۔ اس کی مصیبت کی نوعیت بھی عجیب و غریب تھی ۔ وہ سمجھدار لڑکا تھا اس لئے وہ بات کو جانچ کر اس نتیجہ تک پہنچ جاتا تھا کہ رشیدہ بالکل بے قصور ہے اور اس کی ماں کی سراسر زیادتی ہے ، لیکن ماں باپ کی عظمت و عقیدت کا جو تصوّر بچپن سے اس کے دل میں جاگزیں تھا ، اور انکی اطاعت کے جو وعظ اس نے سُن رکھے تھے ، ان کے پیشِ نظر وہ اس کی جرأت ہی نہیں کر سکتا تھا کہ بیوی کے مقابلے میں ماں کو قصوروار ٹھہرا دے ۔ لیکن اس سے اس کا دل جس نفسیاتی کشمکش کی آماجگاہ بن گیا ، اسے تو وہ نہیں روک سکتا تھا۔ بیوی کی مظلومیت ، ماں باپ کی اطاعت ، اپنی بے بسی ، یہ وہ احساسات تھے جو اسے سانپ بن کر ڈستے تھے ۔ وہ جانتا تھا کہ اس مصیبت کا حل یہی ہے کہ وہ ماں باپ سے علیحدہ ہو جائے لیکن معاشی مجبوریاں اس حل کو ناممکن بنا رہی تھیں ۔ ایک آدھ مرتبہ اس نے اس خیال کا اظہار بھی کیا تو ماں نے سر پیٹ کر کہا کہ تو مجھ سے الگ ہو گیا تو میں کنوئیں میں ڈوب کر مر جاؤں گی ۔ ان پریشانیوں نے حمید کو بھی اندر ہی اندر کھوکھلا کرنا شروع کر دیا۔ لیکن حمید سے کہیں زیادہ اس کا اثر رشیدہ پہ تھا جو اس کے ساتھ بیتی تھی اسے تو وہ شاید جھیلتی چلی جاتی " لیکن حمید کی خاموش پریشانیاں اس کے لئے ناقابل

برداشت تھیں، اس سے اُسے بری طرح گھُن لگ گیا۔ اور وہ اندر ہی اندر سوکھتی چلی گئی۔ اسی حالت میں اس کے ہاں پہلا بچہ پیدا ہؤا۔ ظاہر ہے کہ جس بچے کی ماں کی صحت کا یہ عالم ہو وہ بچہ پیدائش کے ساتھ ہی اپنے اندر کیا کیا بیماریاں (یا ان کے پیدا ہونے کے اسباب) نہیں لائے گا؟ ایک تو رشیدہ کی صحت خراب اس پہ غریبی، نہ اس کی ہی دیکھ بھال ہو سکی اور نہ بچے کی۔ ہو سکتا تھا کہ حمید کی ماں اپنے بیٹے کے سب سے پہلے بچے کی نگہ پرداخت کے لئے کہیں نہ کہیں سے قرض لے کر بھی کچھ کرتی، لیکن بدقسمتی سے وہ بھی لڑکی

انجام

جس کی پیدائش کی خبر سُن کر وہ جل بھن کر کوئلہ ہو گئی تھی۔ "منحوس بہو کی منحوس لڑکی" اس کی دیکھ بھال کون کرتا؟ تین مہینے تک وہ بچاری کسی نہ کسی طرح زندہ رہی۔ پھر اپنی غمزدہ ماں کے کلیجے پہ مستقل ناسور چھوڑ کر چل بسی۔ اس کے بعد رشیدہ کی حالت دن بدن خراب ہوتی گئی۔ اسے تپِ لازم ہو گیا۔ ملک کی تقسیم کی اُفتاد سے اس کے ماں باپ بھی بہت غریب ہو چکے تھے۔ دوا دارو کہاں سے آتا۔ بس اس طرح اس نے گھل گھل کر جان دے دی۔

یہ ہے طاہرہ! تمہارے بچپن کی سہیلی کی الم انگیز داستان! یہ اس کی داستان نہیں، داستان ہے تمہارے معاشرے کی۔ کیا معلوم کتنی رشیدہ ہر روز اس کی بھینٹ چڑھتی ہیں۔ اوّل تو کسی کو علم نہیں ہونے پاتا کہ کس گھر میں کیا ہو رہا ہے اور اگر علم ہونے پاتا ہے تو صرف اتنا کہ آج فلاں کی بیٹی یا فلاں کی بہو کا انتقال ہو گیا۔۔ اس سے زیادہ کسی کو کیا خبر کہ مرنے والی کس طرح مری ہے ؎

ایک جلنے کے سوا اور کوئی کیا جانے
حالتیں کتنی گذر جاتی ہیں پروانے پہ

نصیحت

معلوم نہیں طاہرہ! جب جاوید جوان ہوں گے اور تم ان کی شادی کی فکر کر رہی ہو گی تو اس وقت میں موجود ہوں گا یا نہیں۔ لیکن میری دو تین باتیں ضرور یاد رکھنا۔ اگر تم نے ان پر عمل کیا تو تمہاری زندگی بھی سکھ سے گذرے گی اور جاوید میاں اور اس کی بیوی کی زندگی بھی مسرّتوں کے جھولے جھولے گی۔ سب سے پہلے تو یہ کہ جاوید کی شادی کی فکر اس وقت کرنا جب وہ اتنا کمانے کے قابل ہو جائے کہ اپنی ذمّہ داریوں کا بوجھ خود اُٹھا لے۔ اور اگر (خدانہ کردہ) حالات ایسے ہو جائیں کہ اسے ماں باپ کی بھی مالی امداد کرنی پڑے تو وہ یہ بھی نہایت آسانی سے کر سکے۔

پھر اس کی شادی سے پہلے یہ اچھی طرح سمجھ لینا کہ اس کی توجہات کا بیشتر حصّہ اس کی رفیقۂ زندگی کے لئے مخصوص ہو جائے گا اور تمہارا اس میں کوئی حصّہ نہیں ہوگا۔ تمہیں اس سے صرف حسنِ سلوک کی توقع رکھنی چاہیے۔

شادی کے ساتھ ہی اس کے آزادانہ طور پر الگ رہنے کا بندوبست کر دینا اور ان کے گھر کے معاملات میں کم از کم دخل دینا۔ جس قدر دخل دینا ضروری سمجھو، اسے بھی محض مشورۃً کہنا اور اگر وہ اس مشورہ کو قبول نہ کریں تو اس کا قطعاً خیال نہ کرنا۔

اسکے بعد تم دیکھو گی کہ جاوید کس طرح تمہاری عزت کرتا ہے اور تمہاری بہو کس طرح تمہارے پاؤں دھو دھو کر پیتی ہے۔

لکھنے کو تو میں تمہیں یہ سب کچھ لکھ رہا ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی جی ہی جی میں ہنس بھی رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آج یہ تمام باتیں تمہیں بہت اچھی لگتی ہیں تم ایک ایک لفظ کی تائید کرتی ہو اور کہتی ہو کہ واقعی ہونا ایسا ہی چاہیئے۔ لیکن اس وقت تمہیں ان میں سے شاید ایک بات بھی یاد نہ رہے۔ اس لئے کہ آج تم بہو ہو اور کوئی اور تمہاری ساس ہے اور اس وقت تم ساس ہوگی اور کوئی اور تمہاری بہو ہوگی۔

دنیا کا چکّر بھی عجیب ہے۔ لیکن یہ چکّر بیٹیا! ہمارا اپنا پیدا کردہ ہے۔ دنیا کے بنانے والے کا پیدا کردہ نہیں ہے۔ وہ سب کو ایک جیسے انسان پیدا کرتا ہے اور ہم ان انسانوں کو ساس اور بہو بنا دیتے ہیں۔ اس کے بعد ساس اور بہو تو باقی رہ جاتی ہے اور انسان ختم ہو جاتا ہے۔

لیکن خدا کا قانون انسان کو ہر حال میں باقی رکھتا ہے اسے کبھی ختم نہیں ہونے دیتا۔ بلکہ اسے ہر لحمہ بلند سے بلند تر کرتا جاتا ہے۔ لہٰذا تم بہو ہو یا ساس، اپنے اور دوسرے کے انسان ہونے کو کبھی نہ بھولنا خدا نے ہر فرزندِ آدم کو واجب التکریم پیدا کیا ہے (وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ ۱۷/۷۰) جو شخص ہر حال میں اس حقیقت کو سامنے رکھتا ہے، اسے مسلمان کہتے ہیں۔

اچھا خدا حافظ۔ جاوید میاں سے دعا کہنا

۸ جنوری ۱۹۵۲ء

پرویز

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

طاہرہ کے نام آٹھواں خط

(بچّے کی تربیت)

تم بھی کس قدر بھولی ہو طاہرہ! تمہیں اس پر تعجب ہو رہا ہے کہ سعیدہ بیس برس کی ہونے کو آئی ہے اور اب بھی بچّوں کی سی باتیں کرتی ہے۔ یعنی تم نے یہ تصوّر کر رکھا ہے کہ جس طرح عمر کے ساتھ ساتھ بچّے کا جسم بڑھتا ہے۔ اسی طرح اس کے ذہن[1] میں بھی پختگی آتی جاتی ہے۔ یہ خیال یکسر غلط اور واقعات کے خلاف ہے۔ اگر جسمانی قویٰ کے ساتھ ساتھ ذہن میں بھی از خود پختگی آتی جائے تو ہمارے معاشرے کا رنگ ہی کچھ اور ہو جائے۔ تمہیں جس قدر مصیبتیں دنیا میں نظر آتی ہیں ان کا بیشتر حصّہ اس وجہ سے ہے کہ لوگوں کے جسم تو جوان ہو جاتے ہیں۔ لیکن ذہن بدستور بچوں کا سا رہتا ہے۔ اگر ذہن کے ساتھ جسم بھی بچوں جیسا رہے تو پھر بھی خیریت رہے اس لئے کہ جہاں بچے کا ذہن ناپختہ ہوتا ہے وہاں اس کی جسمانی قوت اور اختیار کی وسعت بھی بہت محدود ہوتی ہے۔ اس لئے وہ زیادہ خون خرابے کا موجب نہیں بنتا۔ لیکن ذرا سوچو کہ جب جسم میں جوان آدمی کی قوت آجائے اور ہم اسے بالغ سمجھ کر اختیارات بھی سارے سونپ دیں۔ لیکن ذہن اس کا رہے بچوں جیسا ناپختہ۔ تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ وہی جو تم نے 'FRANKENSTIEN' کی تصویر میں دیکھا تھا۔ ایک دیو کے جسم میں پاگل کا دماغ۔ اس فرق کے ساتھ کہ اسے تو ہر شخص پاگل سمجھتا تھا لیکن ناپختہ ذہن کے نوجوان آدمی کو کوئی پاگل نہیں سمجھتا۔ اسے صاحبِ عقل و ہوش سمجھا جاتا ہے۔ اسی تصوّر کے مطابق اس کے سپرد بڑی بڑی ذمّہ داریاں کر دی جاتی ہیں۔ اور جب اس کے بعد

جسم اور ذہن

---

[1] اس خط میں ذہن یا ذہنیت سے مراد (MIND) ہے اور پختگی کا لفظ اس مفہوم میں استعمال ہوا ہے جس میں (MATURE) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ پختہ ذہن سے مراد ہوگا (MATURE MIND) اور ناپختہ سے (IMMATURE MIND)۔

اس سے بچّوں کی سی حرکتیں سرزد ہوتی ہیں تو ہم جھلا اٹھتے ہیں۔ یہ جھلّانا ہمارے خرمنِ امن وسکون میں گویا پہلی چنگاری ہوتی ہے۔ اس کے بعد اس سے اختلاف ہوتا ہے۔ اختلاف منازعہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ منازعہ بڑھ کر فساد بن جاتا ہے۔ وہ جوان جسم کا بچہ نہ اپنی جگہ چھوڑنا چاہتا ہے اور نہ اپنی روش بدلنا۔ روش کا بدلنا درحقیقت اس کے بس میں ہی نہیں ہوتا۔ اگر ہم نے اسے ایسے اختیارات دے رکھے ہوں جنہیں ہم آسانی سے واپس نہ لے سکیں تو ہماری بے بسی، زہر بن کر ہمارے رگ وپے میں سرایت کر جاتی ہے۔ ہم اندر ہی اندر کُڑھتے رہتے ہیں لیکن کر کچھ نہیں سکتے۔ اگر اس کے مقابلہ میں ہمارے پاس بھی قوت ہوتی ہے تو پھر دونوں قوتوں کا ٹکراؤ ہوتا ہے جس سے معاشرے میں جہنم کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں۔ یہی شعلے آگے بڑھ کر عالمگیر جنگ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ آئے دن کے لڑائی جھگڑے۔ یہ سر پھٹول، یہ خون خرابے، یہ وحشت اور درندگی کے مظاہرے، یہ سب کیا ہیں! اسی اصل کی شاخیں کہ جسم جوان ہو جاتے ہیں اور ذہن بچّوں کا سا ناپختہ رہتا ہے۔ اگر بچّے کو مناسب غذا ملتی جائے تو اس کا جسم خود بخود بڑھتا جاتا ہے۔ ہماری بھول یہ ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ جسم کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن میں پختگی بھی از خود آجاتی ہے۔ یہ غلط ہے۔ ذہن میں پختگی پیدا کرنے کے لئے بڑی محنت درکار ہوتی ہے۔ اس کے لئے تعلیم وتربیت کے خاص اہتمام کی ضرورت ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے طاہرہ بیٹی۔ جو میں تمہیں بار بار کہتا رہتا ہوں اور کبھی کبھی اسے محسوس بھی کرتا ہوں کہ کہیں میرا اس طرح برابر کہتے رہنا تمہیں ناگوار ہی نہ گزرے، لیکن

بچے کی تربیت

یہ بات ہی ایسی ہے کہ اس کے باوجود میں تمہیں برابر کہتا رہوں گا کہ) تم جاوید میاں (اللہ اسے ہر آفت سے محفوظ رکھے) کے جسم کی پرورش کی طرف تو اس قدر توجہ دیتی ہو لیکن اس کے ذہن کی تربیت کے لئے کچھ نہیں کرتیں۔ تم زیادہ سے زیادہ یہی کہو گی کہ میں اسے بدتمیز بچّوں کے پاس بیٹھنے نہیں دیتی۔ بری عادتوں والے بچّوں کے ساتھ کھیلنے نہیں دیتی۔ یہ ٹھیک ہے۔ اس سے اس میں بری عادتیں پیدا نہیں ہوں گی۔ لیکن کیا تم سمجھتی ہو کہ جس بچّے میں بری عادتیں پیدا نہ ہوں اس میں اچھّی عادتیں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم زبان سے ایسا کہو یا نہ کہو، غیر شعوری طور پر تمہارے دل میں بھی یہی خیال جاگزیں ہے کہ بچے کو اگر بری باتوں سے محفوظ رکھا جائے تو اس کے دل ودماغ کی تعمیر "فطرت" کے عین مطابق ہوتی جائے گی اور وہ اس طرح دنیا بھر کی خوبیوں اور بھلائیوں کا پیکر بن جائیگا۔ یہ خیال غلط ہے۔ "فطرت" کے متعلق میں سلیم میاں کے ایک خط میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں[1]۔ غالباً تم نے وہ خط دیکھا ہوگا۔ لیکن اس میں بات کچھ فلسفیانہ

---

[1] دیکھئے "سلیم کے نام خطوط" میں ستر ہواں خط۔

سی تھی اس لئے شاید تم اچھی طرح سے سمجھ نہ سکی ہو۔ اس لئے تم اسی بات کو ایک اور انداز سے سمجھو۔ تم نے بچوں کو دیکھا ہے۔ (اور جاوید میاں کی تو ایک ایک نقل و حرکت تمہاری آنکھوں کے آئینے میں عکس اور دل کی لوح پر نقش ہے) تم غور کرو کہ جب یہ (پیدا ہونے کے بعد) ہنوز خارجی اثرات سے محفوظ تھا تو اس کی "فطرت" کیا تھی؟ سب سے پہلے تو یہ کہ بالکل جاہل تھا۔

بچے کی فطرت!

اُسے علم تھا تو اتنا ہی جتنا (مثلاً) بکری کے بچے کو ہوتا ہے۔ بھوک لگی تو دودھ پی لیا، اس کے بعد سو گئے۔ دودھ ملنے میں ذرا دیر ہوئی تو لگے ممیانے۔ اس سے ذرا آگے بڑھے اور ہاتھ پاؤں ہلانے کی طاقت آئی تو بکری کے بچے جتنا بھی علم نہ رہا۔ بکری کا بچہ بھوک سے مر رہا ہو اور اس کے پاس ہی سبز مرچوں کا ڈھیر لگ رہا ہو۔ کیا مجال، جو وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ جائے، لیکن انسان کے بچے کی یہ حالت ہے کہ مرچ ہاتھ میں آئی تو وہ منہ میں، نمک کی ڈلی اُٹھائی تو وہ منہ میں۔ مٹی۔ راکھ۔ چونا۔ کوئلہ۔ الا بلا جو ہاتھ میں آیا جھٹ منہ میں۔ تمہیں یاد ہے کہ میاں صاحب جب پیسہ نگل گئے ہیں تو وہ خود اور ہم سب کس مصیبت میں پھنس گئے تھے! کبھی تم نے بکری کے بچے کو بھی پیسہ نگلتے دیکھا ہے؟ جب یہ ذرا گھٹنوں چلنے لگے ہیں تو اور پریشانی بڑھی تھی۔ وہ آگ میں ہاتھ ڈال دیا۔ وہاں سے بچایا تو پانی کے ٹب میں جا گرے۔ وہ تو یوں کہو کہ اللہ کو ان کی زندگی اور ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک منظور تھی، جو آنی کی نظر پڑ گئی ورنہ۔۔۔ (میں بٹیا! گئی بات کاہے کو زبان پہ لاؤں، اللہ ہر صاحب اولاد کو ایسی انہونی آفتوں سے محفوظ رکھے) اس سے ذرا آگے بڑھے اور چلنا پھرنا، بھاگنا دوڑنا سیکھا تو اور آفت آئی۔ کبھی خود کوٹھے سے گر رہے، کبھی ساتھی کو دھکا دے کر گرا دیا۔ جو چیز ہاتھ میں آئی اسے اُٹھا پھینکا۔ یہ پرچ ٹوٹی۔ وہ پیالی گرائی۔ جو چیز دوسرے کے ہاتھ میں دیکھی۔ اس سے جا چھینی۔ اس نے نہ دینا چاہی تو کسی کو دانت سے کاٹا۔ کسی کو ناخنوں سے لہولہان کر دیا۔ اس مہترانی کے لڑکے کی تو آنکھ پھوٹتے پھوٹتے بچی تھی۔ توڑنا پھوڑنا، چھیننا، جھپٹنا، مارنا پیٹنا۔ یہ ہوتی ہے بچے کی "فطرت" جسے وہ کسی سے سیکھتا نہیں بلکہ جو اس کے اندر سے از خود پیدا ہوتی ہے۔ نفسیاتی طور پر دیکھو تو بچہ بڑا حاسد ہوتا ہے۔ یہ جو تم ہر خط میں لکھتی ہو کہ جاوید ننھی بیچاری کو بری طرح پیٹتا رہتا ہے تو اس کی وجہ بھی وہی حسد کا جذبہ ہے۔ ننھی کی پیدائش سے پہلے سب کا پیار اکیلے جاوید میاں کے لئے تھا، اس میں کوئی دوسرا شریک نہ تھا۔ ننھی آئی تو انہوں نے اسے اپنی مملکت میں شریک تصور کر لیا۔ اب یہ ہر وقت اس بیچاری کو اس مملکت سے نکالنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ بچہ ہر ایک

کی توجّہ کا مرکزِ واحد بننا چاہتا ہے۔ وہ 'SELF CENTRED' رہنا چاہتا ہے۔ اب ننّھی ذرا بڑی ہوگی تو تم دیکھو گی کہ وہ عام طور پر بیمار رہا کرے گی۔ تمہیں معلوم ہے کہ ایسا کیوں ہوگا؟ وہ جاؔوید کا مقابلہ طاقت سے تو کر نہیں سکے گی اس لئے وہ کمزور اور بیمار رہ کر سب کی توجّہ کو اپنی طرف مرکوز کرے گی۔ وہی 'SELF CENTRED' ہونے کا جذبہ۔ یہ ہے طاہرہ بیٹی! النقطہ اس انسانی بچّے کا جسے خارجی اثرات سے محفوظ رکھ کر اس کی اپنی اُفتاد پر چھوڑ دیا جائے۔ تم کہتی ہو کہ تم بڑی احتیاط کرتی ہو کہ جاؔوید میاں بدتمیز بچّوں کے ساتھ کھیلے نہیں تاکہ اس میں بُری عادتیں نہ پیدا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر تم اس کی پرورش تھرماس (THERMOS) کے اندر رکھ کر کرو تو بھی اسمیں وہ عادتیں ابھریں گی جن کا ذکر اُوپر کیا گیا ہے؟ یہی عادتیں کچھ کم بُری ہیں؟ اب تم سوچو کہ اگر بچّوں کو (بقول تمہارے) بری عادتوں سے بچا بھی لیا جائے اور وہ مذکورہ بالا ذہنیت لے کر جوان ہو جائیں تو معاشرے میں اس قسم کے نوجوان کس قسم کے افراد بنیں گے؟ میں نہیں سمجھتا کہ ان کے لئے مجرم (CRIMINAL) کے علاوہ کوئی اور لفظ بھی موزوں ہو سکتا ہے۔ یہ ہیں بیٹی! وہ افراد جن پر ہمارا معاشرہ بالعموم مشتمل ہے۔ وہ نوجوان (خواہ مرد ہوں خواہ عورتیں)، کہ عمر نے جن کے جسموں کو بڑا کر دیا ہے لیکن جن کے اندر ذہنیت (MIND) بچّوں کی سی ہے۔ ان ہی میں سے کچھ اقتدار کی کرسیوں پر متمکّن ہو جاتے ہیں۔ کچھ مذہبی مسندوں پر براجمان، کچھ تجارت کی منڈیوں کو سنبھال لیتے ہیں، کچھ صنعت و حرفت کے مرکزوں کو، کچھ آئین بنانے والے بن جاتے ہیں، کچھ جانے والوں کے مدح خواں، انہی کو دنیا مشاہیر اور ابطال سمجھنے لگ جاتی ہے۔ حالانکہ یہ عام طور پر "بیبیز نابالغ" ہوتے ہیں۔ پختہ جسم کے اندر پختہ ذہن (MATURE MIND) بہت کم دیکھنے میں آئے گا۔

تم کہو گی کہ ہم ان بچّوں کو اسی حالہ نہیں چھوڑتے۔ انہیں تعلیم بھی دیتے ہیں۔ لیکن ذرا سوچو کہ ہم انہیں تعلیم کس قسم کی دیتے ہیں؟ عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ بچّے کی تعلیم اس وقت شروع ہوتی ہے جب ہم اسے مدرسے بھیجتے ہیں۔ لیکن یہ غلط ہے۔ اس عمر تک تو بچّہ بہت کچھ سیکھ چکا ہوتا ہے۔ تم نے دیکھا ہے کہ جاؔوید میاں وہی زبان بولتے ہیں جو تمہارے گھر میں بولی جاتی ہے اور تمہارے پڑوس کا بچّہ وہ زبان بولتا ہے جو ان کے گھر میں بولی جاتی ہے۔ تم نے کبھی جاؔوید کو تختی کتاب دے کر اُردو سکھانے کے لئے نہیں بٹھایا۔ وہ تمہاری اُردو زبان کو بغیر سکھائے سیکھ گیا ہے۔ تو کیا تم سمجھتی ہو کہ جس دوران میں وہ بغیر سکھائے چپکے ہی چپکے اُردو بولنا سیکھ رہا تھا اس وقت اور کچھ نہیں سیکھ رہا تھا؟ وہ چپکے ہی چپکے ان تمام باتوں کو سیکھ رہا تھا جو تمہارے ہاں دن رات ہوتی تھیں۔ یہ تھی وہ تعلیم جسے وہ مدرسے جانے سے پہلے حاصل کر چکا تھا اور اس تعلیم کا سب سے پہلا اصول یہ

مشتمل تھا جسے اخلاقیات اور معتقدات کہا جاتا ہے۔ حیوانات میں اخلاقی ضابطہ (MORAL LAW)
نہیں ہوتا۔ یہ امتیاز صرف انسان کو حاصل ہے۔ لیکن ذرا سوچو طاہرہ! کہ اس اتنے بڑے امتیاز کی بنیاد کیا ہے؟
وہ تعلیم جسے بچہ چپکے ہی چپکے گھر کے اندر اخذ کر لیتا ہے (جیسا کہ میں نے تمہیں پہلے بھی ایک خط میں لکھا تھا) ایک
جینی کے بچے کو گوشت کے تصور سے متلی ہو جاتی ہے اور مسلمان بچہ ہڈی کو شیرِ مادر کی طرح چوستا ہے۔ ایک ہندو
کو گائے کے گوشت کے نام سے جھرجھری آجاتی ہے۔ لیکن مسلمان کے نزدیک اس سے زیادہ لذیذ کباب اور
کسی گوشت کا نہیں ہوتا۔ ہمارے گھروں میں بچے چیونٹی مارنے کو بھی گناہ سمجھتے ہیں لیکن ٹھگوں کا بچہ بڑی بے تکلفی
سے انسانی جان لے لیتا ہے۔ یہ ہے بنیادی تعلیم جسے حاصل کرنے کے بعد بچہ اسکول جاتا ہے۔ ان اسکولوں میں
تعلیم کس قسم کی ملتی ہے، اس کا اندازہ لگانے سے پہلے تم ذرا اپنے پچھلے خط کو سامنے لاؤ جس میں تم نے لکھا تھا کہ جاوید
میاں کی غذا کا اس قدر خیال رکھا جاتا تھا، لیکن اس پر بھی اس کے جسم میں خون اور توانائی پیدا نہیں ہوتی۔ میں نے
تمہیں لکھا تھا کہ تم اسے کھانے کو تو سب کچھ دیتی ہو لیکن کبھی اس کا جائزہ بھی لیتی ہو کہ یہ کھانا پیٹ میں پہنچ کر ہضم
ہوتا اور جزوِ بدن بھی بنتا ہے یا نہیں۔ اگر یہ جزوِ بدن نہیں بنتا تو ایسے کھانے سے فائدے کی بجائے اُلٹا نقصان ہوتا
ہے۔ یہی حالت ہماری تعلیم کی بھی ہے۔ ہماری تعلیم گاہوں میں بچے کے ذہن میں بہت سی معلومات (INFORMATION)
تو ٹھونس دی جاتی ہیں لیکن اس کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا کہ بچہ ان معلومات کو اپنے کیرکٹر کا جزو بنانے کے قابل
بھی ہے یا نہیں؟ ہماری تعلیم سیرت سازی نہیں سکھاتی، صرف معلومات بہم پہنچاتی ہے لہٰذا ہمارے نوجوانوں کا
نقشہ کچھ اس قسم کا ہوتا ہے کہ عمر کے لحاظ سے قد آور پورا جسم، اس میں ذہنیت بچے کی اور پشت پر معلومات
کا پلندا لدا۔ اب ظاہر ہے کہ اس ذہنیت کا نوجوان جس طرح اپنی دولت، قوت، اختیارات کو بچوں کی طرح استعمال

ہمارے نوجوان

کرے گا اسی طرح معلومات کے اس ذخیرے کا بھی استعمال کرے گا جسے اسکولوں اور کالجوں
میں اس کی پشت پر لاد دیا گیا ہے اب تم اس نوجوان کا تجزیہ کرو اسکے اجزائے ترکیبی یہ ملیں گے۔

(۱) عمر کے لحاظ سے بالغ لہٰذا ہمارے خیال کے مطابق اور قانوناً ہر قسم کی ذمہ داریاں اُٹھانے کے قابل۔

(۲) ذہنیت کے اعتبار سے بچہ جو ذمہ داری کے لفظ تک سے ناواقف ہوتا ہے۔

(۳) تعلیم کے لحاظ سے اسٹیشن کا قلی جو ایسے سامان کو اٹھائے لئے جاتا ہے جس میں اس کا اپنا کچھ بھی نہیں۔
اس کا حصہ صرف مزدوری ہے جو اسے اس سامان کی حمالی میں ملے گی۔ اور

(۴) عقائد و تصورات وہ جو اس نے اپنے گھر کے ماحول میں غیر شعوری طور پر اخذ کئے تھے اور جن کی تائید میں

اس کے پاس کوئی دلیل اور برہان نہیں۔ ایسے عقائد، فائدے مند ہونے کے بجائے اُلٹا نقصان رساں ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ عقائد نہ اس کے قلب کی گہرائیوں سے ابھرتے اور نہ ذہن کی روشنی میں پروان چڑھتے ہیں۔ یہ غیر شعوری طور پر اُن سے وابستہ رہتا ہے اور جونہی اس کے سامنے ایسے دلائل یا زندگی کے تقاضے آتے ہیں جن پر وہ عقائد پورے نہیں اُترتے تو یہ اس لبادے کو جھٹ سے اُتار پھینکتا ہے اور پھر ان کے خلاف اس کے دل میں نفرت اور بغاوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اگر اس میں اتنی جرأت نہ ہو کہ اس بغاوت کا اظہار علانیہ کر دے تو اس کا سینہ منافقت کی آتشِ خاموش کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ جس کے تباہ کن نتائج بڑے دُور رس ہوتے ہیں۔

ماں کے فرائض

اب تم نے سمجھا طاہرہ! کہ بچے والی ماں پر کیا کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ لیکن ان ذمہ داریوں کو وہ مائیں کیا سمجھ سکیں گی جنہوں نے بچے کی غذا کے لئے گلیکسو کا ڈبہ منگا لیا۔ تربیت کے لئے جاہل آیا ملازم رکھ لی اور تعلیم کے لئے نرسری اسکول میں بھیجدیا۔ اور خود یہ کہہ کر کلبوں میں گھومنا شروع کر دیا کہ کیا کیا جائے بیکار وقت ہی نہیں کٹتا۔ یا جدید فیشن کے مطابق کسی اصلاحِ معاشرہ کی انجمن (SOCIAL WELFARE SOCIETY) کی ممبر بن گئیں اور قوم کی اخلاقی پستی پر لیکچر دینے شروع کر دیئے۔ ایک فرض شناس ماں کے لئے تو ایک بچے کی پرورش، تعلیم اور تربیت کا کام اتنا ہوتا ہے کہ وہ اسے کسی دوسری طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہیں دیتا۔ قرآن نے جب کہا تھا کہ فطری تقسیم کار کی رُو سے اکتسابِ رزق مرد کے ذمہ ہے اور یہ اس کا فریضہ ہے کہ دیکھے کہ بیوی کی تمام ضروریات پوری ہو رہی ہیں تو یہ اس لئے نہیں تھا کہ وہ عورت کو اپاہج یا مرد کا معاشی غلام بنانا چاہتا تھا۔ اس نے یہ اس لئے کہا تھا کہ وہ جانتا تھا کہ ایک فرض شناس ماں کو اکتسابِ رزق کی فرصت ہی نہیں مل سکتی۔ لہٰذا بیٹی! تمہیں ہر روز یہ دیکھنا ہوگا کہ جس رفتار سے بچے کے جسم کی پرورش ہو رہی ہے اور اس کا قد اور اعضاء بڑھ رہے ہیں۔ اسی رفتار سے اس کا ذہن (MIND) پختہ (MATURE) ہوتا جا رہا ہے یا نہیں۔ اگر ایسا نہیں ہو رہا تو سمجھ لو کہ یہ بچہ بڑا ہو کر اپنے لئے مصیبت اور معاشرہ کے لئے وبالِ جان بن جائے گا۔ یاد رکھو! انسانی بچہ میں صلاحیتیں اَن گنت ہوتی ہیں اور ان کی تکمیل کے لئے کوئی آخری حد مقرر نہیں ہوتی۔ اگر ہم ساری عمر اُن کی نشو و نما کرتے رہیں تو وہ آگے ہی آگے بڑھتی جائیں گی۔ اب تم سوچو کہ جس بچے کی صلاحیتیں دبی کی دبی رہ جائیں کیا معلوم انسانیت اس کے کس قدر بیش بہا جوہروں سے محروم رہ جائے گی۔

ناپختہ ذہنیت

اب تم یہ پوچھو گی کہ یہ کس طرح سے معلوم ہو سکے کہ فلاں مرد (یا عورت) کی ذہنیت ناپختہ رہ گئی ہے؟ یہ معلوم کر لینا چنداں دشوار نہیں۔

(۱) جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ یہ کسی معاملہ کو اس طرح حل کر رہا ہے جس طرح بچے معاملات PROBLEMS کو حل کرتے ہیں تو سمجھ لو کہ اس کے بالغ جسم میں ذہن بچے کا ہے۔ اگر تم اس نگاہ سے جائزہ لو گی تو تمہیں نظر آجائیگا کہ جنہیں تم پختہ عمر کے مرد یا عورتیں سمجھتی تھیں وہ درحقیقت بچے ہیں۔ یہی ہیں وہ "بچے" جو معاشرہ کی بیشتر مصیبتوں کا موجب ہوتے ہیں۔

(۲) اگر تم کسی مرد یا عورت کو دیکھو کہ اسے عمر کے کسی حصّہ میں یہ اطمینان حاصل ہو گیا ہے کہ اُس نے کافی علم حاصل کر لیا ہے اور اب اسے مزید علم کی ضرورت نہیں تو سمجھ لو کہ وہ ذہن کے اعتبار سے بچّہ ہے۔ بچّہ ہر اسٹیج پر سمجھتا ہے کہ اس کا علم کامل ہے۔

(۳) بچّہ قانون سے واقف نہیں ہوتا، نہ ہی اس کا پابند رہنا چاہتا ہے۔ قانون کے معنی عدالت کا قانون نہیں۔ اس کے معنی ہیں یہ اصول کہ ہر کام کا ایک خاص نتیجہ مرتّب ہوتا ہے۔ انگریزی میں اسے کہتے ہیں (WHAT FOLLOWS WHAT) دین کی اصطلاح میں اسے قانونِ مکافات کہا جاتا ہے۔ دنیا میں صحیح نتائج تک پہنچنے کا یہی طریق ہے۔ اسے عُرفِ عام میں سائنٹیفک طریق کہتے ہیں۔ بچّہ اس طریق سے واقف نہیں ہوتا۔ اسے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے۔ اس کے نتائج کیا ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ اس کی باتوں میں منطقی تسلسل LOGICAL SEQUENCE ہوتا ہے اور نہ اس کے کاموں میں ربط والتزام۔ یہی چیز جب تم کسی بڑے میں دیکھو تو سمجھ لو کہ وہ صرف (غیر اختیاری طور پر) عمر میں بڑھ گیا ہے۔ ورنہ ذہن کے اعتبار سے وہیں کا وہیں ہے۔

(۴) انسان کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ وہ 'RATIONAL ANIMAL' ہے 'RATIONAL' کے معنی ہیں 'RATIO' کا حامل اور 'RATIO' کے معنی ہیں، صحیح صحیح تناسب و توازن۔ لہٰذا انسان کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی ہر بات میں صحیح صحیح تناسب اور ہر کام میں ٹھیک ٹھیک توازن ہو۔ بچّہ توازن اور تناسب سے واقف نہیں ہوتا۔ لہٰذا تم جس بڑے مرد یا عورت کو دیکھو کہ اسکی زندگی میں تناسب اور توازن نہیں، سمجھ لو کہ وہ ذہن کے اعتبار سے بچّہ ہے۔

(۵) بعض لوگوں کو تم نے دیکھا ہو گا کہ تم ان سے کوئی بات کرو۔ وہ دو تین منٹ تک تو اسے بڑے

غور سے سنیں گے لیکن اس کے بعد اس سے اُکتا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگ جائیں گے، ان کی انتہائی خواہش ہوگی کہ یہ بات کسی طرح ختم ہو اور کوئی دوسری دلچسپ بات شروع۔ یہ اسلیئے نہیں کہ دو تین منٹ کے بعد وہ بات دلچسپ یا ان کے مفیدِ مطلب نہیں رہی تھی۔ بات تو اسی طرح دلچسپ اور مفید تھی لیکن یہ کسی ایک بات پر زیادہ دیر تک اپنی توجہ کو مرکوز ہی نہیں رکھ سکتے۔ ان لوگوں کو تم دیکھو گی کہ یہ کسی کام کو تکمیل تک نہیں پہنچاتے۔ آج ایک کام شروع کیا اور اس میں اس جذب و انہماک سے مشغول ہو گئے کہ دیکھنے والوں نے سمجھا کہ یہ جب تک اسے ختم نہ کرلیں گے کھانا کھانے تک کے لیئے بھی نہیں اُٹھیں گے۔ لیکن دو چار دن کے بعد دیکھا کہ وہ اس کام کو چھوڑ کر کسی اور کام کے پیچھے لگے ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان کی ساری زندگی گزر جاتی ہے۔ ناکام اور نامراد۔ ان کے مختلف کاموں کو دیکھیئے تو کوئی یہاں پڑا ہے کوئی وہاں۔ یہ آدھا ختم ہوا تھا وہ تین چوتھائی۔ لیکن مکمل کوئی ایک بھی نہیں ہونے پایا۔ قابلیت ایسی کہ جو کام شروع کیا اس میں خاص ہنرمندی جھلکنے لگ گئی، لیکن طبیعت ایسی کہ کسی پروگرام کو تکمیل تک نہیں پہنچا سکے۔

سمجھ لو کہ یہ سن رسیدہ بزرگ بکسر "پیرِ نابالغ" ہیں، بالکل بچے۔ اس لئے کہ بچے کسی ایک کام پر زیادہ دیر تک ملتفت رہ ہی نہیں سکتے۔ ابھی یہ بات ہو رہی تھی، ابھی وہ ہونے لگی۔ ابھی وہ کھیل شروع کیا تھا ابھی اس پر آ گئے۔ اگر جسم کے ساتھ ساتھ بچہ کے ذہن کی پختگی نہ ہو تو اس کی یہ روش ساری عمر اس کے ساتھ رہے گی۔

یہاں اتنا اور سمجھ لو کہ یہ ضروری نہیں کہ کسی آدمی کی تمام صلاحیتیں ناپختہ رہی ہوں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ذہن کی ایک صلاحیت پختگی حاصل کر گئی ہو اور دوسری ناپختہ رہی ہو۔ اس قسم کے لوگ اور بھی زیادہ مشکل کا موجب بن جاتے ہیں۔ لوگ ان کی پختہ صلاحیت کو دیکھ کر انہیں پختہ ذہنیت کا انسان سمجھ لیتے ہیں۔ اور جب زندگی کے دوسرے گوشوں میں ان کی ناپختہ ذہنیت کا مظاہرہ ہوتا ہے تو اس وقت ان کی سمجھ میں نہیں آتا، کہ اسے کیا کہیے۔

(۹) تم نے بچوں کو دیکھا ہوگا کہ مٹی کا گھوڑا ٹوٹ گیا تو رو رو کر ہلکان ہو گئے، اور کسی نے غبارہ لا کر دے دیا تو خوشی سے اُچھلنے لگے۔ ان کی خوشی اور غم کے پیمانے بہت چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں، یہی کیفیت ان بڑے آدمیوں کی ہوتی ہے جن کی ذہنیت ناپختہ رہ جاتی ہے۔ ذرا سی مخالف بات ہوئی یا اسکے ہونے کا وہم گزرا تو اسطرح افسردہ ہو کر بیٹھے ہیں گویا ان کی ساری کائنات لٹ گئی ہے خود بھی آزردہ بیٹھے ہیں اور دوسروں کو بھی

آزردہ کر رہے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر رو رہے ہیں، دوسری طرف اگر ذرا سی خوشی کی خبر سنی تو اُچھل رہے ہیں اور اگر آپ ان کے ساتھ اسی پیمانے کے اوچھے پن کا ثبوت نہیں دے رہے تو شکایت ہوتی ہے کہ انہیں تو ہماری خوشی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔

(۷) بچوں کی یہ خصوصیت بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے انتقام میں عدل کو کبھی ملحوظ نہیں رکھتے۔ ذرا کسی پر بگڑے تو پوری قوت سے اس پر جھپٹ پڑے۔ یعنی ان کے نزدیک جرم اور سزا میں کسی نسبت کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ سزا سے ان کا مقصد اپنے جذبۂ انتقام کی تسکین ہوتی ہے اور بس۔ یہی حالت ان بڑے لوگوں کی ہوتی ہے جنکے پیکر میں ذہن بچوں کا سا ناپختہ ہوتا ہے۔ ان میں عدل (یعنی جرم اور سزا میں تناسب) کا احساس یا مادہ نہیں ہوتا۔ اسے عام طور پر "شاہانہ مزاج" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جب ان کے ہاتھ میں اقتدار آجاتا ہے تو جو شخص ان سے کسی بات میں ذرا سا بھی اختلاف رکھے۔ اسے کچلنے میں اپنی ساری طاقت صرف کر دیتے ہیں۔ اس میں عدل کا جذبہ کارفرما نہیں ہوتا، انتقام کا ہوتا ہے۔ وہ مخالف کی تباہی پر اس طرح خوش ہوتے اور اس میں فخر محسوس کرتے ہیں جسطرح بچّہ اپنے مخالف کو دھکا دے کر اپنے آپ کو فاتح و منصور تصوّر کرتا ہے۔

(۸) بچّے کی یہ کیفیت بھی ہوتی ہے کہ اس کے پاس دس چیزیں ہوں لیکن اگر کسی دوسرے بچّے کے پاس ایک چیز بھی ایسی ہے جو اس کے پاس نہیں تو وہ اپنی دس چیزوں پر کبھی مطمئن نہیں ہوگا، اس کی پوری کوشش ہوگی کہ اس بچّے کی وہ ایک چیز بھی اس کے پاس آجائے یا کم از کم اس جیسی چیز اسے مل جائے۔ جن بڑوں کی ذہنیت ناپختہ ہوتی ہے، ان کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ جو کچھ ان کے پاس ہوتا ہے وہ اس سے کبھی مطمئن نہیں ہوتے، ہمیشہ ان چیزوں کی ہوس میں رہتے ہیں جو ان کے پاس نہیں ہوتیں خواہ انہیں ان کی فی الواقعہ ضرورت ہو یا نہ ہو۔ چونکہ ہمارے زمانے میں اکثریت انہی "نابالغ بڑوں" کی ہے اس لئے مصنوعات کے سوداگران کے اس بچپن سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اشتہار بازی (ADVERTISEMENT) کے معنی ہی یہ ہیں کہ ان "بچوں" کو ہر وقت یہ بتایا جائے کہ تمہارے پاس یہ بھی نہیں اور وہ بھی نہیں۔ اسی میں بازار کی گرمی کا راز ہے۔ آجکل بہت کم چیزیں ضرورۃً خریدی جاتی ہیں۔ بیشتر ان چیزوں کی خرید ہوتی ہے، جن کے متعلّق اشتہارات سے یہ احساس پیدا کر دیا جاتا ہے کہ تمہارے پاس یہ بھی نہیں اور وہ بھی نہیں۔ تم طاہرہ! اپنے ملنے والیوں کے گھروں کو نگاہ کے سامنے لاؤ اور دیکھو کہ ان کے ہاں کتنی چیزیں ایسی رکھی ہیں جنہیں انہوں نے کبھی ایک دفعہ بھی استعمال نہیں کیا۔ یہ انکے بکسوں اور درازوں میں اسی طرح جمع رہتی ہیں جس طرح جاوید میاں کے

جوتے کے خالی ڈبے میں رنگارنگ کے شیشے اور چینی کے ٹکڑے، لوہے کی زنگ آلود سلاخ، ٹوپی کا پھندنا، سگریٹ کی خالی ڈبیا، مور کا پر، سلیٹ، پنسل، چاک کا ٹکڑہ، کاغذ کی کترن اور سورج مکھی کا سوکھا ہوا پھول نہایت احتیاط سے رکھے ہوتے ہیں اور وہ اس ڈبے ہی کو بھول چکا ہوتا ہے کہ کہاں رکھا ہے؛ اور پھر اسی قسم کی "متاع گراں بہا" کے جمع کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں، بچہ کی ذہنیت کی خصوصیات۔ جن لوگوں کی عمر کے ساتھ ساتھ ذہن کی پختگی میں اضافہ نہیں ہوتا ان میں یہی خصوصیات قائم رہتی ہیں اور (جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں) یہ چیز خود ان کے لئے مصیبت اور معاشرہ کے لئے فساد کا موجب بنتی ہے۔ لیکن سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ بڑے ہونے کے بعد اس روش میں تبدیلی پیدا کرنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ہمیں خود غیر شعوری طور پر اس غیر ذمہ دارانہ زندگی میں لذت ملتی ہے

بچے کی تربیت گاہ

یہی وجہ ہے کہ ہم بچپن کی زندگی کو انسانی زندگی کا بہترین حصہ قرار دیتے ہیں۔ اور پھر سے انہی سہانے دنوں کے لوٹ آنے کی آرزوئیں ہمارے سینے میں مچلتی رہتی ہیں۔ لہٰذا انسان کی صحیح تربیت بچپن ہی کے زمانے میں ہو سکتی ہے اور اس کے لئے بہترین تربیت گاہ بچہ کا گھر ہے جن گھروں میں اس نقطۂ نگاہ سے بچوں کی تربیت کا خیال رکھا جاتا ہے وہاں کے بچے شروع ہی سے خود اعتمادی، ذمہ داری، ہمدردی، محبت، ایثار، جرأت اور وسعتِ قلب کی خصوصیات لئے ہوئے پروان چڑھتے ہیں۔ جن گھروں میں تربیت اچھی نہیں ہوتی وہاں بچہ کو ابتدا ہی سے خارجی سہاروں کا خوگر بنا دیا جاتا ہے جس سے اس کے دل میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ یا اُسے بات بات پہ جھڑکی سے اس قدر خوف زدہ کر دیا جاتا ہے کہ اس میں جرأت اور صداقت کے جذبات نشوونما ہی نہیں پا سکتے۔ کہیں اسے ماں کا لاڈلا بنا دیا جاتا ہے جس سے وہ مردانہ خصائل سے محروم رہ جاتا ہے۔ اور کہیں وہ باپ کا منظورِ نظر بن جاتا ہے تو اس میں زندگی کی لطیف حسیات کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔ کہیں اس قسم کی باتیں کر کے کہ تمہارے ابا کی نوکری چھوٹ گئی تو کیا بنے گا؟ اور یہ مکان چھن گیا تو ہم کہاں جائیں گے، اسے بچپن ہی سے معاشیات کا غلام بنا دیا جاتا ہے اور کہیں اس کی ہر مانگ کو پورا کر کے اس کے ذہن میں اس خیال کو راسخ کر دیا جاتا ہے کہ طبعی ضروریات کا پورا ہو جانا ہی زندگی کا مقصد ہے، اس سے زیادہ مقصودِ حیات کچھ نہیں! کہیں اس کے دل میں یہ بات ڈال کر کہ تمہارے ابا سب سے اچھے اور

تمہارا گھر سب سے بہتر ہے، اس کی نگاہ کو نسل، وطن اور قومیت کے تنگ دائروں میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ اور کہیں اسے یہ بتا کر کہ دنیا میں کچھ بھی اچھا نہیں اسے انسانیت کے مستقبل سے مایوس اور زندگی کا نوحہ خواں بنا دیا جاتا ہے کہیں اسے قدم قدم پر "یہ کرو، وہ نہ کرو" کا پابند بنا کر چلتی پھرتی مشین بنا دیا جاتا ہے اور کہیں اسے بالکل آزاد چھوڑ کر اس کے دل سے قانون کا احترام اٹھا دیا جاتا ہے۔ کہیں اسے غلیظ اور کثیف ماحول میں رکھ کر اس کے دل سے تحسین جمال کے حسین جذبات فنا کر دیئے جاتے ہیں اور کہیں اسے یہ کہہ کر کہ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے سے اس کے کپڑے خراب ہو جائیں گے، اس کے دل میں دوسرے افراد سے نفرت اور خود ستائی کے جذبات کا تخم بو دیا جاتا ہے۔ کہیں اس کے کان میں یہ ڈال کر کہ "خطائے بزرگاں گرفتن خطا است" اسے اندھی تقلید کا خوگر اور انسان سے بھیڑ بنا دیا جاتا ہے اور کہیں اسے یہ کہہ کر کہ معاملات کے فیصلے کے لئے صرف اپنے دل سے پوچھا کرو اسے مستقل اقدار اور وحی کے غیر متبدّل اصولوں سے بھی بے نیاز کر دیا جاتا ہے۔

اس سے تم نے دیکھ لیا ہوگا طاہرہ! کہ انسانیت کی تشکیل میں گھر کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ جس قسم کا گھر ہوگا اسی قسم کی قوم پیدا ہوگی اور اسی سے تم سمجھ لو کہ ماں کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ ہیں، ماں ؎

سیرت اقوام را صورت گر است

یہی وجہ ہے کہ عربی زبان میں اُمّت کا لفظ ہی اُمٌّ سے نکلا ہے۔ جس کے معنی ماں ہیں۔ پیدائش کے اعتبار سے بچہ بالکل جاہل ہوتا ہے، ماں اسے علم دیتی ہے۔ وہ گونگا ہوتا ہے، ماں اسے زبان دیتی ہے۔ وہ بالکل غیر ذمہ دار ہوتا ہے، ماں اسے ذمہ داریوں کا احساس دلاتی ہے۔ اسکے سامنے صرف اپنا مفاد ہوتا ہے، ماں اسے بہن بھائیوں سے محبت کرنا اور دوسروں سے ہمدردی کرنا سکھاتی ہے۔ وہ ہر چیز کے جزو کو دیکھتا ہے، ماں اسے کل کو دیکھنا سکھاتی ہے۔ غرضیکہ پیدائش کے لحاظ سے بچہ صرف گوندھی ہوئی مٹی ہوتا ہے، ماں اسے جس قسم کے قالب میں چاہے ڈھال سکتی ہے۔

یہ ہیں بیٹی! اب تمہاری ذمہ داریاں۔ وہ ذمہ داریاں جو تم پر خود انسانیت کی طرف سے عائد ہوتی ہیں۔ خدا تمہیں ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق دے اور تم فخر سے کہنے کے قابل ہو سکو کہ میں

طاہرہ کے نام　　　　　　　　　　　　　　　　　　آٹھواں خط

نے نوعِ انسانی کے اس انبوہِ کثیر میں ایک ایسے فرد کا اضافہ کیا ہے جس پر انسانیت کو ناز ہوگا۔

اور ایسا کرنا ناممکن ہے جب تک تم قرآن سے راہنمائی نہ لو۔ اس لئے کہ انسانیت کی تشکیل صرف اسی کے قالب میں ہو سکتی ہے۔

دسمبر ۱۹۵۳ء

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طاہرہ کے نام نواں خط

(پردہ کے متعلق)

تم نے ٹھیک کہا طاہرہ! کہ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ۔ (عورتوں کی جتنی ذمہ داریاں ہیں ان کے مقابل میں اتنے ہی ان کے حقوق بھی ہیں (۲/۲۲۸) لیکن یہ آیت محض بغرض ثواب، تلاوت کے لئے رہ گئی ہے۔ ورنہ عملاً یہی ہو رہا ہے کہ حقوق سب کے سب مردوں کے ہیں اور ذمہ داریاں عورتوں کی۔ حتیٰ کہ عفت کی حفاظت (پاکبازی کی زندگی) کا تقاضا بھی عورت ہی سے کیا جاتا ہے، مرد کو کوئی نہیں پوچھتا اگر کسی کنواری لڑکی کے متعلق (خدانخواستہ) کوئی بات یونہی نکل جائے تو وہ ساری عمر کے لئے مردود قرار پا جاتی ہے اور کوئی شریف گھرانہ اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ لیکن انہی شریف گھرانوں میں جب لڑکے کے رشتے کے متعلق سوچا جاتا ہے تو بالعموم آغاز سخن اس طرح ہوتا ہے کہ لڑکے کی ماں، اس کے باپ سے گلہ کے طور پر کہتی ہے کہ "بیٹے کو کب تک اس طرح آوارہ ہونے دو گے۔ میں تمہیں کہتی رہی کہ اس کے لچھن اچھے نظر نہیں آتے۔ وہ آوارہ ہو رہا ہے، بُری صحبتوں میں بیٹھ رہا ہے۔ لیکن تم نے میری ایک نہ سُنی۔

مرد آزاد!

اب وہ آدھی رات تک باہر رہنے لگ گیا ہے اور نہ جانے کہاں کہاں جھک مارتا پھرتا ہے۔ اسے کہیں ٹھکانے لگاؤ۔ بالآخر کب تک سوچتے رہو گے؟ یعنی لڑکوں کا کھلے بندوں آوارہ ہو جانا کوئی معیوب بات نہیں۔ لیکن لڑکی بیچاری کے متعلق یونہی غلط بات کا مشہور ہو جانا بھی اسے زندہ درگور کر دینے کے لئے کافی ہے۔ یہ تو رہا بیاہ سے پہلے کا معاملہ اور بیاہ کے بعد؟ اگر بیوی کے متعلق میاں کو اتنا سا بھی معلوم ہو جائے کہ اس نے اس کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر قدم رکھا تھا (خواہ وہ اپنے میکے ہی کیوں نہ گئی ہو)، تو یہی جرم اس کی طلاق کے لئے "معقول وجہ" اور اس کی بدنامی کا "بیّن ثبوت" بن جانے کے لئے کافی ہے۔ لیکن اگر مرد نے کھلے بندوں آوارگی اختیار

کر لی، تو بھی اس کی شرافت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ لہٰذا جس معاشرہ میں (اور تو اور) عفت و عصمت کا تقاضا بھی عورت ہی سے کیا جائے۔ اور مرد اس سے بھی مستثنیٰ ہو۔ اس معاشرہ میں "وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ" کی قرآنی میزانِ مساوات کا ذکر ہی بے معنی ہے۔ لیکن قرآن کی رُو سے شرفِ انسانیت کی اس بنیادی شق (پاک دامنی) کا تقاضا جیسا عورت سے ہے ویسا ہی مرد سے بھی ہے۔ اگر حفاظتِ عصمت عورت کی ذمہ داری ہے تو وہ بطور اپنے "حق" کے مرد سے بھی اس کا تقاضا کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے جس طرح عورتوں کو تاکید کی ہے کہ وہ اپنی عفت کی حفاظت کریں۔ (وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ [۲۴/۳۱])

قرآن کا تقاضا

بعینہٖ اسی طرح اور انہی الفاظ میں مردوں سے بھی کہا ہے کہ وہ اپنی عفت کی حفاظت کریں۔ يَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ [۲۴/۳۰] بلکہ پہلے مردوں سے کہا ہے اور بعد میں عورتوں سے۔ اس نے جہاں مسلمان عورت کی یہ خصوصیت بتائی ہے کہ وہ اپنی عفت کی حفاظت کرتی ہے وہیں مسلمان مرد کی بھی یہ خصوصیت بتائی ہے کہ (وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ [۳۳/۳۵]) اور جس طرح اس حفاظت کی کوتاہی سے عورت مجرم قرار پاتی ہے اسی طرح مرد بھی مجرم قرار پاتا ہے۔ حتیٰ کہ دونوں کی سزا بھی یکساں ہے۔ (اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ [۲۴/۲]) امید ہے کہ اب تم نے سمجھ لیا ہوگا کہ قرآنی معاشرہ میں کس طرح عورت کی پاکبازی کے ساتھ مرد سے اس کی پاکبازی کا تقاضا بھی کیا جائے گا اور یوں وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ کا جیتا جاگتا منظر کس طرح سامنے آجائے گا۔

اب رہا تمہارا بنیادی سوال، سو مجھے اس سوال سے اتنی حیرت نہیں ہوئی جتنی حیرت اس سے ہوئی کہ تم نے اس استفسار میں اتنی دیر کس طرح سے کر دی اور پہلے ہی خط میں اس کے متعلق کیوں نہیں پوچھا۔ اس

پردے کا سوال

لئے کہ آجکل عورتوں کے نزدیک پردے سے زیادہ اہم سوال کوئی اور ہے ہی نہیں۔ مجھے جسقدر استفسارات عورتوں کی طرف سے موصول ہوتے ہیں ان میں کم و بیش نوّے فیصد پردے کے متعلق ہوتے ہیں اور (مستثنیات کو چھوڑ کر) وہ بھی یہ پوچھنے کے لئے نہیں کہ اس کے متعلق قرآن کا مسلک کیا ہے۔ بلکہ اس کا اطمینان کرنے کے لئے کہ وہ جس انداز کو اختیار کئے ہوئے ہیں وہ کس طرح عین مطابقِ اسلام ثابت ہو جائے! لیکن مجھے معلوم ہے کہ تمہارے استفسار کا محرک جذبہ یہ نہیں۔ معلوم نہیں مرحوم بھائی نے کس ساعتِ سعید میں تمہارا نام طاہرہ تجویز کیا تھا کہ تمہیں عفت

قلب و نگاہ کے ساتھ ساتھ تطہیرِ فکر و نظر کا بھی اس قدر وافر حصّہ ملا ہے۔ ملّت کو تمہارے جیسی بیٹیوں پہ جس قدر بھی ناز ہو کم ہے۔ فی الحقیقت رشکِ صد طور ہیں وہ گھرانے جن میں اس قسم کے درخشندہ و تابناک چراغ روشن ہوں۔ (بلا تمثیل) کَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ایک ایسے طاق کی مثل جس میں دیا نہیں بلکہ سپیدۂ سحر اپنی پوری نورانیت اور ٹھنڈک کو لئے جگمگ جگمگ کر رہا ہو۔ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ وہ دیا ایک صاف اور شفّاف بلوریں فانوس میں محفوظ رکھا ہو تاکہ وہ تمام خارجی اثرات سے محفوظ رہے۔ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ وہ فانوس یوں دکھائی دے گویا ایک چمکتا ستارہ ہے جس سے نور کی ندیاں رواں ہیں۔ اور اس سے سارا گھر نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ہو رہا ہو۔

گھروں میں بند رکھنا

پردے کے متعلق سب سے پہلے یہ سمجھ لو طاہرہ! کہ عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں بند کر دینا ایک سزا ہے جسے قرآن ان عورتوں کے لئے تجویز کرتا ہے جن سے کچھ بے حیائی کی بدعنوانیاں مترشح ہو رہی ہوں۔ یعنی وہ زنا کی مرتکب تو نہ ہوئی ہوں، البتہ ان سے ایسی حرکات ظاہر ہوں جو ناجائز جنسی تعلّق کی طرف لے جانے والی ہوں چنانچہ سورۂ نساء میں ہے:-

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا (۴/۱۵)

"تمہاری عورتوں میں سے جو ایسی حرکات کی مرتکب ہوں جو زنا کی طرف لے جانے والی ہوں تو اس پر چار آدمیوں کی گواہی طلب کرو۔ اور اگر وہ گواہی دے دیں تو انہیں گھر سے باہر آنے جانے سے روک دو۔ تا آنکہ انہیں موت آجائے یا قانونِ خداوندی ان کے لئے کوئی اور راہ پیدا کر دے"

اس سے یہ حقیقت تمہارے سامنے آگئی کہ عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں محبوس کر دینا جرمِ فحش کی سزا ہے۔ لہٰذا ہمارا مروّجہ پردہ جس میں عورتوں کو گھروں کے اندر قید رکھا جاتا ہے نہ صرف منشائے قرآنی کے

خلاف ہے بلکہ جرم ہے کیونکہ کسی بے گناہ کا حبس بے جا (ILLEGAL DETENTION) عرفاً اور شرعاً جرم ہے۔

کہا یہ جاتا ہے کہ ہم عورتوں کو مجبوراً گھر کے اندر بند نہیں رکھتے، وہ اپنی اُفتادِ طبیعت اور جذبۂ حیاداری کے ماتحت از خود گھروں کے اندر محبوس رہنا چاہتی ہیں۔ غور کرو کہ یہ دلیل کس قدر خود فریبی پر مبنی ہے۔ ہم شروع سے اپنی بچیوں کی پرورش و تربیت اس انداز سے کرتے ہیں کہ وہ قفس کے پرندے کی طرح، اس قید و بند کی زندگی کی خوگر ہو کر بڑی ہوتی ہیں اور اس کے بعد ہم اس اندازِ زندگی کو ان کی افتادِ طبیعت کا تقاضا کہہ کر، اس حبس دوام کے جواز میں بطور دلیل پیش کر دیتے ہیں۔

ایک ضمنی بات

سورۂ نساء کی جو آیت اُوپر درج کی گئی ہے اس کے متعلق ایک بات ضمناً سامنے آگئی جس کا تذکرہ فائدے سے خالی نہیں ہوگا۔ اگلے دنوں ہماری مجلس آئین ساز میں ایک غیر مسلم ممبر نے اعتراض کیا کہ تم وہ قرآنی نظام رائج کرنا چاہتے ہو جس میں زنا کی سزا سو دُرّے ہیں۔ اس پر ہمارے مسلمان ممبر اس قدر جھینپے اور شرمائے کہ ان کے بس میں ہوتا تو وہ قرآن سے اس قسم کی (معاذ اللہ) "وحشیانہ" سزا کی آیت نکال دیتے اور پھر معترض سے نہایت فخر اور سرفرازی سے کہتے کہ وہ پرانے زمانے کی باتیں ہیں، ہم نے قرآن کا جو نیا ایڈیشن چھپوایا ہے۔ اس میں اس قسم کی ازمنۂ مظلمہ (DARK AGES) کی کوئی وحشیانہ بات نہیں رکھی لیکن یہ تو ان بیچاروں کے بس میں نہیں تھا اس لئے اس کے جواب میں کہا کہ قرآن نے یہ شرط عائد کر دی ہے کہ زنا کا جرم ثابت کرنے کے لئے چار عینی شاہد ضروری ہیں (یعنی ایسے گواہ جو یہ کہیں کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے اس فعل کو مرتکب ہوتے دیکھا ہے) اور چونکہ یہ ناممکن ہے کہ اس فعل کے چار عینی شاہد مل سکیں۔ (کیونکہ ناجائز طور پر تو ایک طرف، کوئی شخص جائز جنسی عمل بھی کسی کی موجودگی میں نہیں کرتا)، اس لئے قرآنی ضابطۂ تعزیرات کے مطابق نہ زنا کا جرم ثابت ہو سکے گا اور نہ زانی اور زانیہ کے لئے اس قسم کی وحشیانہ سزا کی نوبت آئے گی۔ یہ کہہ کر، یہ ہمارے مسلمان ممبر بہت خوش ہوئے ہوں گے کہ ہم نے قرآن کو ایک اتنے بڑے اعتراض سے بچالیا۔ اب ان علم و بصیرت کے دشمنوں سے کون کہے کہ آپ نے قرآن کو اس اعتراض سے بچاتے بچاتے قرآن نازل کرنے والے خدا کو اس قسم کا قانون ساز بنا کر پیش کر دیا، جس پر ساری دنیا ہنسے گی۔ لیکن اس میں ان کا بھی کوئی قصور نہیں۔ ہمارے ہاں اس آیت کا ترجمہ ہی یہ کیا جاتا ہے کہ جو عورتیں جرم

زنا کی مرتکب ہوں ان کے مقدمے میں چار گواہ پیش کرو۔ اور پھر یہ سزا دو۔ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے۔ یہ آیت زنا کے جرم کے متعلق نہیں بلکہ بے حیائی کی حرکات کے متعلق ہے جو آخر الامر زنا کی طرف لے جاتی ہے بہر حال یہ تو ضمنی بات تھی۔ اب تم پھر اصل موضوع کی طرف آؤ۔

ہم نے دیکھ لیا ہے کہ قرآن کی رُو سے، عورتوں کو گھر کے اندر بند رکھنا بہت بڑا جرم ہے، لہٰذا اس قسم کا پردہ قرآنی پردہ نہیں ہے۔

میں نے تمہیں پہلے خط میں بتایا تھا کہ قرآن کی رُو سے مرد اور عورت کے فرائضِ زندگی میں تقسیم عمل کا اصول کارفرما ہے۔ مرد کے ذمّہ اکتسابِ رزق (حصولِ معاش) کا فریضہ عائد کیا گیا ہے۔ اور عورت کے ذمّہ اولاد کی پرورش اور تربیت کا اہم فریضہ۔ اب ظاہر ہے کہ ان فرائض کی ادائیگی کے لئے مرد کا میدانِ عمل معمولاً گھر سے باہر ہے اور عورت کا دائرہ عمل معمولاً گھر کے اندر۔ اس کے خلاف جانے سے مرد اور عورت کے فرائضِ حیات کی کماحقہٗ ادائیگی پر اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ نکمّے اور نکھٹّو مرد کے متعلق۔۔۔ کہا جاتا ہے کہ وہ تو عورتوں کی طرح گھر میں بیٹھا رہتا ہے۔ اس اصول سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ عام طور پر عورت کا مستقر گھر ہے اور اسے باہر ضرورۃً ہی جانا چاہیئے جس طرح عام طور پر مرد کا دائرہ عمل گھر سے باہر ہے اور وہ گھر پر ضرورۃً ہی آتا ہے۔ اسی بناء پر ارشاد ہوا کہ وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ (۳۳/۳۳) ان سے کہہ دو کہ ان کا مستقر ان کا گھر ہے اس لئے وہ معمولاً گھروں میں رہا کریں۔ اگرچہ یہ آیت رسول اللہ کی ازواجِ مطہرات کے متعلق آئی ہے اور اس سے قبل ان کے متعلق یہ بھی کہا گیا ہے کہ تم عام عورتوں جیسی نہیں ہو۔ لیکن اس سے یہ اصول تو مستنبط ہوتا ہے کہ عورت کے فرائض کا مرکز گھر (HOME) ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی میں گھر (HOME) کو ایک بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ گھر کے معنی اینٹ پتھر کا مکان اور چولہا چوکا نہیں، اس سے مراد ہے مرد اور عورت کے لئے خوشگوار فضا اور پُرسکون ماحول، ان کے لطیف جذبات کے نشوونما پانے کا مقام، آنے والی نسل کی تعلیم و تربیت کا مرکز، ان کے لئے صحیح پرورش گاہ، یہ تربیت گاہ خاص طور پر عورت کے چارج میں رہتی ہے۔ یہ ہے "گھر کے مستقر" ہونے کا مفہوم۔

تصریحاتِ بالا سے دو باتیں سامنے آگئیں۔

(۱) عورتوں کو گھر کے اندر بند رکھنا اور انہیں باہر نکلنے نہ دینا، قرآن کی رُو سے سزا ہے۔ لہٰذا یہ قرآنی پردہ نہیں۔ اور

(۲) عورت کا مستقر گھر ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ عورت، گھر کے اندر کس طرح رہے اور گھر کے باہر کس طرح چلے پھرے؟ قرآن میں دونوں دوائر کے متعلق ہدایات دی گئی ہیں۔ لیکن قبل اس کے کہ میں ان قرآنی ہدایات کو بیان کروں، اس حقیقت کبریٰ کو پھر سامنے لے آؤ کہ قرآن کی رُو سے عصمت کی حفاظت، مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے پاکیزگیٔ سیرت کی بنیادی شرط ہے اور مومن بننے کا اہم تقاضا۔ اس کے نزدیک، اس گوہرِ بے بہا کے تحفظ سے بے احتیاطی نہ صرف انفرادی سیرت ہی کو داغدار بنا دیتی ہے بلکہ قومی تمدن و تہذیب کو بھی تباہ و برباد کر کے رکھ دیتی ہے۔ قرآن کا اندازِ تعلیم و تربیت یہ ہے کہ وہ اس قسم کے جرائم کی سزا مقرر کرنے

قرآن کا اندازِ تعلیم

پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ ان مواقع و اسباب کا سدِّباب کرتا ہے جو ان جرائم کے ارتکاب کا موجب بنتے ہیں۔ وہ یہ نہیں دیکھتا رہتا کہ چور چوری کرے تو پھر اسے جا پکڑوں، وہ ان راستوں پر پہرے بٹھا دیتا ہے جہاں سے چور کے آنے کا امکان ہو، یا یوں سمجھو کہ وہ چور کو نہیں مارتا بلکہ چور کی "ماں" کو مارتا ہے تاکہ چور پیدا ہی نہ ہونے پائے حفاظت عصمت کے باب میں بھی اس نے یہی انداز اختیار کیا ہے۔ اس نے زنا کی سزا مقرر کی ہے، حتیٰ کہ باعصمت شریف زادیوں کے خلاف تہمت تراشی کی بھی سزا لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے ایسی تدابیر بھی بتائی ہیں جن سے اس جرم کے امکانات و مواقع نہ پیدا ہونے پائیں۔ چونکہ بات سامنے آگئی ہے اس لئے مجھے ذرا زیادہ وضاحت سے سمجھا دینا چاہیئے (اور اس میں رسمی حجاب اور تکلف کو مانع نہیں ہونے دینا چاہیئے۔ کیونکہ تکلفات کے مصنوعی پردوں کی وجہ سے حقیقت نکھر کر سامنے نہیں آتی) بات یہ ہے، کہ انسان کے طبعی تقاضوں کے کئی

جنسی تقاضا

انداز ہیں۔ ایک تقاضا ہے سانس لینے کا جس پر زندگی کا دار و مدار ہے۔ اس تقاضے کی کیفیت یہ ہے کہ یہ نہ تو اپنے پیدا ہونے کے لئے تمہاری نیت یا ارادے کا محتاج ہوتا ہے۔ اور نہ ہی اس تقاضے کی تسکین کے لئے تمہیں عمداً کچھ کرنا پڑتا ہے۔ تم سوتے ہو یا جاگتے، بیٹھے ہو یا چلے جا رہے ہو، تم کچھ کر رہے ہو، تمہارا خیال کہیں ہو، سانس کی آمد و رفت کا سلسلہ از خود جاری رہتا ہے۔ تمہیں سانس لینے کے لئے نہ ارادہ کرنے کی ضرورت ہے، اور نہ ہی کسی عمل کی۔ البتہ سانس روکنے کے لئے کوشش (EFFORT) کی ضرورت پڑتی ہے۔

دوسری قسم کا تقاضا ہے، کھانے پینے کا۔ یہ بھی تمہارے خیال اور ارادے کا محتاج نہیں جب

معدے میں کچھ نہ ہو تو خود بھوک لگ جاتی ہے اور وہ بڑھتی چلی جاتی ہے اور تمہاری توجہات کو اپنی طرف مرکوز کر لیتی ہے حتیٰ کہ اگر تم کسی گہرے خیال میں مستغرق ہو تو ابتداءً بھوک کا احساس نہیں ہوتا لیکن جب اس کی شدت بڑھتی ہے تو تمہارے جذب و انہماک کے باوجود یہ تمہاری توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ یعنی یہ جذبہ تمہارے خیال اور ارادے کے بغیر بیدار ہوتا ہے۔

تیسری قسم کا تقاضا ہے جنسی تقاضا (SEXUAL URGE)۔ یہ تقاضا سانس لینے اور کھانے پینے کے تقاضے کی طرح از خود پیدا نہیں ہوتا۔ اسے بیدار کرنے کے لئے خیال اور ارادے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے کام میں اس طرح منہمک ہے کہ اسے دنیا جہاں کی کچھ خبر نہیں، تو اس حالت میں سانس کا عمل از خود جاری رہے گا اور بھوک بھی از خود لگے گی (اور اگر وہ شروع میں اس کی طرف توجہ نہیں دے گا تو کچھ وقت کے بعد، وہ اس کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرا کر چھین لے گی) لیکن یہ کبھی نہیں ہوگا کہ اس جذب و انہماک میں جنسی تقاضا بھی از خود اُبھر آئے اور اس کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لے۔ اس تقاضا کے اُبھرنے کا مدار خیال و ارادے پر ہے۔ لہٰذا تحفظِ عصمت کے لئے قرآن کرتا یہ ہے کہ وہ ایسے مواقع پیدا نہیں ہونے دیتا جو انسانی خیال اور توجہ کو جنسی ہیجان کی طرف پھیر دیں۔ یہ ہے وہ نقطہ ماسکہ جس کے گرد، پردے کا سارا سوال گردش کرتا ہے۔ اگر غیر مرد یا عورت کی طرف سے کوئی حرکت ایسی سرزد ہو جو فریقِ مقابل کی توجہ کو جنسی میلان کی طرف پھیر دے تو وہ حرکت روک دینے کے قابل ہے۔ اور اگر ایسا التزام ہو کہ اس قسم کی صورت پیدا نہ ہونے پائے تو معاشرے کا یہ انداز قرآنی منشا کے مطابق ہے۔ اس اصولی بحث کے بعد اب یہ دیکھو کہ قرآن اس باب میں کیا التزام کرتا ہے۔ پہلے گھر کے اندر کی زندگی کو لو۔ قرآن گھر کی خلوت (PRIVACY) کے قائم رکھنے کی تاکید کرتا ہے۔ اسی لئے وہ حکم دیتا ہے کہ:-

گھر کے اندر

"جب تم اپنے گھروں کے علاوہ کسی اور کے گھر جاؤ تو پہلے اندر جانے کی اجازت طلب کرو۔ اجازت مل جائے تو اہلِ خانہ کو سلامتی کی دعائیں دو۔ اگر اندر سے آواز نہ آئے تو کبھی اندر قدم نہ رکھو۔ اور اگر وہ کہیں کہ اس وقت معاف رکھئے تو فوراً واپس آجاؤ۔" ($\frac{24}{27-28}$)

اس کے بعد فرمایا کہ هُوَ اَزْكٰى لَـكُمْ ؛ لیعنی "یہ آدابِ معاشرت اس لئے سکھائے جاتے ہیں کہ ان کی پابندی سے تمہاری شرفِ انسانیت کی برومندی ہوگی۔"

اسی ضمن میں یہ بھی کہہ دیا کہ :۔

"اگر تمہیں کسی کے ہاں سے (بلکہ خود رسول اللہ کے ہاں سے بھی) کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کے پیچھے سے آواز دے کر مانگو"۔ (۳۳/۵۳)

اور اس کے بعد فرمایا۔ ذٰلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ "اس سے تمہارے اور گھر کے اندر کی مستورات کے دلوں میں پاکیزگی کے جذبات پیدا ہوں گے"۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ اگر کوئی غیر مرد باہر سے آواز دے تو عورتوں کو یہ نہیں چاہئے کہ گونگی بن کر بیٹھی رہیں۔ اس کی آواز کا جواب دیں۔ اس سے مناسب بات چیت کریں۔ لیکن :۔

یہ باتیں ایسی نرم اور لوچدار آواز میں نہ کرو کہ اگر مخالف کے دل میں جنسی میلان کا مرض ہے تو تمہاری آواز اس کے لئے جاذبیت کا موجب بن جائے۔ نہ ہی کوئی بات بے سلیقہ اور راستے سے ہٹی ہوئی ہو۔ ضروری اور مناسب بات، ایسی آواز سے کہ وہ بات چیت کی ضرورت پوری ہو جائے۔ لیکن انداز گفتار کشش و جاذبیت کا موجب نہ بن جائے"۔ (۳۳/۳۲)

نہ صرف گفتار میں ہی یہ انداز اختیار کریں بلکہ رفتار میں بھی۔ اس لئے کہ :۔

نہ تنہا عشق از گفتار خیزد
بسا ایں آتش از رفتار خیزد

لہٰذا :۔

وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِنْ زِينَتِهِنَّ (۲۴/۳۱)

"چلتے وقت اپنے پاؤں کو زمین پر اس انداز سے نہ ماریں کہ زیورات کی آواز، فریق مخالف کے خیال کو ان کی طرف کھینچ لینے کا موجب بن جائے"۔

دیکھا تم نے طاہرہ! قرآن کس طرح ایسے انداز اختیار کرتا ہے جن سے انسان کا خیال اور ارادہ جنسی میلان کی طرف آنے ہی نہ پائے۔ یہ تو رہا معاملہ ان مردوں کے ساتھ جو گھر سے باہر ہوں، اب گھر کے اندر آؤ۔ اس ضمن میں اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہئے کہ قرآن زیب و زینت کی پوری پوری اجازت دیتا ہے اس کے نزدیک آرائش و زیبائش، انسانی زندگی میں اضافۂ حسن کا موجب ہیں۔ اس لئے کسی کو حق نہیں کہ

زینت کی نمائش

انہیں حرام قرار دے۔ لیکن وہ عورت کی زیب و زینت اور آرائش و زیبائش کو اس کے خاوند کے سامنے نمایاں ہونے کی اجازت دیتا ہے یا ان کے سامنے جن کے دل میں، اس سے جنسی میلان پیدا نہ ہو۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ وہ :۔

اپنی زینت کو نمایاں نہ ہونے دیا کریں بجز اپنے خاوندوں کے یا اپنے باپ کے یا اپنے خسر کے یا اپنے بیٹوں کے یا اپنے خاوند کے بیٹوں کے یا اپنے بھائیوں کے یا بھتیجوں کے یا بھانجوں کے یا اپنی عورتوں کے یا اپنے غلاموں اور لونڈیوں کے (جو اس زمانے میں ہنوز گھروں کے اندر کام کاج کے لئے موجود رہتے تھے) یا مردوں میں سے ایسے ملازموں کے جو اس قدر بوڑھے ہو چکے ہوں کہ نکاح کی حاجت نہ رکھیں۔ یا ایسے بچوں کے جو ابھی عورتوں کے پردے کی باتوں سے واقف نہ ہوں۔" (24/31)

یہ اس لئے کہ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ تاکہ تم کامیابی و کامرانی کی زندگی بسر کرو اور تمہارے معاشرہ کی صلاحیت بخش کوششیں ثمر بار و بارو مند ہوں۔ حتیٰ کہ بچوں اور غلاموں (ملازموں) کے متعلق بھی کہہ دیا کہ "وہ صبح تمہارے اٹھنے سے پہلے اور دوپہر کے وقت جب تم آرام کر رہے ہو اور رات کے وقت، اگر تمہارے کمرے میں آنا چاہیں تو اجازت لے کر آیا کریں" (24/58) ضمناً اس بات کو بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ آیت (24/31) میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اپنی زینت و زیبائش کو ان عورتوں کے سامنے بھی نمایاں نہ کریں جن کے متعلق پورا پورا علم نہ ہو کہ وہ کیسی ہیں اس لئے کہ بہت سی خرابیاں غیر عورتوں کے ذریعہ ہی پھیلتی ہیں۔

گھر سے باہر

یہ تو رہا گھر کے اندر کا معاملہ۔ اب گھر سے باہر آئیے۔ یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں محبوس و محصور رکھنا سزا ہے۔ اس لئے عند الضرورت عورتوں کے لئے گھر سے باہر نکلنے میں کوئی حرج نہیں۔ جب عورتیں باہر آئیں گی تو لامحالہ وہاں مرد بھی ہوں گے۔ لہٰذا عورتوں سے کچھ کہنے سے پہلے قرآن، مردوں کو مخاطب کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ دیکھو! یہاں عورتیں بھی پھر رہی ہیں اس لئے انہیں گھورتے نہ پھرو۔ اپنی نگاہیں نیچی کر کے چلو۔ سورۂ نور میں ہے۔ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ "مومن مردوں سے کہہ دو کہ وہ معمولاً اپنی آنکھیں نیچی رکھ کر چلا کریں اور انہیں بے باک نہ ہونے دیں"۔ یہ عفت کی حفاظت کے لئے ضروری ہے اور جیسا کہ تم جانتی ہو۔ عفت کی حفاظت

مومن کی بنیادی خصوصیت ہے۔ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ آنکھیں جہاں دل کے پیغامات باہر پہنچاتی ہیں وہاں باہر کے پیغامات کے دل تک پہنچانے کا سب سے بڑا راستہ بھی یہی ہیں اس لئے اس راستہ کے پھاٹک بلا محابا کھلے نہ رکھو۔ ذٰلِكَ أَزْكَىٰ لَهُمْ اس سے ان کے شرف انسانیت کی نشو و بالیدگی ہو گی۔ لیکن انہیں سمجھا دو کہ اس حکم پر محض میکانکی طریق پر (MECHANICALLY) عمل نہ کریں بلکہ نظر ہمیشہ اس بلند مقصد پہ رکھیں جس کی خاطر نگاہوں کی پاسبانی ضروری قرار دی گئی ہے۔ یاد رکھو! خدا اس سے اچھی طرح واقف ہے کہ تم محض میکانکی طور پہ کیا کچھ کرتے ہو۔ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا يَصْنَعُونَ (۲۴/۳۰) ان راستوں پر اس طرح پہرے بٹھا کر پھر عورتوں سے کہا کہ اب تم باہر آسکتی ہو۔ لیکن کس انداز سے؟ وَقُل لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ "مومن عورتوں سے کہدو کہ وہ بھی معمولاً اپنی آنکھیں نیچی رکھ کر چلیں" اور انہیں بیباک ہونے دیں اور اسطرح معاشرہ میں تحفظ عفت کا التزام رکھا کریں۔ (وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ) یہاں تک تو مردوں اور عورتوں کے لئے یکساں حکم ہوا۔ لیکن عورتوں کے لئے اس سے آگے کچھ اور بھی ضرورت تھی۔ اس لئے کہا کہ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا۔ "وہ اپنی زینت و آرائش کی نمائش نہ کریں۔ بجز ان مقامات زینت کے جن کا ظاہر ہونا ناگزیر ہے اس مقصد کیلئے انہیں چاہیئے کہ وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ (۲۴/۳۱) اپنی سر کی چادر کو سینوں پر ڈال لیا کریں۔ دوسری جگہ ہے کہ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِن جَلَابِيبِهِنَّ (۳۳/۵۹) "وہ اپنی "جلباب" کو سمٹا کر قریب کر لیا کریں"۔ جلباب ایسا کپڑا ہے جسے دوسری جگہ جاتے وقت اوپر سے پہن لیا جائے۔ اب ظاہر ہے کہ خواہ سر کی چادر سینہ پر ڈال لی جائے اور خواہ اوپر سے جلباب پہن لی جائے، اس میں منہ چھپانے کا کوئی قرینہ نہیں۔ ویسے بھی اگر منہ چھپانا ضروری ہوتا تو پھر (کم از کم) مردوں کو "غض بصر" (نگاہیں نیچی رکھنے) کا حکم کیوں دیا جاتا۔ کہہ دیا جائے گا کہ جب زینت کے چھپانے کا حکم ہے تو چہرہ سب سے زیادہ نمایاں مقام زینت ہے، اس لئے اس کا چھپانا سب سے مقدم ہے۔ لیکن جب قرآن نے خود ہی کہہ دیا کہ مقام زینت کو چھپاؤ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا۔ بجز ان مقامات کے جن کا ظاہر ہو جانا ناگزیر ہو۔ اور اس کے بعد مقامات زینت کے چھپانے کا جو طریقہ بتایا وہ ایسا ہے جس میں چہرہ کھلا رہتا ہے تو پھر چہرے کا چھپانا منشائے قرآنی نہیں ہو سکتا۔

واضح رہے کہ قرآن نے خمار اور جلباب کا اس لئے ذکر کیا ہے کہ اس زمانے میں عرب میں ان کا

رواج تھا۔ ہمارے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم ٹھیک ٹھیک اس زمانے کے جلباب اور خمار کے مطابق ہی چادریں اور اوڑھنیاں استعمال کریں۔ قرآن کا مقصد یہ ہے کہ باہر نکلتے وقت زینت اور آرائش کو مستور رکھا جائے۔ اس مقصد کے لئے جس قسم کا بھی کپڑا ہم مناسب سمجھیں، اختیار کر سکتے ہیں۔ لباس کی وضع قطع اور تراش خراش کا تعلق انداز معاشرت سے ہے جو زمانے کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ مطلب قرآنی مقصد کے حصول سے ہے۔ یعنی زینت کے چھپانے سے۔

تبرّج

یہ تو رہا اس سوال کا جواب، کہ عورت باہر کس انداز سے نکلے۔ لیکن قرآن نے خود ہی یہ بھی بتا دیا کہ اس طرز و طریق رفتار و گفتار کی غایت کیا ہے؟ وہ غایت یہ ہے کہ **وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ** (۳۳/۳۳) "ان سے کہہ دو کہ اپنے حسن و زینت کو نمایاں نہ کرتی پھریں جس طرح (اسلام سے پہلے) عہد جاہلیت میں ہوتا تھا"۔ اس سے ظاہر ہے کہ تَبَرُّجْ، جاہلیت کا شعار تھا اور قرآن نے اس سے روکا ہے۔ تبرّج، بُرج سے ہے اور بُرج کے معنی واضح ہیں، یعنی کسی چیز کو ابھارنا، بلند کرنا۔ اس کی نمود کرنا۔ اس کے برعکس، حیا ہے جس کے معنی سکڑنے اور سمٹنے کے ہیں (TO SHRINK)۔ چنانچہ تبرّج میں نمود و ابھار ہے اور حیا میں سکڑنا اور سمٹنا۔ قرآن نے تَبَرُّجْ (نمود) سے منع کیا اور حیا۔ (سمٹنے) کی تلقین کی ہے۔ لہٰذا کوئی ایسا انداز جس سے نمودِ حسن اور نمائش زینت مقصود ہو یا وہ اس کا موجب بن جائے، قرآنی منشا کے خلاف ہے۔

پھر اسے بھی یاد رکھو کہ جو نقشہ گھر سے باہر کا ہے۔ وہی نقشہ گھر کے اندر غیر مردوں کی موجودگی میں بھی ہوگا۔ اس لئے ان عزیزوں کے سواجن کا ذکر (۲۴/۳۱) میں اوپر گزر چکا ہے، دوسروں سے زینت کا چھپانا ہر مقام پر ضروری ہے۔ لہٰذا گھر کے اندر بھی عورتوں کو غیر مردوں کی موجودگی میں بیٹھنا منع نہیں۔ لیکن انہی شرائط کے ساتھ جو ان کے لئے باہر جانے کی صورت میں ضروری ہیں۔

اب رہا یہ کہ وہ کون کون سی ضروریات ہیں جن کے لئے مردوں کا عورتوں کو اور عورتوں کا مردوں کو نگاہ اٹھا کر دیکھ لینا معیوب نہیں۔ تو قرآن (اپنے عام اصول تعلیم کے مطابق) ان امور کی جزئیات خود متعین نہیں کرتا۔ ان تفاصیل کو وہ انسانی علم و بصیرت اور حالات کے اقتضاء پر چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن اتنا تو قرآن سے واضح ہے کہ بیوی کے انتخاب کے لئے اس کی اجازت ہے۔ اس لئے کہ نکاح کے سلسلہ میں قرآن نے مَا طَابَ

ایک دوسرے کو دیکھنے کی اجازت

لَـكُمْ مِّنَ النِّسَـآءِ (۴/۳) کہہ کر اس کی خود ہی صراحت کر دی ہے۔ یعنی عورتوں میں سے جو تمہیں پسند آئیں ان سے شادی کرو۔ اور خود نبی اکرمؐ کے متعلق ارشاد ہے کہ "تو اپنی موجودہ بیویوں کے بعد کسی اور عورت سے شادی نہیں کر سکتا، نہ ہی ان کی جگہ کوئی دوسری بیوی لا سکتا" وَلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ (۳۳/۵۲) "خواہ ان کا حسن تمہیں کتنا ہی اچھا کیوں نہ لگے"۔ لیکن مقصد شادی کے لئے انتخاب ہو یا کوئی اور ضرورت، مرد اور عورت دونوں کے سامنے، ہر وقت یہ خیال رہنا چاہئے کہ ان سے کوئی حرکت ایسی سرزد نہ ہونے پائے جو فریق مخالف کے دل میں غلط آرزو کی خفیف سی بیداری کا موجب بھی بن سکے۔ اس لئے کہ خدا يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِى الصُّدُوْرُ (۴۰/۱۹) "تمہاری نگاہوں کی خیانت اور دل کی چوری تک سے بھی واقف ہے"۔

یاد رکھو! فحش کاری صرف جنسی اختلاط ہی کا نام نہیں۔ اس کا خیال و ارادہ بھی فحش کاری ہے اس لئے کہ اس کا بنیادی اثر انسان کی سیرت پر پڑتا ہے اور تعمیرِ سیرت ہی تمام قیود و ضوابط کا مقصود ہے۔

٭ ٭ ٭

اب رہا تمہارا سوال کہ بحالاتِ موجودہ اس باب میں کیا کیا جائے؟ سو پہلی بات تو یہ ہے کہ جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے، اس سے یہ حقیقت سمجھ میں آگئی ہوگی کہ مردوں اور عورتوں کے باہمی تعلقات کے سلسلہ میں قرآن کا مقصود اور منشاء کیا ہے۔ اس کا منشاء عفّت کی حفاظت ہے (مردوں اور عورتوں دونوں میں)۔ قرآن کا یہ منشاء سمجھ لینے کے بعد، تمہارے اس سوال کے جواب میں کہ تمہیں انفرادی طور پر کیا کرنا چاہئے، میں وہی کہوں گا جو علامہ اقبالؒ نے مسلمان سے کہا تھا:-

اے مسلماں! پوچھ اپنے دل سے، مُلّا سے نہ پوچھ!

ہمیں کیا کرنا چاہیئے!

اور اگر تمہارا سوال یہ ہے کہ موجودہ معاشرہ میں ہمیں کیا کرنا چاہئے جس سے قرآن کا منشاء پورا ہو جائے، تو یہ وہ سوال ہے جس کا جواب میرے لئے بڑی مشکل کا موجب بن جایا کرتا ہے۔ یعنی سوال یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ سمجھ چکے ہوں کہ فلاں باب میں قرآن کا منشاء یا حکم کیا ہے تو وہ، موجودہ غیر قرآنی معاشرہ میں، اس حکم یا منشائے قرآن پر عمل کس طرح کریں۔ اس سوال کا جواب اس لئے مشکل ہوتا ہے کہ قرآنی معاشرے میں قرآنی احکام یا منشاء پر از خود عمل ہوتا چلا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ معاشرہ (بجز استثنائے چند) مشتمل ہی ان افراد پر ہوتا ہے جو اپنی زندگی کو قرآنی

قالب میں ڈھالنے کے لئے مضطرب و بے قرار ہوتے ہیں لہٰذا ایسے معاشرہ میں قرآنی قوانین کا نفاذ کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ لیکن جب (اور جہاں) پورے کا پورا معاشرہ غیر قرآنی خطوط پر متشکل ہو، وہاں وہ چند نفوس جو قرآنی منشاء کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہیں، اپنے آپ کو بڑی مشکل میں پاتے ہیں۔ مثلاً اس پردے کے سوال کو لو۔ قرآنی معاشرہ میں اکثریت ان لوگوں کی ہوگی جو تحفظِ عصمت کو اپنی زندگی کا بنیادی جزو قرار دیں گے ان میں سے ہر مرد، اپنی بیوی کے علاوہ، کسی عورت کی طرف نگہِ خیانت سے دیکھنا تک بھی جرم سمجھے گا اور اسی طرح ہر عورت، اپنے خاوند کے علاوہ کسی مرد کی طرف دیکھنا۔ اس معاشرہ میں مردوں اور عورتوں کی نگاہیں خود بخود شرم و حیا سے نیچی رہیں گی اور کبھی شوخی اور بے باکی سے اُوپر نہیں اُٹھیں گی۔ اب رہے وہ لوگ جو اپنے دل میں خباثتوں کو چھپائے ہوں گے تو معاشرہ کی طرف سے ان کا پورا پورا علاج کیا جائے گا۔ چنانچہ قرآن نے جہاں مومن عورتوں کو اس انداز سے جس کا ذکر اُوپر کیا جا چکا ہے، باہر نکلنے کے لئے کہا ہے، اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ معاشرہ کے بدنیت طبقہ کے ساتھ کیا سلوک کیا جائیگا۔ اس طبقہ کو وہ "منافقین" کے نام سے پکارتا ہے

بدنیتوں کا علاج

قرآن کی یہ اصطلاح بڑی جامع ہے۔ اس سے مراد ہیں وہ لوگ جو مسلمانوں کے معاشرہ کا جزو بن کر تو رہیں لیکن ان حدود و قیود کی پابندی سے جی چرائیں جو اس معاشرہ پر عائد کی جائیں اور ہمیشہ اس فکر میں رہیں کہ ان پابندیوں سے گریز کی راہیں کس طرح نکالی جا سکتی ہیں۔ قرآن نے مومن عورتوں سے کہا کہ وہ باہر نکلیں تو اپنی زینت کو جلباب سے چھپا کر نکلیں تاکہ ہر دیکھنے والے کو معلوم ہو جائے کہ ایک عفّت مآب شریف زادی، چلی جا رہی ہے۔ اس کے بعد ہے کہ لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ "اگر منافقین یعنی وہ لوگ جن کے دل میں خباثت کا مرض ہے اور جو طرح طرح کی جھوٹی خبریں پھیلا کر معاشرہ میں بدامنی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اپنی شرارتوں سے باز نہ آئیں تو پھر لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ۔ معاشرہ کی انتظامی مشینری کے لئے ضروری ہو جائے گا کہ ان کے خلاف اُٹھے اور ضروری کارروائی کرے۔ اس کے بعد اس تادیبی اقدام کا ذکر ہے جو ایسے لوگوں کے خلاف کیا جائے گا۔ اس کی پہلی کڑی یہ ہے کہ ان لوگوں کو معاشرہ سے دور رکھ کر ان کی اصلاح کی کوشش کی جائے۔ (ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ۖ ۳۳/۶۰) اگر وہ اس پر بھی اصلاح پذیر نہ ہوں تو انہیں حقوقِ شہریت اور دیگر مراعات و مفاد سے محروم کر دیا جائے۔ (مَلْعُوْنِيْنَ ۚ

اگر اس پر بھی وہ باز نہ آئیں تو انہیں گرفتار کیا جائے (اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا) اور اگر وہ حکومت کے اس اقدام کے خلاف سرکشی اختیار کریں اور قانون کا مقابلہ کریں تو اس بغاوت کی سزا قتل ہے۔ (وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ۝ (۳۳/۶۱)) اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں جو ہم نے کہی ہے۔ سُنَّةَ اللّٰهِ فِى الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ جہاں اور جب کبھی خدائی قوانین کے مطابق معاشرہ کی تشکیل ہوئی ہے وہاں معاشرہ میں فساد پیدا کرنے والوں کے خلاف ایسے ہی احکام نازل کئے گئے ہیں۔ یہ سنۃ اللہ ہے۔ یہ خدا کا عام اسلوب ہے۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝ (۳۳/۶۲) اور چونکہ خدا کے قوانین حقیقت کلی پر مبنی ہوتے ہیں اس لئے ان قوانین میں تم کبھی کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔

تم نے ضمناً طاہرہ! یہ بھی دیکھ لیا کہ قرآن کے نزدیک عفّت کا تحفّظ، کس قدر بنیادی اصول زندگی ہے۔ ایسا بنیادی اصول کہ اس کی حفاظت کو خدا نے اپنی سنّت ابدی قرار دیا ہے اور ان قوانین کو غیر متبدّل ٹھہرایا ہے جن میں زمانے کے حالات بدلنے سے کسی قسم کا تغیّر و تبدّل نہیں ہو سکتا۔ بالفاظِ دیگر، تحفّظِ عصمت، قرآن کی رُو سے ایک مستقل قدر ہے جس پر زمانے کے تغیّرات قطعاً اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ یہ آج بھی اسی طرح مستقل قدر ہے جس طرح ہزار سال پہلے تھی۔

ہاں! تو یہ صورت ہوگی اس معاشرہ میں جو قرآنی خطوط پر متشکّل ہوگا۔ اسے سامنے رکھو اور اس کے بعد اپنے معاشرے پر نگاہ ڈالو جس میں عام حالت یہ ہے کہ ہماری نوجوان لڑکیوں اور عورتوں کے باہر جانے کا جذبِ

ہماری حالت

محرکہ ہی زینت کی نمود اور حسن کی نمائش ہوتا ہے (خواہ ان میں حسن کہیں نام کو بھی نہ ہو۔ اس لئے کہ حسن صحت سے پیدا ہوتا ہے اور عصمت سے باقی رہتا ہے اور ہمارے معاشرے میں یہ دونوں چیزیں کمیاب ہیں) "ضرورت" اور "کام" تو فقط (شعوری یا غیر شعوری) طور پر ایک بہانہ ہوتا ہے۔ ایسا ہی بہانہ جیسا ہمارا ایک شاعر کہہ گیا ہے:-

روز کہتا ہوں نہ جاؤں گا کبھی گھر اُن کے
روز اُس کوچے میں اِک کام نکل آتا ہے

اگر کہیں ایسا انتظام کر دیا جائے کہ جن شاہراہوں پر ہماری یہ بچیاں اور عورتیں " بایں آوارگی زلف و بیچاکیٔ داماں" شام کو "کام کے لئے" نکلتی ہیں۔ وہاں کوئی مرد نہ جانے پائے تو تم دیکھو گی کہ دو چار دن میں ان کے سارے کام ختم ہو جائیں گے اور سب، اُداس ہو کر گھروں میں بیٹھ جائیں گی۔ یہ زیادہ تر انہی نمائش کرنے والیوں

کی نگاہوں کی بدآموزی ہے۔ جس نے نوجوانوں کی جرأتوں کو اس درجہ بے باک اور بدلگام کر رکھا ہے حقیقت یہ ہے کہ جہاں حالت یہ ہو کہ

صید خود صید را گوید بگیر

وہاں شکار کے لئے کسی لائسنس کی ضرورت کہاں رہتی ہے۔

ادھر عورتوں کی یہ کیفیت ہے اور ادھر مردوں کا یہ عالم کہ اگر کوئی شریف زادی اس طرح لپٹے لپٹائے جارہی ہے کہ زینت کا کوئی مقام بھی ظاہر ہونے نہیں پاتا تو یہ، اتنے ہی سے اپنے جذبۂ ہوسناکی کی تسکین کر لیتے ہیں کہ

من انداز قدت را می شناسم

اور ایسے ایسے فقرے چست کرتے ہیں جن سے، انسانیت کی پیشانی پر پسینہ آجائے۔ قوم کے نوجوان طبقہ کی (جس میں تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ کی کوئی تمیز باقی نہیں رہتی، بلکہ تعلیم یافتہ طبقہ اس میدان میں پیش پیش ہے) یہ بدنہادی اور بے زمامی دن بدن بڑھتی چلی جارہی ہے جس کی وجہ سے شریف لڑکیوں کا برقعوں میں تو ایک طرف بند گاڑیوں تک میں باہر نکلنا بھی دشوار ہو رہا ہے۔

اور ان سب کے اُوپر ہے وہ طبقہ جس نے اس نیچے کے طبقے کی صحیح تعلیم و تربیت کا صحیح انتظام کرنا تھا۔ اس طبقے کے متعلق تو کچھ نہ کہنا ہی بہتر ہے۔

صحیح تعلیم کی ضرورت

ان حالات میں، میری بیٹی، بتاؤ کہ میں تمہیں کیا مشورہ دوں کہ ہمیں معاشرتی طور پر کیا کرنا چاہیئے؟ میرا مشورہ اس گوشے میں بھی وہی ہے جو زندگی کے دوسرے گوشوں کے متعلق ہوتا ہے۔ یعنی ہم اپنے معاشرے کو بدل کر قرآنی خطوط پر متشکل کریں۔ جب یہ بنیاد درست ہو گئی تو اس کے اُوپر اٹھی ہوئی عمارت کا ہر گوشہ اور ہر زاویہ درست ہوگا۔ اس کے لئے بنیادی مسئلہ تعلیم کا ہے۔ تعلیم کی ابتداء گھر سے ہوتی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں اس کی نشوونما ہوتی ہے۔ جہاں تک ابتدائی مرحلہ کا تعلق ہے۔ یہ تمہارا اور تمہارے جیسی اور ماؤں کا کام ہے، جو منشائے قرآنی کو سمجھ چکی ہیں اور اس پر عمل پیرا ہونے کی آرزومند ہیں۔ اس کے بعد اسکولوں اور کالجوں کی باری آتی ہے۔ سو اس تعلیم کا بدلنا نہ میرے بس کی بات ہے نہ تمہارے بس کی۔ یہی تعلیم ہے جو درحقیقت ہمارے نوجوان بچوں اور بچیوں کی تباہی کا موجب بن رہی ہے۔ یہ تعلیم ایک غیر ملکی، غیر اسلامی حکومت

طاہرہ کے نام

نے محکوم قوم کے بچّوں کو خاکبازی سکھانے کے لئے وضع کی تھی جس میں تعمیرِ سیرت، تطہیرِ فکر، پاکیزگیٔ قلب اور عفّتِ نگاہ کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا تھا۔ نہیں! بلکہ اس تعلیم کو ان بنیادوں پر استوار کیا گیا تھا جن سے ذہن میں آوارگی، نگاہوں میں بیباکی اور دل میں ہوسناکی کے جذبات کی پرورش اور انگیخت ہو۔ اس تعلیم کے ساتھ عریاں لٹریچر کا سیلابِ بے پناہ چاروں طرف سے اُمنڈ کر چلا آ رہا ہے۔ پھر ہر گلی کوچے میں سینما اور اس کی حیاسوز مناظر فروشیاں۔ یہ کچھ باہر ہوتا ہے اور گھروں کے اندر خاموش گوشوں میں ریڈیو اور اس کی ہیجان خیز نغمہ باریاں۔ ذرا سوچو کہ اس طوفانِ بدتمیزی میں بچّوں اور بچیوں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ نگاہیں نیچی رکھنے والے پاکیزہ جذبات لے کر پروان چڑھیں "کجدار و مریز"[1] کی توقع نہیں تو اور کیا ہے؟ ہمارے پاس اس کوہِ آتش فشاں کے سیلِ بے پناہ کو روکنے کا اس کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں کہ ہم اپنے معاشرہ میں قرآن کی آواز کو عام کرتے جائیں۔ میں نے اپنی زندگی اسی کوشش میں صرف کر دی اور باقی زندگی بھی اسی جدّوجہد میں بسر کر دینے کی آرزو ہے۔ میں جانتا ہوں کہ:-

ہے میری بساط کیا جہاں میں
بس اک فغانِ زیر بامی

لیکن اس کے باوجود، میں اپنی دھن میں آگے بڑھتا چلا جا رہا ہوں۔ اگر میں مرتے وقت دو چار سلیم جیسے بیٹے اور دو چار طاہرہ جیسی بیٹیاں بھی چھوڑ گیا جو اس ننھے دیئے کو جلائے رکھیں، تو یہ میری جگر کاوی کا کافی صلہ ہوگا۔

والسّلام

پرویز

نومبر ۱۹۵۳ء

---

[1] یعنی پانی کے بھرے ہوئے کٹورے کو ٹیڑھا بھی رکھو اور اس میں سے پانی گرنے بھی نہ دو۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

طاہرہ کے نام دسواں خط

ہماری ماڈرن خواتین

طاہرہ بیٹی! شاہدہ کی ازدواجی زندگی کے انجام سے جس قدر تم افسردہ ہو، میں اس سے کم ملول نہیں لیکن تمہاری افسردگی اور میرے ملول کی وجوہات مختلف ہیں۔ تم افسردہ ہو کہ شاہدہ تمہاری بچپن کی سہیلی ہے تم اس کی خوشی اور غم میں برابر کی شریک ہو۔ تم اس کی آزردہ حالت کو دیکھ نہیں سکتیں۔ لیکن مجھے صدمہ اسکا ہے کہ میں جس بات کو اتنے عرصہ سے بار بار دہرا رہا تھا، شاہدہ نے اس پر کان نہ دھرا اور بالآخر وہ کچھ ہو کر رہا جس کے ہونے کے تصور سے میری رُوح کانپتی تھی۔ مشکل یہ ہے کہ ایک تو ہمارے معاشرے میں زیادتی بالعموم مردوں کی طرف سے ہوتی ہے اور عورتوں کی مظلومیت ایک مسلّمہ کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ دوسرا دہر یہ کہتے ہوئے میں جھجکتا ہوں کہ کہیں تم بھی بُرا نہ مناؤ لیکن حق بات کو بہر حال کہنا ہی پڑتا ہے کہ عورت اور مرد کے تنازعہ میں عورتیں ہمیشہ عورت کا ساتھ دیتیں اور مرد کو (ہر حال میں) مجرم گردانتی ہیں۔ اگر تم شاہدہ کی زندگی اور اس کے انجام پر جذبات سے خالی ہو کر غور کرو تو تم یقیناً مجھ سے متفق ہو گی کہ اس روش کا یہ نتیجہ لازمی تھا۔ اس میں سعید کا کوئی قصور نہیں۔ بلکہ اس نے تو اتنا عرصہ جس ہمّت، تحمّل، بردباری اور برداشت سے کام لیا ہے، اس کی داد دینی پڑتی ہے۔

ماڈرن بیوی کی زندگی

شاہدہ کی زندگی یہ تھی کہ وہ نو بجے سے پہلے کبھی سو کر نہ اُٹھتی تھی اس لئے کہ وہ آدھی رات سے پہلے کبھی سوتی نہیں تھی۔ آج کلب میں گئی ہے۔ کل کہیں جلسہ تھا اس میں تقریر تھی۔ اگلے دن سینما کے آخری شو میں گئی ہوئی تھی۔ اگر کہیں باہر کوئی تقریب نہیں تو گھر پر دوستوں کو کھانے پر بلا لیا۔ کھانے کے بعد آدھی رات تک گپ بازی رہی۔ سعید بیچارے کو دن بھر دفتر میں کام کرنا پڑتا تھا وہ آدھی آدھی رات تک کس طرح جاگ سکتا تھا۔ شروع شروع میں تو اس نے شاہدہ کے شبانہ پروگراموں میں اس کا ساتھ دیا۔ لیکن اس کے بعد وہ اس سلسلہ کو جاری نہ رکھ

سکا۔ باایں ہمہ اس کی سعادت تھی کہ اس نے شاہدہ کو سختی یا ترشی سے کبھی کچھ نہیں کہا۔ سمجھانے کی کوشش ضرور کی۔ لیکن سختی پر کبھی نہیں اُترا۔ وہ آدھی آدھی رات گئے باہر سے آئی اور یہ خود اُٹھ کر دروازہ کھولتا۔ صبح آٹھ بجے دونوں بچیوں نے اسکول جانا ہوتا تھا۔ ذرا سوچو کہ جن بچیوں کی ماں سو رہی ہو، انہیں صبح اٹھا کر اسکول کے لئے تیار کرنے میں باپ کو کس قدر زحمت اُٹھانی پڑتی ہے۔ لیکن سعید یہ سب کچھ خندہ پیشانی سے کرتا۔ اس پہ مشکل یہ کہ بڑی بچی نہ اتنی بڑی تھی کہ وہ اپنی دیکھ بھال آپ کر سکتی اور نہ اتنی چھوٹی کہ باپ لے نہلا دھلا کر کپڑے بدلوا کر اسکول کے لئے تیار کر دیتا۔ نہ ہی یہ کام نوکروں کے سپرد کئے جانے کا تھا۔ اس مقصد کے لئے آیا الگ رکھنی پڑتی تھی، سعید یہ بھی جانتا تھا کہ اگر بچیوں کو آیا ہی پہ چھوڑ دیا تو ان کی تربیت پر کیا اثر پڑے گا۔ اس لئے اسے خود بھی نگرانی کرنی پڑتی۔ اس کے ساتھ ہی اسے نو بجے دفتر پہنچنا ہوتا تھا۔ اس کے لئے بھی تیاری کرنی ہوتی تھی۔ یہ سب کچھ گھر میں اس وقت ہوتا جب شاہدہ پڑی سو رہی ہوتی۔ جب وہ سو کر اٹھتی تو بچیاں اسکول اور خاوند دفتر جا چکے ہوتے۔ اُٹھنے کے بعد قریب گھنٹہ بھر میں نیند کا خمار اترتا۔ (دیر سے اٹھنے کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے) اس کے بعد ناشتہ کیا جاتا۔ ناشتہ کے بعد اخبار یا ایک آدھ رسالہ پڑھا جاتا۔ وومنز ایسوسی ایشن کی سیکرٹری شپ اس کے سپرد تھی، اس کی ڈاک اور کاغذات دیکھتی۔ ایسوسی ایشن کے رسالہ کے لئے کوئی مضمون لکھتی جس میں بتایا جاتا کہ گھر کی زندگی کو خوشگوار کیسے بنایا جا سکتا ہے اور بچوں کی صحیح تربیت کس طرح کی جاتی ہے پھر دوپہر کے کھانے کا وقت آجاتا۔ کھانے کے بعد کچھ وقت کے لئے ریڈیو یا گراموفون ریکارڈ سنے جاتے۔ اتنے میں نیند آجاتی۔ اگر بچیاں اسکول سے ایسے وقت آگئیں جب امی ابھی سوئی نہیں تھیں تو "گڈ مارننگ" ممی ہو جاتا ورنہ وہ اسکول سے آکر پھر نوکروں کے ہاتھوں کھانا کھا کر کھیلنے لگ جاتیں۔ اس کے بعد ان کا "اتالیق" (گھر پر پڑھانے والا ماسٹر) آجاتا تو وہ اپنے لکھنے پڑھنے میں مصروف ہو جاتیں۔ امی اٹھتیں اور نہا دھو کر چائے پیتیں اور پھر یا تو بیڈمنٹن (یا ٹیبل ٹینس) کے لئے کلب چلی جاتیں یا شاپنگ کے لئے بازار۔ سعید دفتر سے تھکا ماندہ آتا اور بچیوں کی دیکھ بھال، نوکروں سے حساب فہمی اور گھر کی چیزوں کی نگرانی اور محاسبہ میں مصروف ہو جاتا۔ رات کا کھانا (وہ بھی اگر باہر نہ ہوتا تو) اکٹھا کھایا جاتا اور اس میں میاں، بیوی اور بچیاں ایک میز پر جمع ہو جاتیں۔ لیکن یہاں کی گفتگو بھی بالعموم تلخ انجام ہی رہتی۔ شاہدہ ہمیشہ نوکروں کی بدتمیزی، گھر کی بدنظمی، بچوں کی بدسلیقگی، میاں کی بے توجہی کی شکایت کرتی اور جب سعید اتنا کہہ دیتا کہ ذرا سوچو کہ تم ان امور کی اصلاح میں کتنا حصہ لیتی ہو تو فوراً بات بگڑ جاتی۔

کیوں طاہرہ! جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ غلط تو نہیں، اگر غلط ہے تو اس کی ذمہ دار خود تم ہو۔ اس لئے کہ یہ باتیں خود تم ہی آکر مجھ سے کہا کرتی تھیں اور یہ بھی بتایا کرتی تھیں کہ تم شاہدہ کو سمجھاتی ہو لیکن اس کی سمجھ میں ایک بات نہیں آتی۔ تم ہی نے مجھے یہ بھی کہا تھا کہ گھر کی بدنظمی اور ویرانی کے علاوہ اس روش زندگی کا اثر خود شاہدہ کی صحت پر کس قدر پڑ رہا تھا۔ نہ وقت پر سونا۔ نہ وقت پر کھانا پھر جو کچھ کھانا وہ کلبوں اور ہوٹلوں کا کھانا۔ جس میں پلیٹ

صحت کی خرابی

اور گلاس کی صفائی پر تو بہت زور دیا جاتا ہے لاگر چہ اس کا بھی کسی کو علم نہیں ہوتا کہ وہ صفائی ہوتی کس طرح سے ہے، لیکن کھانے کے اجزاء کی طرف کسی کا خیال نہیں جاتا۔ صحت خراب ہوئی تو اس کی طبیعت میں چڑچڑاپن بھی آگیا اس کے ساتھ ہی اخراجات بھی بڑھ گئے۔ پہلے تو نوکروں کی وجہ سے گھر کا خرچ بہت زیادہ اٹھ رہا تھا۔ (اور نوکر زیادہ اس لئے رکھنے پڑتے تھے کہ شاہدہ کو اپنی سوشل تقریبات اور ایسوسی ایشن کے دھندوں سے فرصت نہیں ملتی تھی جو گھر کی طرف دھیان

اخراجات کی زیادتی

دے سکے) اب ڈاکٹروں کی فیس اور ڈرائیوروں کے بل نے رہی سہی کسر نکالدی۔ آمدنی تو لے دے کے سعید کی تنخواہ ہی تھی۔ وہ اتنے بڑھتے ہوئے اخراجات کی کفالت کس طرح کرتی؟ پھر اگر شاہدہ کو کچھ بھی احساس ہوتا تو وہ اپنے ذاتی اخراجات کم کر کے آمد و خرچ کا میزانیہ درست رکھ سکتی تھی۔ لیکن اس نے ان میں بھی کوئی کمی نہ کی۔ ان اخراجات کو پورا کرنے کے لئے سعید نے قرض لیا تو قرضہ کی ادائیگی کی قسط سے ماہانہ آمدنی اور بھی کم ہو گئی۔ اس پر شاہدہ کا تقاضا تھا کہ وہ ایسوسی ایشن کی سیکرٹری کی حیثیت سے آل ورلڈ ویمنز کانفرنس میں شرکت کے لئے نیویارک ضرور جائے گی کیوں وہاں انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے بالعموم اور عورتوں کے حقوق و واجبات کے سلسلے میں بالخصوص مذاکرات ہوں گے۔ ایسوسی ایشن کے پاس روپیہ نہیں تھا اس لئے اس نے خود ہی وہاں یہ ریزولیوشن بھی پاس کرادیا کہ ہر نمائندہ اپنا خرچ خود ادا کرے۔ سعید کے لئے اتنی بڑی رقم کا مہیا کرنا ناممکن تھا۔ سعید کے پاس جو کچھ تھا وہ شاہدہ سے چھپا ڈھکا نہیں تھا۔ وہ اس کی آمد و خرچ کی پائی پائی سے واقف تھی۔ سعید نے اس سے کبھی کوئی راز نہیں رکھا تھا۔ تم نے طاہرہ خود کئی بار مجھ سے کہا تھا کہ سعید بھائی جان فی الواقعہ سعید ہیں۔ اس پر شاہدہ کا بگڑ کر باپ

اور یہ حرکت

کے گھر چلے جانا اور بچوں کو بھی ساتھ لے جانا اور پھر عدالت میں علیحدگی کی درخواست دے دینا، تم بیٹی خود ہی بتاؤ کس حد تک روا اور مناسب تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مرد ہوتے ہی ظالم ہیں لیکن تم ہی سوچو کہ اس قصے میں کیا سعید فی الواقع ظالم تھا؟ عورتیں بیچاری بے حد مظلوم

ہوتی ہیں لیکن ذرا خدا لگتی کہو کہ شاید یہ واقعی ظلم ہو رہا تھا۔

یہ قصہ سعید اور شاہدہ ہی کا نہیں۔ یہ ہمارے نئے معاشرہ کا معمول بن رہا ہے۔ جس طرح مختلف سوسائیٹیوں میں وقتاً فوقتاً بعض باتیں بطور فیشن چل نکلتی ہیں اسی طرح آجکل ہمارے ہاں "عورتوں کے حقوق" کی آواز بطور فیشن اُٹھ رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ میرے ان الفاظ سے (کم از کم) تم کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہو جاؤ گی اس لئے کہ تم تو اچھی طرح جانتی ہو کہ میں عورتوں کی مظلومیت کا کتنا گہرا نوحہ خواں اور ان کے حقوق کا کتنا بڑا مؤید ہوں اور ہوں کیوں نہ، جب خود قرآن عورتوں کے حقوق کا ایسا زبردست وکیل ہے۔

عورت کی ذمہ داریاں

میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ ہر حق اپنے مقابلہ میں ایک ذمہ داری بھی رکھتا ہے۔ ہماری خواتین (جن میں آجکل حقوق نسواں کا فیشن چل رہا ہے) حقوق کے لئے تو آئے دن بڑے تقاضے کر رہی ہیں لیکن ذمہ داری کا ایک لفظ بھی ان کی زبان پہ نہیں آتا۔ میں عورتوں کے ان تمام حقوق کے لئے جو انہیں قرآن نے دیئے ہیں اور جنہیں مردوں نے اس بُری طرح سے سلب غصب کر رکھا ہے۔ (اور اس کے لئے اُڈیٹنا رکھا ہے اس شریعت کو جو ہمارے دَورِ ملوکیت کے استبداد کی تخلیق ہے۔) پوری قوت کے ساتھ لڑنے کو تیار ہوں۔ (اور تم جانتی ہو کہ اس باب میں کب سے لڑتا چلا آ رہا ہوں) لیکن میں اس کے ساتھ اپنی بچیوں اور بہنوں کو وہ ذمہ داریاں بھی یاد دلانا چاہتا ہوں جو عورت ہونے کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتی ہیں۔

تم مانو یا نہ مانو طاہرہ! لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے دَور میں (غیر شعوری طور پر) عورتوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ دنیا میں "عورت ہونا" بڑی ذلت کی بات ہے۔ اس خیال سے ان کے دل میں ایک نفسیاتی کشمکش پیدا ہوتی ہے جس کا اظہار اس قسم کے نعروں سے ہو رہا ہے کہ عورتیں مردوں کے بالکل برابر ہے۔ اور وہ ہر کام جو مرد کریں گے ہم بھی کریں گی۔ دیکھنے میں تو یہ نعرے بڑے انقلاب آفریں، اور عورت کے مقام کو بلند کرنے کا موجب نظر آتے ہیں۔

مرد بننے کا چاؤ

لیکن میری پیاری بیٹی! ہماری ان بہنوں نے سمجھا ہی نہیں کہ اس قسم کے نعروں اور مطالبوں سے وہ عورت کے مقام کو کس درجہ پست کر رہی ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ جو قرآن نے دورِ جاہلیت کی عورت کے متعلق کہا تھا۔ هُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ ۝ (۴۳/۱۸) کہ وہ کسی تنازعہ میں خود اپنے کیس کو بھی واضح طور پر بیان نہیں کر سکتی، ہمارے دَور کی ان عورتوں کی یہی کیفیت ہے۔ وہ اپنا مقدمہ لڑنے کیلئے اٹھتی ہیں، اور خود بھی

نہیں جانتیں کہ ہمارا دعویٰ کیا ہے اور ہم طلب کیا کر رہی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں اپنے حقوق کا تحفظ اور مانگتی ہیں مرد کا مقام۔ یاد رکھو طاہرہ اس کائنات میں عورت کا اپنا مقام ہے۔ وہ اگر اپنا مقام چھوڑ کر مرد کا مقام حاصل کرنا چاہتی ہے تو یہ بات اس کے لئے وجۂ فخر نہیں۔ اس سے تو الٹا مردوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ ان کا مقام واقعی بہت بلند ہے، جبھی تو عورتیں ان کے مقام پر آنے کا مطالبہ اور خواہش کرتی ہیں۔ فطرت کے

عورت اور مرد کے فرائض

نقشے میں عورت اور مرد کے مقام میں فرق نہیں۔ ان کے فرائض میں فرق ہے۔ فرائض کا یہی فرق ہے جس کے لئے ان دونوں کی ساخت میں حیاتیاتی اختلاف (BIOLOGICAL DIFFERENCE) ہے۔ یہی وہ اختلاف ہے جس کی وجہ سے عورت کی زندگی کا ایک معتد بہ حصّہ عملی کاموں سے معذوری میں گزرتا ہے۔ مثلاً ایامِ حمل، زچگی رضاعت کے دن۔ اس "معذوری" کے یہ معنی نہیں کہ اس سے عورت کا درجہ مرد کے مقابلہ میں پست ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھو تو عورت کا مقام مرد کے مقابلہ میں اونچا ہوتا ہے۔ عورت اگر چاہے تو ان معذوریوں کے باوجود ہر وہ کام کر سکتی ہے جسے مرد کر سکتے ہیں لیکن مرد اگر ہزار چاہے تو بھی وہ ان امور کو سرانجام نہیں دے سکتا جسے عورت کی "معذوریاں" سرانجام دے سکتی ہیں۔ عورت اگر مردوں کے فرائض سرانجام دینے کا مطالبہ کرتی ہے تو اس سے صرف اپنے مقام ہی کو کم کر لیتی ہے بلکہ فطرت کے نقشے کو بگاڑنے اور اس کے پروگرام کو تہہ و بالا کرنے کا بھی اعلان کرتی ہے۔ اس لئے کہ اگر یہ مردوں کے کام کرنے لگ جائیں تو ان کے فرائض کو کون سرانجام دے گا؟ (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) مرد تو اس کے فرائض سرانجام دینے کا اہل ہی نہیں پیدا کیا گیا۔ یاد رکھو! بیٹی! عورت، شجرِ انسانیت میں برگ و بار پیدا کرنے کا موجب اور نسلِ انسانی کے زندہ رکھنے اور آگے بڑھانے کا ذریعہ ہے۔ اگر یہ اپنی اس خصوصیت کو نگہ حقارت سے دیکھتی اور اپنے ان فرائض کی تکمیل میں عار محسوس کرتی ہے تو یہ فطرت کے نقشے میں بگاڑ پیدا کرنا چاہتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ (حقوق مانگتی مانگتی) اپنے آپ کو اس اطمینان سے بھی محروم کر چکی ہے جو اسے فطرت کے متعین کردہ فرائض کی سرانجام دہی سے حاصل تھا اور آج عجیب قسم کی نفسیاتی کشمکش میں گرفتار ہو چکی ہے۔ یعنی یہ اس حیاتیاتی فرق (BIOLOGI- CAL DIFFERENCE) کو مٹا سکنے پر تو قادر نہیں جو اس کی ساخت کے اندر داخل ہے لیکن اسے قابلِ نفرت اور مرد کی ساخت کو قابلِ فخر سمجھ کر اس نے اپنے لئے عدمِ سکون کا جہنم تیار کر لیا ہے۔ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو طاہرہ! کہ عورت، عورت ہونے کی حیثیت سے ہزار عزتوں کی مستحق اور لاکھوں عظمتوں کی سزاوار ہے اور اگر وہ اپنے عورت ہونے پر عار محسوس کرتی ہے تو اس سے زیادہ حرماں نصیب اور بدقسمت

اور کون ہوگا؟ اگر وہ مرد بننے کے چاؤ میں اپنی پیشانی کا عالمتاب نور اور اپنے قلب کی انسانیت ساز حرارت کھو بیٹھتی ہے تو اس سے بڑھ کر (اسی کی نہیں بلکہ خود نوعِ انسان کی) شوریدہ بختی کیا ہوگی؟ یاد رکھو طاہرہ! انسانیت کی تشکیل میں گھر کی حیثیت بڑی بنیادی اور خاندان (FAMILY) کا مقام بڑا اساسی ہے۔ جو معاشرہ اس اساس

گھر کی حیثیت

بنیاد کو قائم نہیں رکھتا (جیسا کہ آجکل یورپ میں بالعموم اور روس میں بالخصوص ہو رہا ہے) وہ آنے والی نسلوں کو آوارہ اور بے مرکز بناتا ہے۔ گھر اور خاندان کی تاسیس و تشکیل میں عورت کی حیثیت مرکزی ہے۔ گھر کو جنت اور آنے والی نسلوں کو باوقار بنانے میں اس کا بڑا حصہ ہے۔ اگر عورت اپنے اس اہم اور قابلِ فخر فریضہ کو چھوڑ کر مردوں کے فرائض سنبھالنے کی کوشش کرتی ہے تو وہ نہ صرف اپنے آپ پر بلکہ معاشرہ اور انسانیت پر ظلم کرتی ہے۔ تم اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ میں یہ کہتا ہوں کہ عورت کسی ایسے کام میں شریک ہی نہ ہو جو آجکل مردوں کی تفویض میں ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ عورت کے لئے ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے اوّلین فرائض کو سرانجام دے اور جب ادھر سے اطمینان ہو جائے تو پھر بے شک مردوں کے دوش بدوش جہادِ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی شریک ہو۔ ہماری مصیبت یہ ہے کہ ہم جو کبھی قدم اٹھاتے ہیں یورپ کی نقالی میں اٹھاتے ہیں اور اس سے بھی بڑی مصیبت یہ کہ ہم نقالی بھی اس وقت کرتے ہیں جب یورپ اپنے اس اقدام کے

یورپ کی عورت

تلخ نتائج سے تنگ آکر اسے چھوڑنے کی فکر کر رہا ہوتا ہے۔ یورپ میں عورتوں نے مردوں کے خلاف اعلانِ بغاوت کیا اور اپنی حقوق طلبی کے لئے مظاہرے شروع کئے۔ یہ درحقیقت ردِّ عمل تھا عیسائیت کی اس تعلیم کا جس کی رو سے عورت کو ذلیل ترین مخلوق تصوّر کیا گیا تھا۔ عیسائیت کی تعلیم یہ تھی کہ عورت کو مرد کی پسلی سے پیدا کیا گیا ہے اور یہ پسلی ہڈی کی طرح ٹیڑھی ہوتی ہے (جو کبھی سیدھی نہیں ہو سکتی۔ اور اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرو تو ٹوٹ جاتی ہے) دنیا کی تمام مصیبتوں کا موجب عورت ہے کیونکہ اس نے آدم کو بہکا کر جنت سے نکلوایا تھا۔ روح صرف مرد کے لئے مخصوص ہے۔ عورت میں (جانوروں کی طرح) روح ہی نہیں ہوتی۔ اس تعلیم کا لازمی ردِّ عمل تھا کہ عورتیں مرد بننے کی کوشش کریں۔ اس کوشش کا پہلا زینہ یہ تھا کہ وہ ان فرائض کو چھوڑ دیتیں جو بہ حیثیت عورت انہیں سرانجام دینے پڑتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ان تمام اجزاء کو ایک ایک کر کے توڑنا شروع کر دیا جن کے مجموعہ سے گھر (HOME) ترتیب پاتا ہے اور رفتہ رفتہ ایسی صورت پیدا کر دی کہ گھر اور ہوٹل میں کوئی فرق

ہی نہ رہا۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ گھروں میں کھانا پکانا بند ہوگیا، مطلب یہ ہے کہ میاں اور بیوی میں مؤدت اور یگانگت کا وہ تعلق نہ رہا۔ جسے قرآن نے هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ سے تعبیر کیا ہے۔ تعلق محض کاروباری (BUSINESS کا سا) رہ گیا ہے اولاد کا داؤل تو تصور ہی بار دوش ہوگیا اور جو بچے پیدا ہوئے، وہ سینۂ مادر کی محبت آمیز گرم جوشیوں اور اس کے آغوش کی انسانیت ساز سبق آموزیوں سے محروم رہ گئے۔ حال ہی میں یورپ کے علمائے نفسیات ایک طویل تجربے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جو بچے تین برس کی عمر تک اپنی ماؤں سے علیحدہ کر دیئے گئے تھے ان کا بیشتر حصہ جوان ہو کر آوارہ اور جرائم پیشہ ہوگیا۔ چنانچہ یورپ اب اپنی غلطی سے عبرت حاصل کر کے آہستہ آہستہ پھر "گھر" کی زندگی کی طرف واپس آرہا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں "خانہ ویرانی" کی اس اسٹیج کی ابتدا، ہورہی ہے جہاں سے یورپ کی عورتوں نے اس بغاوت کا آغاز کیا تھا۔

پھر ایک بات اور بھی دلچسپ ہے۔ ہمارے ہاں سے بات کی تمہید تو اس انداز کی ہوتی ہے کہ عورتوں پر مرد بے حد ظلم کرتے ہیں۔ وہ دھڑا دھڑ شادیاں کرتے جاتے ہیں۔ پہلی بیوی کو ادھر چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ بیچاری بھوکوں مرتی ہے۔ اس کے بچے تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ لڑکیوں کا مہر ادا نہیں ہوتا۔ ان کے نان نفقے کا کوئی ذمہ دار نہیں ہوتا اور اس کی تان جا کر اس مطالبے پر ٹوٹتی ہے کہ عورتوں کو ملازمتوں میں اتنا حصہ ملنا چاہیئے۔ ان کے لئے اسمبلیوں میں اس قدر نشستیں مخصوص ہونی چاہئیں۔ ظاہر ہے کہ جن عورتوں پر ظلم و ستم ہو رہا ہے ان میں کوئی بھی اس قابل نہ ہوگی کہ وہ دفتروں میں ملازمت حاصل کر سکے یا اسمبلی کی ممبر بن سکے۔ اور جو ملازمتیں حاصل کر سکیں گی یا اسمبلیوں میں جائیں گی ان میں بمشکل کوئی ایسی ہوگی جو مظلوم اور مصیبت زدہ ہو۔

اسمبلی کی ممبر

ان کے اسمبلیوں میں جانے سے ان مظلوموں کی حالت کبھی نہیں سدھر سکے گی۔ تم جانتی ہو کہ میں عورتوں کے اسمبلیوں میں جانے کے خلاف نہیں ہوں لیکن جو عورت اپنے طبقہ کے حقوق کی محافظت کے لئے آگے بڑھے (خواہ وہ لیڈروں کا میدان ہو یا اسمبلی کا ایوان) اس کے متعلق سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس نے اپنے گھر کی حالت سدھارنے اور سنوارنے کے لئے کیا کچھ کیا ہے۔ اپنے میاں کے ساتھ اس کے تعلقات کیسے ہیں؟ وہ اولاد کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے لئے کتنا وقت دیتی ہے۔ اس نے عورتوں کے غریب اور مظلوم طبقہ کے اندر کتنا وقت گذارا ہے اور ان کے مصائب کے حل کے لئے عملاً کیا کچھ کیا ہے۔ پھر سُن لو کہ دیکھنا یہ ہوگا کہ اس نے اس مقصد کے

لئے عملاً کیا کچھ کیا ہے۔ اس لئے کہ ہمارے ہاں لیڈروں اور نمائندوں کا کام تقریریں کرنے، بیانات دینے اور ریزولیوشن پاس کرنے کی حد سے آگے کبھی نہیں بڑھتا۔ مجھے ان باتوں کے متعلق زیادہ وضاحت سے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ یہ وہ باتیں ہیں جنہیں تم خود شاہدہ سے کہا کرتی تھیں کہ وہ دعوے تو کرتی ہے سارے معاشرے (بلکہ انسانیت) کو سدھارنے اور سنوارنے کے اور خود اس کے اپنے گھر کی یہ حالت ہے۔ وہ پروگرام تو بناتی ہے آنے والی پوری نسل کی صحیح پرورش، تعلیم اور تربیت کا۔ اور خود اپنی حالت یہ ہے کہ بچوں کو کبھی پوچھا تک بھی نہیں کہ وہ کیا کرتے ہیں اور کیا پڑھتے ہیں۔ وہ دنیا جہان کی عورتوں کو خاوند کو رام کرنے کے طریقے بتاتی ہے اور خود سعید جیسے خاوند کے ساتھ بھی نباہ نہیں کر سکی۔ وہ اپنے مضامین میں مظلوم اور ستم رسیدہ عورتوں کی بپتا پر آنسو بہاتی ہے لیکن حرام جو اُسے اس کا علم تک بھی ہو کہ جن مظلوموں کی دکھ بھری داستانوں کے وہ افسانے لکھتی ہے، وہ رہتی کہاں ہیں۔ وہ دوسروں کو شرم دلاتی ہے کہ ان کی بیٹیوں اور بہنوں کے ستر ڈھانپنے کو کپڑا تک میسّر نہیں اور خود (اپنے لئے ہی نہیں) اپنے کتوں کے لئے حریر و اطلس کے گدّے بنواتی ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں طاہرہ! جو تم خود شاہدہ سے کہا کرتی تھیں۔ اس کے بعد تم خود بھی سوچو کہ شاہدہ کی اس قسم کی اپنی زندگی کا انجام کیا ہو سکتا تھا۔ اور جن کی فلاح و بہبود کے لئے وہ انجمنیں بنایا کرتی تھی، ان کی حالت سدھارنے کی کیا شکل ہو سکتی تھی۔

عملی نمونہ

یاد رکھو بیٹی معاشرہ کی حالت کو وہی سدھار سکتا ہے جو (دوستوں اور مداحوں سے نہیں بلکہ) دشمنوں کے بھرے مجمع سے پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکے کہ:۔

فَقَدۡ لَبِثۡتُ فِيۡكُمۡ عُمُرًا مِّنۡ قَبۡلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ۝

(۱۰/۱۶)

"میں نے تمہارے اندر اپنی پوری عمر بسر کی ہے کیا تم اس سے نہیں سمجھ سکتے کہ میں اپنے دعووں میں سچا ہوں یا جھوٹا"

جو ایسا کہہ سکنے کی ہمت نہیں رکھتا، اس کی نہ تو اپنی زندگی کامیاب گذر سکتی ہے اور نہ ہی وہ معاشرہ میں کوئی انقلاب پیدا کر سکتا ہے۔ جب تک ہماری قوم کی "شاہدہ" خود اپنی اور اپنے گھر کی حالت کی شاہد

نہ ہو گی۔ وہ شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (۲/۱۴۳) کبھی نہیں بن سکے گی۔ وَ ذَالِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (۳۰/۳۰) "یہی محکم نظامِ زندگی ہے"۔ (۳) عام طور پر کہا یہ جاتا ہے کہ "تم یہ دیکھو کہ تم سے کہا کیا جاتا ہے۔ یہ مت دیکھو کہ کہنے والا کون ہے۔" یعنی اگر کوئی شخص تم سے کوئی اچھی بات کہے تو تم یہ کہہ کر اس بات کو رد نہ کر دو کہ میاں! پہلے اپنی حالت کو تو سدھار۔ جب یہ کر لو گے تو دوسروں سے کچھ کہنا"۔ تمہیں چاہئیے یہ کہ تم یہ دیکھو کہ جو بات تم سے کہی جا رہی ہے، وہ اچھی ہے یا نہیں۔ اگر وہ اچھی ہے تو تم اسے اختیار کر لو۔ اگر بری ہے تو اسے چھوڑ دو۔ یہ بات ٹھیک ہے۔ لیکن یہ تو اس کے لئے ہے جسے نصیحت کی جا رہی ہے۔ نصیحت کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ جو کچھ کہے خود اس کی زندگی اس کے مطابق ہو۔ اگر اس کی زندگی اس کے مطابق نہیں ہو گی تو اس کی بات کا اثر دوسروں پر نہیں ہو گا۔ عملی مثال ہمیشہ زبانی وعظ سے زیادہ کامیاب ہوتی ہے۔ جن ریفارمرز کے اقوال اور عملی زندگی میں تضاد ہوتا ہے وہ کبھی قوم کی اصلاح نہیں کر سکتے یہ وجہ ہے کہ ہماری خواتین کی معاشرتی اصلاح کی انجمنیں، ہماری وومنز ایسوسی ایشنز خاطر خواہ نتائج نہیں پیدا کرتیں۔ ان میں جو ہماری بہنیں دوسروں کی اصلاح کا ذمہ لے کر اٹھتی ہیں خود ان کی اپنی زندگی ہزار اصلاح کی محتاج ہوتی ہے۔ اگر یہ پہلے اپنے گھروں کی حالت سنوار لیں اور اس کے بعد ریفارمز (اصلاحات) کے لئے نکلیں، تو تم دیکھو گی کہ ان کی کوششیں کس قدر بار آور ہوتی ہیں۔ لیکن اگر یہ چاہیں کہ گھر کی حالت تو شاہدہ کے گھر کی سی ہو اور قوم کا گھرانہ سدھر جائے تو یہ اپنے آپ کو (اور اپنے ساتھ دوسروں کو) دھوکا دینے سے زیادہ کچھ نہیں۔

آخر میں اتنا اور سمجھ لو کہ اگر کوئی عورت اپنے سامنے اجتماعی زندگی کے بلند مقاصد رکھتی ہے اور سمجھتی ہے کہ ان کے ساتھ وہ متاہل زندگی کی ذمہ داریوں کو کماحقہٗ پورا نہیں کر سکے گی تو وہ بے شک شادی نہ کرے (بشرطیکہ اس کے پاس اس قسم کی زندگی بسر کرنے کا پورا پورا اطمینان بخش انتظام موجود ہو۔) لیکن اگر وہ شادی کرتی ہے تو پھر اس کے لئے ضروری ہے کہ ان ذمہ داریوں کو مقدم سمجھے۔

والسّلام

پرویز

لہ تمام نوعِ انسانی کی نگران۔ قرآن نے اُمتِ مسلمہ کا یہی فریضہ بتایا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

طاہرہ کے نام گیارہواں خط

گھر کی چھوٹی چھوٹی باتوں کی اہمیت

تمہارے لئے طاہرہ بیٹی! یہ بات فی الواقعہ باعثِ تعجب ہونی چاہیئے کہ قرآن ایک طرف تو زندگی کے بڑے بڑے اہم معاملات کے متعلق صرف اصولی ہدایات پر اکتفا کرتا ہے لیکن دوسری طرف معاشرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں کی جزئیات تک کو بھی خود ہی بیان کر دیتا ہے۔ لوگوں سے ترشروئی سے پیش نہ آؤ۔ چلّا کر نہ بولو۔ اکڑ کر نہ چلو۔ کسی کے ہاں جاؤ تو اجازت لے کر گھر میں داخل ہو۔ مجلس میں یوں بیٹھو۔ جب کام ہو جائے تو دوسروں کا وقت بیکار باتوں میں ضائع نہ کرو۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن عزیزہ! تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ زندگی میں ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ بڑے بڑے معاملات زندگی میں کبھی کبھی پیش آتے ہیں اور عام طور پر ان کا تعلق بڑے بڑے لوگوں سے ہوتا ہے لیکن معاشرہ کی روزمرّہ کی باتیں قدم قدم پر سامنے آتی ہیں اور ہر شخص کو ان سے واسطہ پڑتا ہے۔ زندگی کے قلعہ کی بنیادیں تو بے شک ان حقائق پر استوار ہوتی ہیں جنہیں قرآن نے اصولی طور پر بیان کیا ہے۔ لیکن اُوپر کی عمارت ان اینٹوں سے تعمیر ہوتی ہے جو روزمرّہ کی ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے ذرات سے تیار ہوتی ہیں۔

چھوٹی چھوٹی باتیں

ذرا سوچو کہ ایک شخص کتنا ہی اصول پرست کیوں نہ ہو، اگر وہ ترش رُو اور بداخلاق ہے تو جن لوگوں کو اس سے واسطہ پڑے گا ان کے لئے اس کی اصول پرستی جس قدر باعثِ رحمت ہوگی، اس سے کہیں زیادہ موجبِ کلفت اس کی کج خلقی ہوگی۔ ہر شخص اس کے پاس جانے سے گھبرائے گا۔ وہ کوشش کرے گا کہ اس سے معاملہ ہی نہ پڑے۔ اصل یہ ہے کہ انسانی کردار (کیریکٹر) کی جھلک ان چھوٹی چھوٹی باتوں ہی سے چھن کر باہر آتی ہے۔ اصول پرستی، زندگی کے موٹر میں پٹرول کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ ٹھیک ہے کہ گاڑی پٹرول ہی کے زور سے چلتی ہے۔ لیکن تمہیں معلوم ہے ناں کہ سلیم میاں پٹرول کے ساتھ موبل آئل کا

کتنا خیال رکھتے ہیں وہ کہا کرتے ہیں کہ پٹرول کے ختم ہونے سے تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ گاڑی رک جائے گی لیکن موبل آئل کے نہ ہونے سے اس کے پرزے جل جائیں گے۔ اصول پرستی اگر پٹرول کی حیثیت رکھتی ہے تو یہ چھوٹی چھوٹی معاشرتی جزئیات زندگی کی گاڑی میں موبل آئل کا کام دیتی ہیں۔ ان کے نہ ہونے سے پرزوں میں ایسی رگڑ (FRICTION) پیدا ہوتی ہے، جس سے باہمی تعلقات کے نرم و نازک رشتے (دھاگے) جل جاتے ہیں۔ پھر یہ بھی سوچو کہ معاشرتی زندگی کی جن چھوٹی چھوٹی جزئیات کو قرآن نے بیان کیا ہے یا ان سے ملتی جلتی دوسری باتیں، کیا ان کی اہمیت محض ہنگامی اور وقتی تھی یا وہ بھی ابدی حقائق کی طرح مستقل اہمیت رکھتی ہیں؟ کیا بدخلقی اور ترشروئی آج سے چودہ سو سال پہلے مذموم تھی اور آج وہ قابلِ تعریف صفت سمجھی جاتی ہے؟ تم دیکھو گی کہ یہ باتیں جس طرح اس زمانے میں اپنی اہمیت رکھتی تھیں اسی طرح آج بھی اہم ہیں۔ اس لئے ان معاشرتی آداب و اخلاق کا اپنا مقام ہے اور انکی نگہداشت انتہائی ضروری۔

اس قسم کے معاشرتی ضوابط یوں تو زندگی کے ہر گوشے میں اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن گھر کی زندگی میں

گھر کی زندگی میں ان باتوں کی اہمیت

ان کی اہمیت اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ میرے سامنے کتنے ہی گھرانے ہیں جن میں (میاں بیوی یا دیگر متعلقین میں)، اصولی طور پر کوئی بات قابلِ اعتراض نہ تھی۔ لیکن ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال نہ رکھنے سے گھر میں سُکھ اور سکون نہیں رہا تھا۔ یا کم از کم میاں بیوی میں وہ بات نہیں رہی تھی جسے قرآن نے مودّت اور رحمت سے تعبیر کیا ہے۔ ذرا غور کرو بیٹی! کہ جب میاں گھر میں آئے تو اس کی طرف سے مسکراہٹ آمیز سلام اور بیوی کی طرف سے خندہ پیشانی سے اس کا جواب کتنی کلفتوں کو دور اور کتنے غم غلط کر دیتا ہے یا ایک کی نادانستہ غلطی پر دوسرے کا حقیقی مسکراہٹ سے جواب دینا گھر کی فضا کو کتنے جہنمی شعلوں کی لپیٹ سے بچا کر جنت در آغوش بنا دیتا ہے۔ یا ایک کی غصّے کی حالت میں دوسری طرف سے دھیمی آواز سے جواب کس طرح بڑھتی آگ پر پانی ڈال دیتا ہے۔ دوسری طرف کسی اختلافی معاملہ پر سنجیدگی سے گفتگو کرنے کی بجائے بیوی کا منہ بسور کر خاموشی سے دوسرے کمرے میں چلدینا۔ دونوں میں کتنی گہری خلیج پیدا کر دیتا ہے یا غلطی کا اعتراف نہ کرنا اور اپنی بات کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے بحث کرتے چلے جانا گھر کی زندگی کو کسقدر سکون فراموش بنا دیتا ہے۔ یہ تو خیر پھر بھی بدخلقی اور ترشروئی یا اسی انداز کی چیزیں ہیں۔ میں نے تو یہانتک دیکھا ہے کہ گھر کی چھوٹی چھوٹی سی باتوں میں بے احتیاطی، گھر کی زندگی میں کسطرح بدمزگی پیدا کر دیتی ہے۔ تم نے اپنی ممانی

مرحومہ کو تو دیکھا ہو گا لیکن ان کی گھر کی زندگی کے مطالعہ کرنے کا تمہیں موقعہ نہیں ملا ہو گا۔ تم بہت چھوٹی تھیں جب ان کا انتقال ہو گیا۔ مرحومہ کے متعلق میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جس چیز کو گناہ یا جرم کہتے ہیں، میں نے ساری عمر میں کوئی ایسی بات اُن سے سرزد ہوتے نہیں دیکھی۔ ایسی نیک اور پاکبازانہ زندگی جس کی مثال کم ملے دیانت اور امانت کی پیکر، دل کی اتنی نرم کہ ملازم تک کے پاؤں میں کانٹا چبھ جائے تو وہ رات بھر روتی رہیں۔ سیر چشمی کا یہ عالم کہ اس اللہ کی بندی نے ساری عمر میں کبھی تمہارے ماموں سے یہ نہیں کہا کہ مجھے فلاں کپڑا

ایک بےمثال نیک عورت

بنوا دو یا فلاں زیور خرید دو۔ ماموں تمہارے، اتنی آمدنی کے باوجود درویشانہ زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ میرا مطلب سادہ زندگی سے ہے۔ گھر کی عام ضروریات کے بعد جو کچھ باقی بچتا سب نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے تعمیری کاموں میں صرف ہو جاتا۔ وہ ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور ان کے ہمعصروں کے گھروں میں زندگی کا جو ٹھاٹھ باٹھ تھا وہ سب کے سامنے تھا۔ موٹریں، کوٹھیاں، نوکر چاکر، جھاڑ فانوس، چمک دمک، زیور، ساڑھیاں، غرضیکہ وہ سب کچھ جو موجودہ دور میں افسروں کی گھر کی زندگی کا جزوِ لازم قرار پا چکا ہے۔ یہ سب کچھ تمہاری ممانی کے سامنے تھا اور اس کے مقابلے میں اپنے گھر کی سادہ زندگی جسے تقابل کے لئے غریبانہ زندگی کہا جائیگا لیکن اس نے کبھی آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا اور لب پر حرفِ شکایت لانا تو ایک طرف کبھی دل میں بھی اس کا خیال نہیں گذرا کہ ان کے مقابلے میں ہمارا معیارِ زندگی کیا ہے۔ تم حیران ہو گی کہ مرحومہ کو بہت کم معلوم ہوتا کہ تمہارے ماموں کی تنخواہ کیا ہے۔ نہ ہی اس نے کبھی اس کے معلوم کرنے کی ضرورت ہی سمجھی۔ سوچو طاہرہ! اس قسم کی عورت آج کہیں دُور دُور بھی دکھائی دیتی ہے؟ دوسری طرف تمہارے ماموں ہیں جن کے متعلق اب تم مجھ سے بھی زیادہ جانتی ہو۔ اگر وہ عورتوں میں اپنی مثال نہیں رکھتی تھیں، تو یہ مردوں میں اپنی خصوصیت کے واحد مالک ہیں۔ تم انہیں اس بڑھاپے میں بھی دیکھو۔ دل اور دماغ دونوں کے اعتبار سے کتنے بلند ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اگر اس اس گھر کی زندگی جس میں میاں بیوی اس انداز کے ہوں، جنت کی زندگی نہیں ہو گی تو پھر اس زمین پر جنت اور کہاں مل سکیگی؟ لیکن تم یہ سُن کر حیران ہو گی کہ اس کے باوجود اس قسم کی رفاقت کا

اس کے باوجود .....

نتیجہ جس قدر خوشگوار ہونا چاہیئے تھا وہ ایسا خوشگوار نہیں تھا۔ اس سے تم کوئی غلط مفہوم نہ لے لینا۔ ان کی رفاقت کی پختگی کا تو تم اس سے اندازہ لگا سکتی ہو کہ اگرچہ مرحومہ کا انتقال اس وقت ہوا تھا، جب ماموں ہنوز ادھیڑ عمر کے تھے لیکن

اس کے بعد انہوں نے دوسری شادی کا خیال تک بھی نہیں کیا اور اس کے لئے وہ کئی بار خود تمہارے سامنے بھی کہہ چکے ہیں کہ "میں نے اس لیے پھر شادی نہیں کی کہ مجھے تمہاری ممانی جیسی کوئی دوسری عورت نظر نہیں آئی"۔ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اپنی خوبیوں کے ہوتے ہوئے گھر کا انداز جس قدر جنت آفریں ہونا چاہیئے تھا وہ ایسا نہیں تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ مرحومہ جہاں زندگی کے بڑے بڑے اصولوں میں اتنے بلند معیار کا ثبوت دیتی تھیں، روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں چنداں محتاط نہیں تھیں۔ وہ ترش رُو اور بدخلق بھی نہیں تھیں۔ ایسی رقیق القلب اور ہمدرد عورت بدخلق کیسے ہو سکتی ہے؟ لیکن وہ گھر کی معمولی باتوں میں احتیاط نہیں برتتی تھیں۔ اس کے برعکس ماموں، بلند اصولوں کے ساتھ ان چھوٹی چھوٹی باتوں

وقت کی پابندی نہیں

میں بھی بہت محتاط تھے۔ مثلاً ماموں وقت کے بہت پابند تھے۔ اب تک تم نے دیکھا ہوگا کہ وہ پابندیٔ وقت کو کس قدر اہمیت دیتے ہیں۔ اور اس کی کتنی شدت سے احتیاط برتتے ہیں۔ لیکن تمہاری ممانی (جیسا کہ ہمارے معاشرے کی عورت کا عام معمول ہے) وقت کا کبھی خیال نہیں کرتی تھیں۔ بات بہت چھوٹی سی ہے لیکن تم سوچو کہ صبح سے شام تک کتنے مقامات پر ان دونوں کا اسی ایک معمولی نکتہ پر ٹکراؤ ہوتا ہوگا۔ ٹکراؤ سے میری مراد یہ نہیں کہ وہ لٹھم لٹھا ہو جاتے تھے۔ ٹکراؤ سے میری مراد ذہنی ٹکراؤ ہے اور تمہارے ماموں جیسے حساس انسان کے لئے اس قسم کا ذہنی ٹکراؤ لٹھم لٹھا سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھا۔ ہم اکثر دیکھتے کہ ان دونوں نے کہیں باہر جانا ہے۔ ماموں تیار ہو کر باہر کے دروازے میں کھڑے ہیں اور ممانی گھر سے نکلنے کا نام نہیں لیتیں،

کوئی شے اپنی جگہ پر نہیں

پوچھنے پر معلوم ہوتا کہ ممانی کو جوتے کا ایک پاؤں نہیں مل رہا۔ یہ ان دونوں عادتوں کا دوسرا اختلاف تھا۔ ماموں کی زندگی کا یہ انداز کہ ان کی ہر شے اپنی جگہ پہ رکھی ہے، اس طرح کہ اگر وہ رات کے اندھیرے میں بھی ہاتھ بڑھائیں تو سیدھا شے مطلوب پر جا کر پڑے۔ اس کے برعکس ممانی کی یہ کیفیت کہ اگر نمکدان مل گیا ہے تو مرچوں والے ڈبے کا پتہ نہیں چلتا۔ اور اگر پنسل سامنے رکھی ہے تو اس کا بٹہ نہیں ملتا۔ جب گھر میں جاؤ، سب سے پہلا فقرہ جو کان میں پڑتا یہی ہوتا تھا کہ "ابھی میرے ہاتھ میں تھی یاد نہیں پڑتا کہاں رکھ بیٹھی ہوں"۔ یہ دونوں کی عادات میں تیسرا اختلاف تھا۔ ماموں کے حافظہ کا اب تک یہ عالم ہے کہ راستہ چلتے تمہیں بتاتے جاتے ہیں کہ تیس برس ہوئے یہاں ایک پتھر ہوتا تھا اور وہاں ایک کھمبا۔ اور ممانی کی بھول کی یہ کیفیت کہ ایک شام ہی لے

بھولنے کی عادت

دیکھا کہ توا چولہے پر رکھا ہے اور خود پریشان سی ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ کہنے لگیں کہ آج آٹا گوندھنا ہی بھول گئی توا چولہے پر رکھا تو یاد آیا۔ ادھر ماموں کی طبیعت ایسی کہ اگر کھانا ذرا بھی بے وقت ہو گیا تو پھر کچھ نہیں کھاتے تھے۔ ماموں اپنے کمرے سے نکل کر غسلخانے کی طرف جاتے تو ہم دیکھتے کہ انہوں نے چلتے چلتے چارپائی کو ذرا پیچھے سرکا دیا، کرسی کو آگے بڑھا دیا، پردے کو سیدھا کر دیا، بچے کی کتاب اُٹھا کر اس کے بستے میں رکھ دی۔ لیکن جب وہ غسلخانے میں پہنچتے تو دیکھتے کہ وہاں صابن ہے تو تولیہ نہیں، قمیض ہے تو بنیان نہیں۔ وہ ان باتوں پر طوفان مچا دیتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ بیوی کی قلبی خوبیوں کا پلڑا کتنا بھاری ہے اور اس کی یہ خامیاں غلط تربیت کا نتیجہ ہیں۔ لیکن انہیں اس سے جس قدر کوفت ہوتی

بے ترتیبی

تھی اس کا تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس سے تم یہ نہ سمجھ لینا کہ تمہاری ممانی پھوہڑ تھیں۔ بالکل نہیں۔ بات صرف یہ تھی کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں جتنی احتیاط برتنی چاہیئے وہ اتنی احتیاط نہیں برتتی تھیں۔ اگر تمہارے ماموں بھی ایسے ہی بے احتیاط ہوتے تو پھر چنداں مضائقہ نہ تھا لیکن چونکہ ان کی طبیعت مختلف تھی اس لئے اس سے انہیں کوفت ہوتی تھی۔ اگر ممانی تھوڑی سی بھی کوشش کرتیں تو ان باتوں پر قابو پا لینا کچھ دشوار نہ تھا۔ انہیں ایسا کرنا چاہیئے تھا۔

اس مقام پر (تم نہیں تو تمہاری سہیلیاں ضرور) کہہ دیں گی کہ دیکھ لو! پرویز صاحب آخر مرد ہیں ناں اس لئے مردوں کی طرف داری کرتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ممانی کو چاہیئے تھا کہ وہ اپنے اندر تبدیلی پیدا کر کے اپنی عادات کو ماموں کی عادات سے ہم آہنگ کر لیتیں۔ یہ کیوں نہیں کہا کہ ماموں کو چاہیئے تھا کہ وہ ممانی کے دوش بدوش چلنے لگ جاتے؟ لیکن عزیزہ! اگر تم غور کرو گی تو تم پر یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ اس میں طرفداری اور مخالفت کی کوئی بات نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ممانی کی بے احتیاطی کوئی اچھی عادت نہ تھی۔ اس کے برخلاف ماموں کا اندازِ زندگی مستحسن تھا۔ یہ وجہ ہے جو میں نے کہا ہے کہ ممانی کو چاہیئے تھا کہ اپنی عادات میں تبدیلی پیدا کر کے اس تصادم کو دور کر لیتیں۔ اگر ماموں بے احتیاط ہوتے اور ممانی با احتیاط تو میں یہی مشورہ ماموں کو دیتا۔

تم پوچھو گی کہ اگر دونوں بے احتیاط ہوتے تو پھر؟ پھر یا تو دونوں باہمی مشورہ سے اپنی عادات میں اصلاح کر لیتے اور اگر ایسا ممکن نہ ہوتا تو پھر یہ دونوں اسی طرح چلے جاتے اور ان میں ٹکراؤ پیدا نہ ہوتا۔ (لیکن اس

قسم کے بے احتیاط گھر کا جو اثر اولاد پر پڑتا ہے وہ ظاہر ہے، گھر کی زندگی میں میاں بیوی میں ہم آہنگی نہایت

ہم آہنگی

ضروری ہے۔ سب سے پہلے اصولوں میں اور اس کے بعد عادات و خصائل کی جزئیات میں تمہیں معلوم ہے کہ قرآن نے مومن مرد اور مشرک عورت یا مشرک مرد اور مومن عورت کی شادی سے کیوں منع کیا ہے؟ (۲/۲۲۱) اس لئے کہ شرک اور ایمان دو متضاد اصول ہیں جو زندگی کی مختلف راہوں کی طرف لے جاتے ہیں (جیسا کہ میں تمہیں پہلے بھی کئی مرتبہ بتا چکا ہوں) قرآن اس حقیقت کو واضح کرنا چاہتا ہے کہ متضاد نظریات زندگی رکھنے والے مرد اور عورت کبھی دو قالب یک جان ہو کر ازدواجی زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ اگر اس قسم کے متضاد اصول رکھنے والے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں تو ان کی زندگی جہنم کی زندگی بن جائے گی۔ وہ کہتا ہے کہ اس قسم کے رشتہ کو روا رکھنے والے اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ تمہیں جہنم کی دعوت دیتے ہیں۔ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَ الْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ (۲/۲۲۱) اور اللہ اپنے اس حکم کی رُو سے تمہیں اس زندگی کی طرف دعوت دیتا ہے۔ جس میں جنّت کی خوشگواریوں اور تباہیوں سے حفاظت کا سامان ہے۔

تم نے غور کیا طاہرہ! کہ طبیعتوں کے ان جوڑ رشتوں کو خدا کس طرح جہنم کے عذاب سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ تو پھر بھی شرک اور توحید کا فرق ہے جو زندگی کی یکسر متضاد راہیں ہیں، قرآن اس باب میں یہاں تک کہتا ہے کہ اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ "خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لئے" اس کے برعکس وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ (۲۴/۲۶) طیّب عورتیں طیّب مردوں کے لئے ہیں اور طیّب مرد طیّب عورتوں کے لئے "خبیث اور طیّب" قرآن کی بڑی جامع اصطلاحیں ہیں۔ ان میں قلب و نگاہ کی خباثت و لطافت سے لے کر عادات و خصائل کی ناخوشگواری و خوشگواری تک سب کچھ شامل ہے۔ وہ میاں بیوی کی یک رنگی و ہم آہنگی کو بنیادی شرط قرار دیتا ہے۔ وہ جہنّمی کو جہنّمی کے ساتھ باندھتا ہے اور جنّتی کا دامن جنّتی کی چولی کے ساتھ ٹانکتا ہے۔ لہٰذا ازدواجی زندگی کو جنّتی بنانے کے لئے ضروری ہے کہ میاں میں جتنی اچھی عادتیں ہوں، بیوی انہیں اپنے اندر پیدا کر لے اور بیوی میں جتنی خوشگوار باتیں ہوں، میاں اپنے آپ کو ان سے ہم آہنگ کر لے۔ اس باب میں روزمرّہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر خاص طور پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں کے بر خود غلط مردوں کو تو چھوڑیئے۔ ان کے دماغ پر چونکہ یہ خنّاس سوار ہے کہ مرد عورتوں پر بہر حال غالب اور حاکم ہے اس لئے وہ بیوی کی اچھی عادتوں

کی تقلید میں بھی اپنی ذلّت سمجھتے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں کی عورتوں کی بھی یہ حالت ہے کہ وہ محض طبیعت کے تساہل سے اپنے اندر کوئی تبدیلی نہیں پیدا کرنا چاہتیں۔ اور جب کبھی ان سے میاں کچھ کہے تو وہ منہ بنا کر کہہ دیتی ہیں کہ ہم تو اچھی بُری جیسی بن گئیں ویسی ہی رہیں گی۔ آپ کے مطلب کی بیویاں ولایت سے ملیں گی، وہاں سے لے کر آئیے۔ تم سوچو بیٹی! کہ یہ ذہنیت کسقدر خراب ہے اور اس قسم کی احمقانہ باتیں کتنے تباہ کن نتائج پیدا کرتی ہیں۔ جب میاں بیوی کا رشتہ جسم اور لباس کا سا ٹھہرا، هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (۲/۱۸۷) تو پھر ان کے لئے ایک دوسرے کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ وہ لباس ہی کیا جو بدن پر فٹ نہ آئے۔

یہ ذہنیت

اب تم سمجھ گئیں کہ قرآن روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اس قدر زور کیوں دیتا ہے اور گھر کی زندگی میں ان باتوں کی اہمیت کس قدر ہے؟ اچھا خدا حافظ! جاوید میاں کو بہت بہت دُعا دینا۔

ہاں سُننا! اس خط کو کہیں ماموں صاحب نہ دیکھ پائیں۔ وہ ممانی مرحومہ کے خلاف کسی سے ایک لفظ بھی سننے کے لئے تیار نہیں۔ کیسی بلند خصائل تھی وہ محترم خاتون اور کتنے پاکیزہ مزاج ہیں یہ ان کے میاں۔ اب ایسے لوگ کہاں سے ملیں گے۔

جولائی ۱۹۵۶ء

پرویز

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

طاہرہ کے نام بارھواں خط

(ہمارے گھر جہنّم کیوں بنے رہتے ہیں؟)

تمہارا سوال طاہرہ بیٹی! اپنی جگہ بالکل مناسب اور معقول ہے۔ ہمارے لئے یہ سوال ہمیشہ وجہ کاوش بنا رہتا ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں، وہ غیر مسلموں کے مقابلے میں غریب ہیں اور بدحال بھی۔ پست بھی ہیں اور کمزور بھی۔ ذلیل بھی ہیں اور محتاج بھی۔ تمہاری نگاہ اس طرف گئی ہے (اور اسے اس طرف جانا بھی چاہیئے تھا)، کہ ہمارے گھروں میں عام طور پر نہ اطمینان ہوتا ہے نہ سکون۔ نہ اتفاق ہوتا ہے نہ یگانگت۔ نہ ہم آہنگی ہوتی ہے نہ یک جہتی۔ نہ میاں بیوی میں محبت ہوتی ہے نہ مؤدت، نہ باہمی اعتماد ہوتا ہے نہ بھروسہ۔ غرضیکہ ہمارا گھر نہیں ایک جہنّم ہوتا ہے جس کے شعلے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوتے ہیں۔ تم پوچھتی ہو (اور ایسا پوچھنے میں حق بجانب ہو) کہ بالآخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ بھی عزیزہ! وہی ہے جو ہماری اجتماعی زندگی کی پستی اور زبوں حالی کی ہے! اجتماعی اور انفرادی زندگی درحقیقت ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں اور تمدّن معاشرت، معیشت، سیاست اور دوسری طرف دوستی کے تعلّقات اور گھروں کے اندر کی زندگی سب، ان شاخوں کے برگ و بار۔ اگر درخت تندرست و

اجتماعی اور انفرادی زندگی

توانا ہے تو اس کی ہر شاخ سرسبز و شاداب ہوگی اور اگر اس کی اصل اور جڑ ہی کرم خوردہ ہو چکی ہے تو اس کے پتّے اور ٹہنیاں کسی طرح بھی ہری بھری نہیں رہ سکتیں۔ جسطرح یہ ناممکن ہے کہ درخت کی جڑ اور تنا صحیح وسالم ہو لیکن اس کی شاخیں اور پتّے خشک اور پژمردہ۔ اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ درخت کی جڑیں تو خشک ہو چکی ہوں اور اس کی ٹہنیاں لہلہاتی دکھائی دیں۔ جہاں تک ہماری اجتماعی زندگی کا تعلق ہے، میں اس حقیقت کی بار بار وضاحت کر چکا ہوں (اور "اسباب زوال اُمّت" میں تم اسے اچھی طرح دیکھ چکی ہو) کہ اس کی بنیادی وجہ وہ غلط مذہب ہے جسے ہم نے دینِ خداوندی کی جگہ اختیار کر رکھا ہے۔ باقی

رہی ہمارے گھروں کی زندگی، سو اُسے بھی جہنّم زار بنانے کا سبب ہماری وہ خود ساختہ شریعت ہے جس میں ہم نے اپنے آپ کو چاروں طرف سے جکڑ رکھا ہے۔ مسلمان مذہب پرست قوم ہے اور مذہب پرست قوم کی دنیا میں عجیب حالت ہوتی ہے۔ "مذہب" کے معنی یہ ہیں کہ ہم بعض باتوں کو ابدی صداقتیں (یعنی ہمیشہ رہنے والی سچائیاں) مانیں اور انہیں غیر متبدّل سمجھیں

دین اور مذہب

یعنی دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے۔ لیکن وہ اپنی جگہ پر اٹل رہیں۔ اگر یہ باتیں وہ اصول ہوں، جنہیں خدا نے تمام انسانوں کی راہ نمائی کے لئے عطا کیا ہے تو ان اصولوں پر کاربند رہنے اور انہیں ناقابلِ تغیّر و تبدّل سمجھنے سے اس قوم کی اپنی زندگی بھی عزّت و سرفرازی اور خوش بختی و مرفّہ الحالی کی زندگی ہو جاتی ہے اور جن قوموں کا اس سے واسطہ پڑتا ہے وہ بھی امن و سکون میں رہتی ہیں۔ اس قوم کے متعلق کہا جائے گا کہ وہ دینِ خداوندی کی متبع ہے۔ لیکن اگر کوئی قوم ان باتوں کو غیر متبدّل سمجھ لے جو کسی زمانے میں انسانوں نے وضع کی تھیں تو اس کی اپنی زندگی بھی جہنّم بن جائے گی اور وہ دوسروں کی نگاہوں میں بھی ذلیل و خوار ہو جائیگی۔ اس قوم کو "مذہب" کی پابند کہا جائے گا۔ ہم نے دینِ خداوندی کو چھوڑ کر "مذہب" کی پابندی اختیار کر رکھی ہے جس کا نتیجہ وہی کچھ ہونا چاہئے تھا جو ہو رہا ہے۔ یہ بات نہ غیر فطری ہے نہ غیر معمولی، نہ اچنبھے کی بات ہے نہ تعجب کی۔ اچنبھا تب ہوتا اگر اس کے ایسے نتیجے نہ نکلتے۔ ببول کا بیج بونے سے کانٹے دار کیکر کا درخت اُگ آئے تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ تعجب تو اس صورت میں ہوتا ہے اگر اس میں انگور لگنے شروع ہو جاتے اور اب میں تمہیں بتاؤں کہ جو کچھ تم نے پوچھا ہے اس سلسلہ میں دین اور مذہب میں کیا فرق ہے۔ اور دین کو چھوڑ کر مذہب پرستی نے کس طرح ہمارے گھروں کو جہنّم بنا رکھا ہے۔

سب سے پہلے تم نے ارشد کے گھر کی مثال دی ہے کہ سب کچھ ہونے کے باوجود وہاں کس قدر عدمِ سکون کی حالت ہے۔ گھر نہیں ایک چولہا ہے۔ جس میں گیلی لکڑیاں سلگ رہی ہیں اور دھوئیں سے ہر ایک کا دم گھٹ رہا ہو۔ اس کی وجہ تمہیں معلوم ہے؟ ارشد کی شادی اس وقت ہو گئی تھی جب وہ ابھی ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اس وقت اس کی عمر بمشکل بارہ برس کی ہوگی اور صغیرہ کی نو دس برس کی۔ صغیرہ

بچپن کی شادیاں

اس کی خالہ کی لڑکی ہے اور یہ رشتہ دونوں بہنوں (یعنی ان دونوں کی ماؤں) نے اپنی مرضی سے کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس عمر میں نہ ارشد کے لئے انتخاب کا سوال پیدا ہو سکتا تھا۔ نہ صغیرہ کی مرضی کا۔ ارشد اس کے بعد گاؤں سے شہر آ گیا۔ اس نے ایم اے کیا۔ مقابلہ

کا امتحان پاس کیا۔ ولایت گیا۔ واپسی پر آتے ہی بطور اسسٹنٹ کمشنر تعینات ہو گیا۔ لیکن صغیرہ وہی دہقانی لڑکی رہی۔ اب تم بتاؤ کہ یہ جوڑ (جسے جوڑ کہنا ہی غلط ہے) نبھتا کیسے؟ سوال یہ ہے کہ ایسا ہوا کیوں؟ اس لئے کہ ہمارے ہاں شادیاں مروجہ "شریعت" کے تابع ہوتی ہیں اور اس شریعت کا فیصلہ یہ ہے کہ دس بارہ برس تو ایک طرف دس بارہ مہینے کے بچے اور بچی کی شادی بھی بالکل جائز اور درست ہے۔ اس لئے جس بات کو شریعت نے جائز قرار دے دیا ہو اس میں مداخلت کا حق کسے حاصل ہو سکتا ہے؟ اس کے برعکس دین کا فیصلہ یہ ہے کہ نکاح کی عمر ہی بلوغت کی عمر ہے۔ یعنی بالغ ہونے سے پہلے لڑکی اور لڑکے کی شادی ہو ہی نہیں سکتی۔ پھر اس نے کہا ہے کہ صرف بلوغت ہی شرط نہیں بلکہ نکاح ایک معاہدہ ہے جس میں فریقین کی رضا و رغبت نہایت ضروری ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جب یہ معاہدہ انتخاب اور رضامندی سے ہوگا تو فریقین ایک دوسرے کے مزاج، افتادِ طبیعت، تعلیم، تربیت، ماحول، عادات و خصائل، ہر بات کو سامنے رکھ کر فیصلہ کریں گے۔ اگر ہماری خود ساختہ شریعت ہمارے لئے سند نہ بنتی تو ارشد اور صغیرہ کی شادی دس بارہ برس کی عمر میں ہو ہی نہ سکتی۔ جب یہ بڑے ہو جاتے تو ارشد اپنی شادی اپنے معیار کے مطابق کرتا۔ اور صغیرہ کی شادی اس کے ماحول کے مطابق کسی اور جگہ ہوتی۔ ان شادیوں میں باہمی مطابقت اور ہم آہنگی کے امکانات بہت زیادہ ہوتے۔

سمجھیں تم کہ مذہب اور دین کے فرق نے اس معاملے میں کتنا بڑا افتراق پیدا کر دیا؟ اب دوسری مثال سامنے لاؤ۔ ہمایوں اور رفعت کے گھر کی زندگی کس قدر قابلِ رشک تھی؟ وہ دونوں سکون اور اطمینان کی فضاؤں میں مسرت کے جھولے جھولتے تھے لیکن جب ہمایوں ولایت گیا ہے تو تم نے دیکھا کہ رفعت کس قدر مغموم اور افسردہ خاطر رہنے لگی تھی؟ رفعت کو ہمایوں کے کیریکٹر پر شبہ نہیں تھا۔ اسے اس کی پاکبازی کا پورا پورا یقین تھا۔ لیکن اسے یہ خیال مسلسل ستا رہا تھا کہ اگر وہ آتے وقت وہاں سے ایک اور بیوی ساتھ لے آیا تو کیا ہوگا؟ رفعت کے دل میں یہ خیال کیوں پیدا ہوا۔ اس لئے کہ اسے معلوم تھا کہ ہماری

دوسری بیوی

شریعت نے مرد کو اس کا حق دے رکھا ہے کہ جب جی چاہے دوسری (تیسری بلکہ چوتھی) بیوی کر سکتا ہے۔ اور اس کا یہ فعل نہ معاشرے کی نگاہوں میں مذموم ہوتا ہے، نہ اخلاق کی بارگاہ میں معیوب۔ یہ تھا وہ خیال جو رفعت کو بار بار ستا رہا تھا اور وہ اندر ہی اندر گھلے جا رہی تھی۔ دو ایک سہیلیوں کے اصرار پر اس نے اپنے اس خیال کا اظہار بھی کر دیا۔ یہ بھی کوئی معیوب بات نہ تھی۔ ان

بیں سے ایک نے ازراہ ہمدردی ہمایوں کو لکھ دیا کہ دیکھنا وہاں کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھنا۔ ورنہ رفعت جیتے جی مر جائیگی۔ وہ واپس آیا تو غصّہ سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ میں نے پوچھا تو آگ بھبوکا ہو کر کہنے لگا کہ چچا جان! رفعت نے مجھے ذلیل کر دیا ہے۔ اس نے میرے متعلق اس قسم کی بدظنی سے کام کیوں لیا۔ اسے اس قسم کا واہمہ پیدا کیوں ہوا؟ کیا اس دس برس کی رفاقت سے اس نے میرے کیریکٹر کے متعلق یہی اندازہ لگایا تھا؟ اس نے میری عزت خاک میں ملا دی ہے۔ اس نے مجھے بداعتماد ثابت کیا ہے۔ میں نے یہ سب کچھ بڑے تحمل سے سُنا اور بات کو کسی اور طرف ٹال کر اس کے غصّے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

تمہیں معلوم ہے کہ ہمایوں شراب کا نام تک سننا گوارا نہیں کرتا اور سگریٹ بھی نہیں پیتا۔ اس واقعہ کے دو ہی تین دن بعد کا ذکر ہے۔ وہ حامد کے پاس بیٹھا تھا۔ حامد نے سگریٹ کیس نکالا اور اس میں سے ایک سگریٹ خود لیا اور یونہی مسکراتے ہوئے سگریٹ کیس ہمایوں کی طرف بڑھا دیا۔ ہمایوں نے بھی مسکراتے ہوئے ایک سگریٹ نکال لیا اور دونوں نے اپنے اپنے سگریٹ سلگا لئے۔ حامد کے جانے کے بعد میں نے ہمایوں سے کہا کہ بھئی! تم تو بڑے پختہ کیریکٹر کے نوجوان ہو۔ شریعت کے بھی بہت پابند ہو۔ تم نے آج سگریٹ لے کر کتنے بودے پن کا ثبوت دیا ہے۔ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور کہا کہ چچا جان! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ سگریٹ پینا نہ از روئے شریعت حرام ہے نہ اخلاقی نقطۂ خیال سے معیوب۔ میں اگر سگریٹ نہیں پیتا تو اس لئے کہ مجھے اس کی عادت نہیں، نہ اس لئے کہ میں اسے شراب کی طرح حرام سمجھتا ہوں۔ اس لئے اگر میں نے یونہی سگریٹ اٹھا لیا (بلکہ یوں سمجھئے کہ اگر میں اب باقاعدہ سگریٹ پینے بھی لگ جاؤں) تو اس سے میرے کیریکٹر پر کون سا حرف آسکتا ہے۔ آپ نے چچا جان! آج عجیب سی بات کہہ دی ہے۔ آپ تو ایسی باتیں نہیں کیا کرتے تھے۔ میں نے آہستہ سے کہا کہ بیٹا اس میں بُرا ماننے کی کوئی بات نہیں۔ بس ایک بات سمجھنا چاہتا تھا سو میں نے اسے سمجھ لیا ہے۔ تم نے جو کچھ کہا ہے اس سے میں یہ سمجھا ہوں کہ جس بات کو شریعت نے ناجائز قرار نہ دیا ہو اور نہ ہی وہ بات معاشرہ یا اخلاق کی رُو سے معیوب سمجھی جاتی ہو۔ اگر تمہارا کسی وقت جی چاہے تو اسے کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہوتا۔ تمہارے نزدیک اس میں نہ کوئی گناہ کی بات ہوتی ہے نہ جرم کی۔ نہ شرم کی نہ جھجک کی۔ اس نے کہا کہ بالکل ٹھیک ہے، میں یہی سمجھتا ہوں۔ اس پر میں نے کہا کہ بیٹا! شریعت نے (یعنی اس شریعت نے جو ہمارے ہاں اس وقت مروّج ہے) ایک مرد کو اجازت دے رکھی ہے کہ وہ جب جی چاہے

دوسری شادی کر لے۔ اس میں نہ کوئی گناہ کی بات ہوتی ہے نہ جرم کی۔ نہ ہی اسے معاشرہ یا اخلاق باعث شرم قرار دیتا ہے یا موجب ندامت۔ تم اسی شریعت کے پابند ہو۔ اگر تمہارے متعلق میں یہ خیال کر لوں کہ تم جب جی چاہے دوسری شادی کر لوگے تو کہو کہ میں نے اس سے تمہارے کیریکٹر اور اخلاق پر کون سا حملہ کر دیا۔ ہمایوں بڑا سمجھدار ہے اور سعادت مند بھی۔ یہ سن کر اس نے نگاہیں نیچی کر لیں۔ ہتھیلی پر سر رکھ لیا اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ وقفہ کے بعد اس نے سر اٹھایا اور کچھ گلہ مندانہ انداز سے کہا کہ چچا جان! یہ بتایئے کہ رفعت نے میرے متعلق اس قسم کی بدظنی سے کام کیوں لیا مجھے اس کا صدمہ ہے؟ میں نے کہا کہ بیٹا! اس میں رفعت کا کوئی قصور نہیں۔ ہمارے ہاں کی ہر عورت اسی قسم کی بدظنی میں رہتی ہے۔ اسے ہر وقت اس بات کا دھڑکا لگا رہتا ہے کہ نہ معلوم میاں کس وقت کسی اور بیوی کو انگلی سے پکڑ کر ساتھ لے آئے۔ یہ دھڑکا عام حالات میں تو دبا رہتا ہے۔ لیکن اگر کبھی میاں ایسے ماحول میں چلا جائے جہاں اس بات کے امکانات زیادہ ہوں (جیسا کہ تمہارے قصے میں ہوا کہ تم ولایت چلے گئے) تو یہ اندیشہ ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ اس سے عورت کو کچھ تو اپنی بے بسی کا احساس ستاتا ہے۔ لیکن بے بسی سے کہیں زیادہ شدید جذبہ رقابت کا ہوتا ہے۔ ہر عفت مآب عورت کی طرح، ایک وفا شعار بیوی کی اپنے خاوند کے معاملہ میں ہمیشہ یہ کیفیت ہوتی ہے کہ

با سایہ ترا نمی پسندم
عشق است و ہزار بدگمانی

یہ ہیں وہ جذبات جن کے تابع عورت کے دماغ پر وہ خیالات طاری ہو جاتے ہیں جنہیں ہم "مرد" بدگمانی اور بدظنی، عدم اعتماد اور کیریکٹر کے فقدان پر محمول کر کے غصہ میں آجاتے ہیں۔ ہمیں ذرا اپنے آپ کو عورت کی پوزیشن میں رکھ کر اندازہ لگانا چاہیے کہ ایسے حالات میں ہمارے دل و دماغ کی کیفیت کیا ہو جائے گی؟

ہمایوں یہ سب کچھ بڑی خاموشی سے سنتا رہا۔ بالآخر اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا کہ "رفعت! مجھے معاف کر دو۔ مجھ سے بڑی بھول ہوئی"۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔

تم نے غور کیا طاہرہ! کہ ہماری اس خود ساختہ شریعت نے میاں بیوی کے باہمی اعتماد کو چھین کر ہمارے گھروں کو کس طرح جہنم بنا رکھا ہے؟ لیکن خدا کے دین نے یہ کچھ نہیں کیا۔ اس نے مرد کو کہیں اجازت

نہیں دی کہ وہ جب جی چاہے دوسری بیوی لے آئے۔ قطعاً نہیں۔ ذرا سوچو کہ اگر ہم مروّجہ مذہب کے پابند ہونے کے بجائے، خدا کے دین کے پابند ہوتے ہیں، تو ہماری زندگی باہمی بدگمانیوں کا جہنّم بننے کے بجائے کس طرح اعتماد اور یقین کی جنّت ہو تی۔ یاد رکھو بدگمانی (میاں کے دل میں ہو یا بیوی کے اور اس کی وجہ کچھ بھی کیوں نہ ہو) وہ پھانس ہے جس کی چبھن انسان کو ایک لمحہ کے لئے بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ خدا کے دین نے اس پھانس کو نکال کر رکھ دیا تھا۔ لیکن ہم نے اس دین کو چھوڑ کر نہ معلوم کیسی کیسی زہر آلود پھانسیں اپنے دلوں میں چبھو رکھی ہیں۔ اور اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔

بہن خدیجہ کے متعلق تم نے جو کچھ مجھ سے کہا تھا میں نے اس کی بابت خود اسی سے پوچھا تھا۔ مجھے پہلے ہی خیال تھا کہ خدیجہ بڑی نیک عورت ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ اپنے گھر کے پیسوں میں چوری کر کے کچھ رقم الگ رکھ لیتی ہو۔ چنانچہ اس نے جو کچھ بتایا اس سے میرے اس خیال کی تصدیق ہو گئی کہ بات کچھ اور ہے اور وہ بات عزیزہ! انہی باتوں جیسی ہے جنہیں میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ اس نے میرے پوچھنے پر کہا کہ بھائی صاحب! آپ سے کوئی بات پوشیدہ نہیں۔ اصل یہ ہے کہ صغریٰ کے ابا کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے کہ وہ بات بات پر تڑاق سے کہہ دیتے ہیں کہ میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔ تم بچوں کو لے کر جہاں جی چاہے چلی جاؤ۔ پہلے تو میں اسے محض طبیعت کی تیزی سمجھا کرتی تھی لیکن اب مجھے ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ وہ یہ بات دل سے کہہ رہے ہیں۔ اب مجھے یہ خطرہ ستانے لگا ہے کہ اگر انہوں نے کسی دن سچ مچ طلاق۔ طلاق۔ طلاق کہہ دیا تو میں کیا کر لوں گی؟ اور پھر ان بچوں کا کیا بنے گا؟ میری کوئی جائیداد نہیں، کوئی پرسان حال نہیں۔ میں نے اب اس ڈر کے مارے یہ کیا ہے کہ گھر کے خرچ سے جس قدر بچا سکتی ہوں بچاتی ہوں اور اسے (انہیں خبر کئے بغیر) الگ رکھتی جاتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ اس سے کوئی خاطر خواہ رقم اکٹھی نہیں ہو جائیگی لیکن بہرحال ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ ایسے منحوس وقت میں چند دنوں تک کے لئے بچوں کے پیٹ پالنے کا آسرا تو ہو جائیگا۔

طلاق

میں خود اللہ سے ڈرتی ہوں کہ کہیں اس کا شمار خیانت میں نہ کر لیا جائے۔ اس لئے میں نے پہلے ہی فیصلہ کر رکھا ہے کہ (خدا بُری ساعت سے بچائے) اگر کہیں وہ روز بد دیکھنا پڑ گیا تو انہیں کہدوں گی کہ آپکی کمائی سے اتنے پیسے میرے پاس جمع ہیں۔ آپ انہیں میرے مہر سے وضع کر لیں۔ کیا معلوم یہ لوگ مہر

بھی دیں یا نہ دیں۔ لیکن میں تو خدا سے سرخرو ہو جاؤنگی۔

تم نے دیکھا طاہرہ! کہ بہن خدیجہ جیسی نیک طینت عورت کو کس خطرہ نے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا اور اس کے بعد یہ بھی سوچو کہ جس عورت کو اپنے مستقبل کے بارے میں اس قسم کا دھڑکا لگا ہے وہ خاک سکون کی زندگی بسر کر سکتی ہے؟ اور جن میاں بیوی میں باہمی اعتماد کا یہ عالم ہو، ان کے گھر میں سکھ اور چین کہاں سے آ سکتا ہے؟ یہ بات صرف خدیجہ سے ہی مخصوص نہیں، ہمارے معاشرہ میں ہر بیوی کو ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ

اب چھری صیاد نے لی، اب قفس کا در کھلا

اس لئے کہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کی رُو سے مرد کو اس کا پورا پورا اختیار حاصل ہے کہ وہ جب جی چاہے، کوئی وجہ بتائے بغیر ایک دو تین کر کے بیوی کو الگ کر سکتا ہے۔ تم سوچو عزیزہ! کہ جس معاشرہ میں عورت کے سر پر ہر وقت یہ تلوار لٹکتی رہے اس معاشرہ میں گھروں کی زندگی جہنم نہ بنے تو اور کیا ہے؟

تم کہدو گی کہ میں نے جو کچھ لکھا اس سے تو خود اسلام پر سخت اعتراضات وارد ہوتے ہیں کیونکہ اسلام نے ان باتوں کو جائز قرار دیا ہے۔ اس لئے اگر ان باتوں کا نتیجہ معاشرہ کی تباہی اور گھروں کی زندگی کا جہنم ہے تو اس کی ذمہ داری مردوں پر عاید نہیں ہوتی خود اسلام پر عاید ہوتی ہے جس نے مردوں کو اس قسم کے اختیارات دے رکھے ہیں۔ اگر اسلام نے فی الواقعہ اس قسم کے اختیارات مردوں کو دے رکھے ہوتے تو

اسلام پر اعتراض نہیں

تمہارا اعتراض بالکل صحیح ہوتا لیکن (جیسا کہ میں کئی بار لکھ چکا ہوں) اسلام نے مردوں کو اس قسم کے اختیارات بالکل نہیں دیئے۔ یہ اختیارات اس شریعت نے دے رکھے ہیں جو بعد کی پیداوار ہے۔ قرآن ان کی اجازت کبھی نہیں دیتا۔ قرآن صغرسنی کی شادی کی اجازت نہیں دیتا۔ اس نے نکاح کے لئے بلوغت کی عمر کو ضروری قرار دیا ہے۔ وہ لڑکے یا لڑکی کی رضامندی کے بغیر نکاح کو جائز قرار نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک نکاح ایک معاہدہ ہے جس کے لئے فریقین کی رضامندی بنیادی شرط ہے۔ وہ کسی مرد کو اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ جب جی چاہے دو تین، چار تک شادیاں کر لے۔ وہ تعدد ازدواج کو معاشرہ کی ایک ہنگامی مشکل کے حل کے لئے تجویز کرتا ہے جس کا فیصلہ مسلمانوں کا اجتماعی نظام کر سکتا ہے نہ کہ افراد۔ وہ مرد کو اس کی اجازت کبھی نہیں دیتا کہ وہ جب جی چاہے عورت کو طلاق دے کر الگ کر دے۔ اس نے معاہدۂ نکاح کی تنسیخ کے لئے ایک متعین طریق کار تجویز کیا ہے جس کی سلسلہ جنبانی کا حق

مرد اور عورت دونوں کو حاصل ہے لیکن جس کا فیصلہ عدالت کی رُو سے ہو سکتا ہے۔ اب تم بتاؤ کہ جس اسلام کے یہ احکام ہوں اس پر وہ اعتراض کسی طرح بھی وارد ہو سکتا ہے جس کی طرف اُوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

ہمارے صدرِ اوّل کی تاریخ

تم کہو گی کہ مولوی صاحبان اپنی شریعت کی تائید میں رسول اللہ ؐ اور صحابہ رضؓ کے عہد کے واقعات پیش کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے احکام وہی ہیں جنہیں وہ بیان کرتے ہیں۔ اس بات کے متعلق میں پہلے بھی (ایک خط میں) لکھ چکا ہوں کہ ہمیں اپنے عہدِ اوّل کی تاریخ کا مطالعہ کس اصول کے ماتحت کرنا چاہیئے۔ یہ بات واضح ہے کہ :-

۱۔ نبی اکرم ؐ کی زندگی قرآن کے مطابق بسر ہوئی تھی۔

۲۔ قرآن کا ایک ایک لفظ ہمارے پاس محفوظ ہے۔

۳۔ نبی اکرم ؐ کے زمانے کی تاریخ صدیوں بعد جا کر مرتب ہوئی۔

ان حالات میں یہ واضح اصول ہمارے سامنے آجاتا ہے کہ نبی اکرم ؐ کے متعلق جو کچھ ہمیں تاریخ میں ملتا ہے اس میں وہی کچھ یقینی طور پر صحیح ہو سکتا ہے جو قرآن کے خلاف نہ جائے۔ اگر اس میں کوئی بات ایسی ملتی ہے جو قرآن کے خلاف ہے تو ہم بلا تأمّل کہہ دیں گے کہ وہ صحیح نہیں۔ اس لئے کہ رسول اللہ ؐ کا کوئی عمل قرآن کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ایسے امور کے متعلق یا تو ہمیں مزید تحقیق کرنی چاہیئے اور اگر اس کا کوئی امکان نہ ہو تو پھر ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ واقعہ یا تو قرآن کے حکم نازل ہونے سے پہلے کا ہے اور یا بالکل غلط ہے۔ مثلاً صغر سنی کی شادی کے سلسلہ میں، کہا جاتا ہے کہ نبی اکرم ؐ کا حضرت عائشہ رضؓ سے نکاح اس وقت ہوا جب حضرت عائشہ رضؓ کی عمر چھ برس کی تھی۔ لیکن بعض واقعات کی تطبیق سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ بات غلط ہے حضرت عائشہ رضؓ کی عمر شادی کے وقت کم از کم سولہ سترہ برس کی تھی۔ اسی طرح حضور ؐ کی ازواجِ مطہرات کے متعلق صورت یہ ہے کہ یہ شادیاں اس ہنگامی صورتِ حالات سے نپٹنے کے لئے ہوئی تھیں جس کا ذکر میں اس سے پہلے ایک خط میں کر چکا ہوں۔

جہاں تک طلاق کا تعلق ہے میں سابقہ خطوط میں یہ بتا چکا ہوں کہ قرآن کی رُو سے اس کا کیا طریقہ ہے۔ اس طریقہ کو یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ البتہ اس کے اس حصّہ کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں جس

ہیں تین طلاق کا ذکر ہے۔ قرآن کی رُو سے تین طلاق کے معنی یہ ہیں کہ جب (تمام ضروری مراحل طے پا چکنے کے بعد) طلاق کا فیصلہ ہو جائے تو میاں بیوی الگ ہو جاتے ہیں۔ اسے پہلی مرتبہ کی طلاق کہتے ہیں۔ اس کے بعد اگر یہ میاں بیوی چاہیں تو پھر سے ازدواجی زندگی بسر کر سکتے ہیں اسطرح میاں بیوی بن جانے کے بعد اگر پھر کبھی طلاق کی نوبت آجائے تو یہ دوسری مرتبہ کی طلاق ہوگی۔ اسکے بعد بھی ان کے دوبارہ میاں بیوی بن جانے کی اجازت ہوتی ہے لیکن اگر تیسری مرتبہ اسی طرح طلاق کی نوبت پہنچ جائے تو اس کے بعد یہ آپس میں شادی نہیں کر سکتے۔ پھر یہ عورت کسی اور مرد کے ساتھ ہی شادی کر سکتی ہے (یہ الگ بات ہے کہ اس کا یہ نیا خاوند مر جائے یا اس سے اسے طلاق مل جائے تو یہ پھر پہلے خاوند سے نکاح کر لے) یہ ہے قرآن کی رُو سے تین طلاق کا مطلب۔

اب اس سلسلہ میں روایات کو دیکھو۔ بعض روایات اس قسم کی ملتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ تین طلاق سے مطلب ہے ایک ایک ماہ کے وقفے کے بعد تین مہینوں میں تین طلاقیں پوری کرنا اور ایسی روایتیں بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ہی نشست میں تین بار طلاق کہہ دینے سے تینوں طلاقیں پوری ہو جاتی ہیں۔ ان کے ساتھ یہ روایت بھی ہمارے سامنے آتی ہے کہ:

> حضرت رکانہ رضؓ نے اپنی بیوی کو ایک طلاق نبی اکرمؐ کے زمانہ میں دی جس کے بعد حضورؐ نے ان کی بیوی کو ان کی طرف لوٹا دیا۔ پھر انہوں نے دوسری طلاق حضرت عمرؓ کی خلافت میں دی اور تیسری طلاق حضرت عثمان رضؓ کے عہد میں۔

(مشکوٰۃ۔ باب خلع و طلاق۔ بحوالہ ابوداؤد و ترمذی، ابن ماجہ، دارمی)

اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت رکانہؓ نے پہلی مرتبہ کی طلاق نبی اکرمؐ کے زمانہ میں دی جس کے بعد ان کے میاں بیوی کے تعلقات پھر استوار ہو گئے۔ پھر دوبارہ طلاق کی نوبت حضرت عمرؓ کے زمانہ میں آئی۔ اس کے بعد ان کے ازدواجی تعلقات پھر استوار ہو گئے۔ پھر تیسری مرتبہ یہی صورت حضرت عثمان رضؓ کے زمانہ میں پیدا ہو گئی۔ یہ تیسری طلاق ہو گئی۔ اس کے بعد حضرت رکانہ رضؓ کی بیوی ان سے نکاح نہیں کر سکتی تھی۔ چونکہ "تین طلاق" کا یہ طریق قرآنی طریق کے مطابق ہے اس لئے ہم باور کر سکتے ہیں کہ یہ روایت صحیح ہے۔

تم نے غور کیا طاہرہ! کہ روایات کے صحیح یا غلط تسلیم کرنے کا قرآنی معیار کیا ہے۔ تمہیں اس معیار کے مطابق تمام تاریخی واقعات کو پرکھنا چاہیئے۔ اور صرف انہی واقعات کو صحیح تسلیم کرنا چاہیئے

جو قرآن کے مطابق ہوں۔ اس اصول کے ماتحت نکاح وطلاق کے بارے میں جو کچھ مروّجہ مذہب کی رُو سے ہو رہا ہے اور وہ قرآن کے خلاف ہے اس کی نسبت نبی اکرمؐ کی طرف کبھی نہیں کی جا سکتی۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ سب بعد کا وضع کردہ ہے۔ ہماری کوشش یہی ہونی چاہئے کہ بعد کے وضع شدہ مذہب کی جگہ وہ دین لے لے جسے خدا نے قرآن میں نازل کیا تھا۔ اور جس کے مطابق نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ نے عمل کیا تھا۔ اسی دین میں وہ اُلجھنیں کبھی پیدا نہیں ہو سکتیں جن کا حکم خراشی تذکرہ مذکورہ صدر واقعات میں سامنے آیا ہے۔

ماڈرن گھروں کی حالت

یہ حالت ہمارے "پرانے فیشن" کے گھروں کی ہے۔ جہاں تک ماڈرن فیشن کے گھروں کا تعلق ہے ان کی حالت ان سے بھی بدتر ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ قدامت پرست گھروں کی آگ تپ دق کی آتش خاموش کی طرح گھر کے امن وسکون کو اندر ہی اندر جلا کر راکھ بنا دیتی ہے اور ان ماڈرن گھروں کی یہ آگ سرسام کے شعلۂ جوّالہ کی طرح بھڑک کر تماشا دکھاتی ہے۔ یہ ماڈرن گھر مغرب کی اندھی تقلید کے نمونے ہیں۔ مغرب میں ہوا یہ کہ (ہماری خودساختہ شریعت کی طرح) عیسائیت نے عورت پر جو استبداد صدیوں سے روا رکھا تھا، اس کے ردعمل میں عورت کے دل میں انتقام کے ایسے شعلے بھڑک اُٹھے کہ وہ یکسر بغاوت اور بیباکی کا مجسمہ بن گئی۔ ہماری عورتوں نے اسی کو تہذیب سمجھا اور ان کی دیکھا دیکھی انہوں نے بھی اس قسم کی روش اختیار کر لی۔ اس روش کا پہلا نتیجہ یہ تھا کہ ازدواجی زندگی کو بالکل ایک کاروباری چیز (BUSINESS CONCERN) سمجھ لیا گیا۔ اس "کاروبار" میں میاں بیوی کی ازدواجی زندگی بالکل اسی قسم کی ہوتی ہے جیسے کسی دکان کے دو حصہ دار (PARTNERS) ہوں کہ جب تک انہیں اس اشتراک میں فائدہ نظر آئے ان کا یہ تعلق قائم رہے۔ جب کوئی اور کاروبار زیادہ منفعت بخش دکھائی دے اسے چھوڑ کر اس میں شریک ہو جائے۔ اس شراکت میں شریک غالب بیوی ہوتی ہے کیونکہ اس نے اس معاہدہ میں ایسی شرائط لکھا رکھی ہوتی ہیں، جن کی وجہ سے میاں ہمیشہ دبا رہتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ابتداء میں ان کی یہ شراکت بالکل حیوانی سطح پر ہوتی ہے جس میں وجہ جامعیت جنسی جذبات اور زندگی کے

طبعی تقاضوں سے بلند کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اور ذرا آگے چل کر یہ تعلق میکانکی (MECHANICAL) سا رہ جاتا ہے۔ جسے محض اس لئے قائم رکھا جاتا ہے کہ یہ سوسائٹی میں میاں بیوی کی حیثیت سے متعارف رہیں۔ ذرا سوچو بیٹی! کہ جس گھر کی دیواریں ان بنیادوں پر استوار ہوں اس گھر میں سکون اور اطمینان کس طرح داخل ہو سکتا ہے؟ یاد رکھو عزیزہ! گھروں میں حقیقی امن و سکون اور میاں بیوی میں قلبی محبت اور مؤدت کا رشتہ اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے کہ ایک طرف ہم ان خود ساختہ زنجیروں کو توڑ دیں جن میں ہم نے اپنی عورتوں کو صدیوں سے جکڑ رکھا ہے اور دوسری طرف ان بیباکیوں کو روکیں جنہیں ہم نے مغرب کی اندھی تقلید میں اختیار کر لیا ہے اور اس کے بعد اپنے ازدواجی تعلقات کو ان حدود و قیود کے دائرے کے اندر رکھ کر جنہیں قانونِ خداوندی نے متعین کیا ہے، حقیقی آزادی کی زندگی بسر کریں۔ تاکہ ہمارے گھر جنتی فضاؤں سے معمور ہو جائیں۔

عورت کا جمود

آخر میں مجھے تم سے ایک بات خصوصیت سے کہنی ہے۔ ہمارے اُن گھروں میں جہاں مردوں کی صحیح ذہنیت کے پیشِ نظر نہ عورتوں کو ہر وقت "طلاق اور سوکن" کا ہوا ستاتا ہے اور نہ ہی عورتوں کی صحیح تربیت کی بدولت مرد گھروں میں بھی ہوٹل کی سی زندگی بسر کرتے ہیں، ایک اور بات پیش آتی ہے جس کی وجہ سے گھر میں پھر وہ سکون نہیں رہتا جو متاہل زندگی کا مقصود ہے۔ اس کی ذمہ داری ہماری نیک دل لیکن سادہ لوح عورتیں ہیں۔ جب عابد اور زاہدہ کی شادی ہوئی ہے تو دونوں کی تعلیم بھی کم و بیش یکساں تھی۔ مزاج میں بھی موافقت تھی۔ طرزِ بود و ماند بھی قریب قریب ایک ہی جیسا تھا۔ اس لئے اس شادی کے متعلق ہر ایک کو اطمینان تھا کہ یہ جوڑا بالکل ہم آہنگی اور یک رنگی کا آئینہ دار رہے گا۔ کچھ عرصہ تک یہ دونوں ساتھ ساتھ چلے۔ مسرتوں کے جھولے جھولتے اور خوشگواریوں کی پینگیں بڑھاتے۔ لیکن اس کے بعد ان میں کچھ تفاوت پیدا ہونا شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ اس تفاوت نے اتنے بُعد کی صورت اختیار کر لی کہ دیکھنے والے کو محسوس تک نہیں ہوتا تھا کہ یہ دونوں کبھی دوش بدوش چلے ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عابد نے اس کے بعد اپنے علم کی وسعت، معلومات کی زیادتی، ذوق کی شستگی کے لئے برابر محنت جاری رکھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دن بدن آگے بڑھتا چلا گیا۔ لیکن زاہدہ ایک پتھر کے مجسمہ کی طرح وہیں کی وہیں زمیں گیر رہی۔ عابد نے بہتیری کوشش کی کہ وہ اسے

ساتھ چلائے لیکن اس نے اپنی جگہ سے نہ ہلنا تھا نہ ہلی۔ اس میں آگے بڑھنے اور عابد کے ساتھ چلنے کی صلاحیت تھی۔ ضرورت صرف اس کی تھی کہ وہ اس کی اہمیت کا احساس کرے اور اس کے لئے عابد جیسی محنت کرے۔ لیکن زاہدہ کبھی اس کے لئے آمادہ نہ ہوئی اور ہمیشہ یہ کہہ کر اپنے آپ کو جھوٹا اطمینان دلاتی رہی کہ عابد کو تو خدا نے خاص دل و دماغ عطا کیا ہے ہر کوئی اس جیسا تھوڑا ہو سکتا ہے اور پھر انہیں اس کے سوا اور کام ہی کیا ہے کہ دن رات لکھتے پڑھتے رہیں۔ میرے لئے سو دھندے ہیں۔ یا تو میں بھی نئے فیشن کی تتلی بن کر گھر بار کو نوکروں پر چھوڑ کر ان کے ساتھ کتابوں کا کیڑا بنی رہوں اور یا گھر کو سنبھالوں۔ دونوں میں سے ایک ہی کام ہو سکتا ہے۔ لیکن میں گھر کو ترجیح دیتی ہوں۔ مجھے زیادہ پڑھ لکھ کر کون سا مقابلہ کا امتحان پاس کرنا ہے کہ اچھی ملازمت مل جائے۔ لیکن، جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، یہ محض جھوٹا اطمینان تھا۔ اب اس کے بعد دو ہی صورتیں تھیں۔ یا تو یہ کہ (جس طرح ہمارے ہاں عام طور پر ہوتا ہے) عابد بھی آگے بڑھنے سے رک جاتا اور اپنے آپ کو زاہدہ کی زنجیروں کے ساتھ جکڑے رکھتا اور یا وہ اپنی صلاحیتوں کو بیدار کرتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ اس نے یہی کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصہ کے بعد وہ اتنا آگے نکل گیا کہ ان دونوں رہروانِ جادۂ زندگی میں بُعد المشرقین ہو گیا۔ اسے زاہدہ سے محبت تھی اس لئے وہ اسے قدم قدم پر آواز دیتا تھا۔ لیکن زاہدہ اپنے پاؤں کو ذرا بھی جنبش دینے کے لئے تیار نہ تھی۔ اب اس بُعد کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ عابد بڑا نیک طینت تھا۔ اس لئے اس نے باہمی تصادم کی صورت نہ پیدا ہونے دی لیکن باہمی ہم آہنگی سے جو حقیقی مسرت اور سکینت میسر آسکتی تھی وہ تو اسے نصیب نہ ہو سکی۔ وہ زندگی کے خاموش لمحات میں اکثر مجھ سے کہا کرتا تھا کہ میں کبھی سوچتا ہوں کہ میرا یہ سودا (کہ میں زاہدہ کے ساتھ جکڑے رہنے کے بجائے اس طرح آگے بڑھ آیا ہوں) خسارہ کا ہے یا نفع کا۔ لیکن کسی آخری فیصلے پر نہیں پہنچ پایا۔ جو کچھ میں نے کھویا ہے اس کا پورا پورا احساس بھی کسی کو نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کون کہہ سکتا ہے کہ یہ سودا کیسا رہا؟

ذرا سوچو بیٹی! اگر زاہدہ کچھ بھی ہمت کرتی تو عابد کی زندگی کیسی ہوتی؟ اور عابد ہی کی نہیں، خود زاہدہ کی بھی۔ میں نے یہ آخری بات خاص طور پر اس لئے کہی ہے کہ یہ خود تمہارے لئے بڑی سبق آموز ہے۔ اچھا خدا حافظ!

ستمبر ۱۹۵۶ء پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طاہرہ کے نام تیرہواں خط

(بیٹی کے لئے بَر کا انتخاب)

طاہرہ بیٹی! بہت بہت دعائیں۔
کس قدر عرصہ دراز کے بعد تمہارا خط آیا۔ لیکن تمہاری یہ خاموشی میرے لئے وجہ پریشانی ہونے کے بجائے ایک گونہ اطمینان کا باعث رہی کیونکہ تم اس وقت خط لکھا کرتی ہو جب تمہیں کسی پریشانی کا سامنا ہو لہٰذا تمہاری طرف سے خط نہ آنے سے مجھے اطمینان رہتا ہے کہ تم کسی پریشانی میں مبتلا نہیں ہو۔ موجودہ معاشرہ میں اتنا بھی ازبس غنیمت ہے۔

ابھی کل کی بات ہے کہ تم نے سائرہ بیٹی کی پیدائش پر اس کا نام تجویز کرنے کے لئے لکھا تھا اور آج تم اس کے رشتے کے لئے مشورہ مانگ رہی ہو۔ اس سے ذہن اس طرف منتقل ہو گیا کہ اس دوران میں خود ہماری عمر کس قدر بڑھ گئی ہے! وقت کی ریگِ رواں نہایت خاموشی سے گرتی رہتی ہے اور ہمیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا کہ اس کے ہر ذرہ کے گرنے سے ہماری عمر کا ایک لمحہ کم ہو جاتا ہے۔

احباب (بالخصوص قوم کی بیٹیاں) مجھ سے مختلف معاملات میں مشورہ طلب کرتی رہتی ہیں ان میں میرے لئے سب سے مشکل رشتوں کے معاملہ میں مشورہ دینا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ....

لیکن اس سے پہلے ایک شعر سنو۔ مجھے امید ہے کہ گھریلو جھنجھٹوں نے تمہارے شعر کے ذوق کو گہنایا نہیں ہوگا۔ وہ ریاضؔ (مرحوم) کا شعر ہے جسے تم نے غالباً پہلے بھی سنا ہوگا۔ وہ کہتا ہے:-

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دَور — نکلے جو میکدہ سے تو دنیا بدل گئی

میرے عمر بھر کے تجربہ نے بتایا ہے کہ تم مجوزہ لڑکے کو سینکڑوں نگاہوں سے پرکھو۔ ہزار جہت سے اُلٹ پلٹ کر دیکھو۔ نکاح کے چار کلمے دہرا لینے کے بعد نہ معلوم کیا ہوتا ہے کہ اس کی دنیا ہی بدل جاتی ہے۔

وہ اور سے کچھ اور ہو جاتا ہے۔ سو جو دیوار لرزاں اس قدر ناقابلِ تیقن (UNPREDICTABLE) ہو۔ اس کے متعلق یقین کے ساتھ کیا کہا جا سکتا ہے۔ ان میں سے جو ذرا زیادہ فریبی ہوتے ہیں، ان سے اگر میں (بعض اوقات) کہتا ہوں کہ بیٹیا! تم پہلے تو ایسے نہیں تھے، تو وہ نہایت سادگی سے کہہ دیتے ہیں کہ نہیں، باباجان! میں پہلے بھی ایسا ہی تھا۔ مجھ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اور اس کا مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ریاکاری سے ایسا نہیں کہتا۔ وہ سچ مچ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ یہ جو تم آئے دن سنتی رہتی ہو کہ "حقیقی بھائی (یا بہن) کا بیٹا تھا۔ گود کا پلا ہوا، ہاتھوں کا کھلایا ہوا۔ آنکھوں کے سامنے بڑھا، پھولا، پھلا جوان ہوا۔ نہ جانے شادی کے بعد کیا ہو گیا کہ پہلے جیسا رہا ہی نہیں"۔ اس کی یہی وجہ ہے۔ جب عقل و فکر جواب دے جائے تو اس کے سوا وہ کیا کہے کہ "بہن! پہلے تو میرا ان باتوں پر اعتماد نہیں تھا لیکن اب سمجھتی ہوں کہ کسی نے اس پر تعویذ کر دیئے ہیں۔ (طاہرہ بیٹی! تو ہم پرستی مایوسیوں کی پیداکردہ ہوتی ہے) اگر وہ توہمات کی طرف نہیں جاتی تو یہ کہہ کر اپنی انا کو سنبھالا دے لیتی ہے کہ "بہن! مجھے یہ سب کچھ نظر آتا تھا لیکن بات بالکل وہی صحیح ہے کہ یہ سنجوگ کا معاملہ ہے۔ رشتے تو آسمانوں پر طے ہو چکے ہوتے ہیں۔ نکاح پہلے ہی فرشتوں نے پڑھا دیا ہوتا ہے۔ یہاں تو بس ایک رسم پوری کی جاتی ہے"۔ یہ بھی درحقیقت توہم پرستی ہی کی ایک شکل ہے جسے ذرا مقدس بنا لیا گیا ہے:-

میرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں؟

لیکن تم تو نہ تعویذ دھاگوں کی قائل ہو، نہ آسمانی نکاحوں کی معتقد۔ اس لئے تمہیں اپنی ذمہ داری سے جی نہیں چرانا چاہیئے۔ اپنی استطاعت کے مطابق دیکھ بھال کر فیصلہ کرنا چاہیئے۔ ان معاملات میں بہتر مشورہ بھی یہی ہوتا ہے کہ فیصلہ پوری طرح دیکھ بھال کر کرنا چاہیئے۔

ہماری غلطی درحقیقت دیکھنے بھالنے کی جہتوں کی ہوتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ لڑکا صحتمند ہے، خوبرو اور توانا ہے۔ تعلیم یافتہ ہے، برسرروزگار ہے۔ گھرانا خوشحال ہے اور معاشرہ میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ (اگر ہم عہد جہالت کی ان زنجیروں کو ابھی تک نہیں توڑ سکے تو اس کا بھی اطمینان کر لیا جاتا ہے کہ) وہ لوگ اپنی ذات برادری کے ہیں اور رشتے کے خواہشمند ہیں۔ تم سوچو کہ ان تمام معیاروں پر پورا اترنے کے بعد کون سی بات رہ جاتی ہے جو اس کے منتخب کر لینے کی راہ میں حائل ہو۔

لیکن وہ شق جس پر ساری ازدواجی زندگی کا مدار ہے اس کی طرف کسی کی نگاہ نہیں پڑتی۔ یہ دیکھا ہی نہیں جاتا کہ لڑکے کا مزاج کیسا ہے؟ اُفتادِ طبیعت کیسی ہے۔ ذوق کس قسم کا ہے۔ (مختصراً) اس کی نفسیاتی کیفیت کیسی ہے۔ اس کے لئے بے شک گہرے مطالعہ اور طویل مشاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس کے بغیر ازدواجی زندگی، رفاقت کی نہیں ہو سکتی۔ اس سلسلہ میں میرے چالیس پچاس سال کے تجربہ نے جو مختلف گھرانوں کے احوال وکوائف کے مطالعہ اور مشاہدہ پر مبنی ہے، مجھے جن نتائج پر پہنچایا ہے، میں ان سے تمہیں مطلع کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

(۱) اگر لڑکا احساس کمتری (INFERIORITY COMPLEX) کا شکار ہے تو صحت، توانائی، تعلیم روزگار، خاندانی وجاہت، بلند نسبی وغیرہ کے باوجود گھر جہنم بنا رہے گا۔ فیض نے کہا ہے کہ

جناب شیخ سے مے کا جواز کیا پوچھیں کہ چاندنی کو بھی حضرت حرام کہتے ہیں

اس گھر میں چاندنی جھانک نہیں سکتی، پھول کھل نہیں سکتے، فضا مہک نہیں سکتی۔ بیوی کی مسکراہٹ دب کر اور بچوں کی ہنسی گھٹ کر رہ جاتی ہے۔ گھر کے در و دیوار مستقل طور پر سیاہ پوش رہتے ہیں۔ بچے اپنے ابو سے بات کرنے کو ترستے رہتے اور کنکھیوں سے اس کے 'MOOD' کا اندازہ لگاتے رہتے ہیں۔ بیوی کھل کر بات کرنے کی جرأت نہیں پاتی۔ بچوں کی ہر طبعی حرکت اسے بدتمیزی نظر آتی ہے اور ان کی کھیل کود شرارتیں۔ ان کی کسی فرمائش کا خندہ پیشانی سے پورا کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا "فلسفہ" یہ ہوتا ہے کہ اس سے بچوں کی عادتیں خراب ہو جاتی ہیں۔ معاشرتی روابط سے (خواہ وہ اپنے اعزّہ کے کے ساتھ ہی کیوں نہ ہوں) اس کے نزدیک خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ان "خرابیوں" کی بنیادی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کوئی کسی قسم کی بات کرے اسے اس میں اپنی تذلیل وتحقیر مضمر نظر آتی ہے۔ تم اندازہ لگاؤ کہ اس قسم کے نفسیاتی مریض سے گھر کا نقشہ کیا ہوگا۔ وہ گھر نہیں، نظر بندوں کا 'SUB - JAIL' ہوتا ہے۔ اور اس کا "سکون" قبرستان کا سکوت۔ مشکل یہ ہوتی ہے کہ اس قسم کے مریض کو باہر کے لوگ مرنجاں مرنج، شریف الطبع، نیک سرشت "نمازی پرہیزگار" کہہ کر اس کی تعریف کرتے رہتے ہیں جس سے اس کا مرض اور بڑھ جاتا ہے وہ احساس کمتری کے ساتھ خود فریبی کا شکار بھی ہو جاتا ہے۔

(۲) اس کے برعکس، ایک ٹائپ اُن کا ہوتا ہے جو احساس برتری (SUPERIORITY COMPLEX)

کی نہ ملی۔ اب ساس ہوں تو بہو کام کی نہیں ملی۔ یہ ملخّص ہے (ہمارے معاشرہ میں) ساس اور بہو کے رشتے کا۔ اس کی ساس نے جو کچھ اس کے ساتھ کیا تھا یہ اپنی بہو سے (شعوری یا غیر شعوری طور پر) اس کا انتقام لیتی ہے۔ بے شک ایسی ساس بھی مل جائے گی جس نے بہو کو بیٹی کی جگہ رکھا تھا، لیکن یہ مستثنیات میں سے ہے۔ معمولاً وہی ہوتا ہے جو پہلے کہا گیا ہے۔ میں نے اچھی خاصی سمجھدار خواتین کو دیکھا ہے رشتہ لینے کے لئے پھیرے کرتے کرتے جوتیاں ٹوٹ گئیں۔ منتیں خوشامدیں کرتے دانت گھس گئے۔ عزیزوں رشتہ داروں سے فرمائشیں ڈلوانے سے کام نہ چلا تو مزاروں پہ منتیں مانیں، سناجی سے دعائیں کرائیں۔ تعویذ ناگوں سے گھر بھر دیا۔ برسوں کی انتھک کوششوں کے بعد رشتہ ملا تو شادی کو ہفتہ بھر بھی نہیں گذرا ہو گا کہ بہو میں کیڑے ڈالنے شروع کر دیئے۔ اور بہو بھی کوئی اَن دیکھی، اجنبی نہ تھی، سگی بہن کی بیٹی! یہ بیچاری ناتجربہ کار، اِن وادیوں میں نووارد۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ ہوا کیا ہے۔ کل تک یہ گھر میرا اپنا (یعنی خالہ کا) گھر تھا۔ یہ میری خالہ تھیں جو اس قدر پیار کرتی تھیں۔ یہ میری خالہ زاد بہنیں تھیں جو ایسی محبت کے ساتھ پیش آتی تھیں۔ آج اس سے کیا قصور سرزد ہو گیا کہ اس گھر کی دیواریں تک اس کی دشمن ہو گئیں۔ یہ تبدیلی ایسی تھی جو اس کی کیا، کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی۔ صبح سے شام تک طعن و تشنیع کے نشتر اس کے معصوم سینے کو ہدف بنا رہے تھے۔ یہ حرفِ شکایت تک زبان پہ نہیں لا سکتی تھی۔ تنہائی میں خاوند سے کچھ کہتی تو وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے کہہ دیتا کہ تم دیکھ رہی ہو کہ میں کس قدر مجبور ہوں۔ تم اسے برداشت کرو۔ اس کا علاج کیا ہو سکتا ہے؟ اور اگر اس نے کہیں سے یہ سن پایا ہے کہ "جنت ماں کے قدموں تلے ہوتی ہے" تو ماں کے خلاف حرفِ شکایت تک سننا بھی اسے گوارا نہیں ہو گا۔

تمہیں یاد ہو گا طاہرہ بیٹی! کہ جب تم نے جاوید میاں کی شادی کے سلسلہ میں دریافت کیا تھا تو میں نے کہا تھا کہ جب تک ایسا انتظام نہ ہو جائے کہ یہ میاں بیوی اپنے مکان میں الگ رہیں اس وقت تک اس کی شادی نہ کرنا۔ یہ مشورہ میں نے ان حالات میں دیا تھا جب ماں اور ساس تمہارے جیسی تھی۔ اور اب تو سائرہ نے کسی اَن دیکھے گھر جانا ہے، اس لئے میری اس نصیحت کو کبھی نظر انداز نہ کرنا کہ بیٹی کی شادی اس لڑکے کے ساتھ کرنا جو معاشی طور پہ ماں باپ کا محتاج نہ ہو اور شادی کے بعد میاں بیوی اپنے الگ گھر میں رہیں۔ تم دیکھو گی کہ اس سے، کم و بیش ہر ایک کے ساتھ تعلقات خوشگوار

رہیں گے۔

اور سب سے آخر میں وہ وارننگ جسے اس باب میں سرفہرست ہونا چاہیئے۔ وہ یہ کہ ایسے لڑکے کے تو قریب تک نہ جانا جو مذہب پرست ہو (دین کا معتقد نہیں، مذہب پرست۔ جسے آجکل اسلام پسند کہہ کر پکارا جاتا ہے) وہ بچپن سے اس قسم کی آوازیں ہر محراب و منبر سے سنتا چلا آتا ہے اور انہیں عقیدہ کی حیثیت سے مانتا ہے کہ مرد عورتوں پر حاکم اور داروغہ ہیں۔ عورت مرد کی پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ اگر اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی جائیگی تو وہ ٹوٹنے لوٹ جائے گی، سیدھی نہیں ہوگی، خاوند، بیوی کو مار پیٹ بھی سکتا ہے۔ اس سے یہ نہیں پوچھنا چاہیئے کہ اس نے بیوی کو کیوں مارا ہے (رسول اللہ نے فرمایا کہ، اگر میں کسی کو حکم کر سکتا کہ اللہ کے سوا کسی اور کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ خاوند کو سجدہ کرے۔ (آپؐ نے فرمایا کہ) میرے بعد مردوں کے لئے کوئی فتنہ عورتوں سے زیادہ باعث مضرت نہیں۔ یہ اور اسی قسم کی اور وضعی روایات ہمارے ہاں متداول چلی آرہی تھیں کہ اب "سمندِ نازپہ اک اور تازیانہ ہؤا ہے۔" آج کل پاکستان میں اس قسم کے قوانین مرتب اور نافذ ہو رہے ہیں جن کی رُو سے فوجداری مقدمات میں عورت کی شہادت سرے سے قابل قبول نہیں۔ اور جن معاملات میں اس کی گواہی تسلیم کی جاسکتی ہے ان میں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہوگی۔ حتیٰ کہ اگر عورت قتل ہو جائے تو اس کی دیت (یعنی اس کی جان کی قیمت)، مرد کی دیت سے آدھی ہوگی۔

تم سوچو، بیٹی! کہ جو لڑکا ان اُمور کو خدا اور رسولؐ کے ارشادات اور شریعت کے احکام تسلیم کرتا ہو، وہ سفرِ زندگی میں بیوی کے ہمدوش چلنے کا تصور بھی کر سکے گا! رفاقت، مساوات چاہتی ہے، لیکن اس کے نزدیک مرد اور عورت کی مساوات اس کے عقائد کے خلاف ہوگی۔ بیوی کو برابری کا درجہ دینے کا تصور تک اس کے نزدیک گناہ ہوگا۔ وہ بیوی کو "جوتی تلے" رکھے گا اور خوش ہوگا کہ وہ احکام شریعت کا اتباع کر رہا ہے۔

معاشرہ میں اس قسم کی روایات اور معتقدات کے صدیوں سے متداول چلے آنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے "ماڈرن" طبقہ کا تحت الشعور بھی ان سے متأثر ہے۔ ہمارے معاشرہ میں بیوی تو میاں کو التزاماً "آپ" کہہ کر مخاطب کرتی ہے لیکن بہت کم شوہر ہوں گے جو بیوی کو "آپ" کہہ

کر پکاریں۔ وہ اسے "تم یا تُو" ہی کہے گا۔ انگریزی زبان ان کی پردہ پوشی کر دیتی ہے۔ اس میں 'YOU' دونوں کے لئے آتا ہے۔ اس سے ان کی جھجک بھی دُور ہو جاتی ہے۔ اور بات بھی بنی رہتی ہے۔ لیکن جہاں ضرورت اپنی زبان میں بات کرنے کی ہو، آپ اور تُو کی تفریق جھلک کر باہر آجاتی ہے۔

غیر شعوری طور پر ہی سہی، عورت کو کمتر سمجھنے کا احساس بیوی تک ہی محدود نہیں ہوتا، اس کے خاندان تک کو بھی محیط ہوتا ہے۔ تم نے قریب قریب ہر گھر میں دیکھا ہوگا کہ "داماد" جب سسرال آتا ہے (تو اس کے اپنے گھر میں خواہ اسے کوئی پوچھتا تک نہ ہو) یہاں وہ اپنے آپ کو شہزادہ سے کم نہیں سمجھتا۔ خصوصی خاطر مدارت کے علاوہ وہ متوقع ہوتا ہے کہ اس گھر کا ہر فرد اس کے اشارۂ ابرُو کا منتظر رہے۔ اس دوران میں بیوی بیچاری عجیب ضیق میں مبتلا رہتی ہے۔ اسے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اس کے ماں باپ، بہن بھائی تو ایک طرف، اس کے عزیز رشتہ داروں کی طرف سے بھی کوئی بات یا کوئی حرکت بھی ایسی سرزد نہ ہو جائے جو "میاں صاحب" کی طبعِ نازک پر گراں گزرے۔ اگر سُوءِ اتفاق سے کہیں ایسا ہو جائے تو اس ناکردہ گناہ کا اس کو جو خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہی صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب لڑکی کی ماں، اس کی ساس یا نند کے متعلق کوئی ایسی بات کہہ دے جو انہیں ناگوار گزرے۔ یہ معاملات بڑے نازک ہوتے ہیں۔ ان میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے معاشرہ میں بیٹی کی شادی کے متعلق بس یہی سمجھو کہ "دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے"۔

بات سسرال کے ہاں کی چلی ہے تو اس کا ایک گوشہ اور بھی سامنے آتا ہے جسے میں بصد تامل نوکِ قلم پر لا رہا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ بیوی کے بھائی کو "سالہ" کہتے ہیں۔ اور "سالہ" ہمارے ہاں گالی ہے۔ اسی طرح "سسرہ" کا لفظ بھی۔ کل تک یہ سالے اور سسرے "عزت اور شرافت کے حامل تھے۔ ایک بیٹی کی شادی کر دینے سے گالی بن گئے۔ (میں یہ کہہ رہا ہوں اور میرا کلیجہ شق ہو رہا ہے)۔ ماڈرن طبقہ نے اس خفت کو چھپانے کے لئے انگریزی زبان کا سہارا لینا شروع کر دیا۔ وہ 'IN-LAWS' کہتے ہیں۔ یہ بہر حال بہتر ہے۔ اگرچہ اس میں ایک دقت پیش آتی ہے 'BROTHER-IN-LAW' سالے کو بھی کہتے ہیں اور بہنوئی کو بھی۔ اور جب رشتہ کا تعارف متعین طور پر کرانا ہو تو پھر اسی پستی میں اترے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔[1]

---

[1] حالانکہ سالے کو سسرالی بھائی یا خسر زادہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

میرا یہ کچھ لکھنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ عورت کو ذلیل سمجھنے کے شجرۃ الزّقّوم (جہنم کے زہریلے درخت) کی شاخیں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ قرآن نے نسب اور صہر (سسرال) دونوں رشتوں کا ذکر کیا ہے (25/54) کیسا جنّت بداماں ہوگا وہ معاشرہ جس میں عورت اور مرد کو یکساں عزّت و تکریم کا مستحق سمجھا جائے اور پھر اس شجرِ طیّب کی ہر شاخ گل بہار اور پُر بہار ہو۔ انسان اسی معاشرہ میں اپنے مقامِ انسانیت تک پہنچ سکے گا جس میں ہر فرد دوسرے کا احترام کرے۔

کچھ باتیں سائرہ بیٹی کے لئے بھی۔ اگرچہ وہ تعلیم میں ہم سے بھی آگے ہے (وہ تو ماشاءاللہ پی۔ ایچ۔ ڈی ہے) لیکن ایک گوشہ ایسا ہے جس میں ہمیں سبقت حاصل ہے اور وہ ہے تجربہ۔ میں جو کچھ نونہالانِ ملّت سے کہا کرتا ہوں اس کی بنیاد (قرآنی حقائق کے ساتھ) تجربہ ہوتی ہے۔ اور چونکہ یہ "متاع" انہیں ہنوز حاصل نہیں ہوتی اس لئے وہ ہم، بڑے بوڑھوں کی باتیں تحمّل کے ساتھ سُن لیتے ہیں۔

شادی کے ساتھ مرد، عورت (میاں بیوی) ایسی وادی میں داخل ہوتے ہیں جس سے وہ قطعاً نا آشنا ہوتے ہیں۔ اس لئے انہیں اس میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھنا چاہیئے۔ کسی فیصلہ میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ سائرہ بیٹی کا واسطہ ایک ایسے مرد سے پڑے گا جو ابھی کل تک اجنبی تھا۔ اس کے متعلق جو معلومات اسے حاصل ہوں گی، انہیں اس کا حدود اربعہ سمجھنا چاہیئے۔" وہ ہے کیا" اس کا اسے کچھ علم نہیں ہوگا۔ اسے سمجھنے کے لئے کافی وقت اور ضبط درکار ہوگا۔ اس کے متعلق عجلت میں کوئی رائے قائم نہیں کرنی چاہیئے۔ ازدواجی زندگی عمر بھر کی رفاقت ہوتی ہے اور رفاقت ہم آہنگی چاہتی ہے۔ اس مقصد کے لئے سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ مزاج۔ ذوق۔ طبیعت۔ دلچسپی اور دلکشی کے علائق اور زندگی کے مقاصد اور ان کے حصول کے طریق و ذرائع میں کون کون سے امور میں یکسانیت کی تو دُور کی بات ہوگی، (کم از کم) اشتراک ہے اور کسی حد تک، ان مشترک اقدار میں خاوند کے ہمدوش چلنا چاہیئے اور اختلافی امور کو چھیڑنا نہیں چاہیئے۔ جوں جوں مشترک امور میں ہم آہنگی بڑھتی جائیگی اختلافی امور کا بُعد کم ہوتا جائے گا۔ اس کے لئے وقت درکار ہوگا۔ اس کے اسباب کچھ بھی ہوں، جب یہ امر واقعہ ہے کہ ہمارے معاشرہ میں مردوں کے تحت الشّعور میں یہ (غلط) احساس جاگزیں ہے کہ عورتیں مردوں سے کمتر ہوتی ہیں، تو اگر کسی وقت خاوند کی طرف سے اس جذبہ کا اظہار ہو جائے تو اسے اپنی توہین سمجھ

کر روٹھ کر نہیں بیٹھ جانا چاہئے، اسے ہنس کر ٹال دینا چاہئے۔ تاکہ اسے خود اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اگر شریف النفس انسان کے ایگو کو مجروح نہ کیا جائے تو اُسے اپنی غلطی کا احساس جلد ہو جاتا ہے۔ اخلاقی امور سے متعلق گفتگو میں اپنی آواز کو خاوند کی آواز کی (PITCH) سے نیچے رکھنا چاہئے۔ میاں بیوی یوں سمجھو گویا ٹینس کے کھلاڑی ہوتے ہیں۔ اگر ایک طرف سے 'STROKE' ہلکا لگایا جائے تو دوسری طرف کی شدت خود بخود کم ہو جاتی ہے۔ اختلافی نزاع کو کبھی اپنی اَنا کا مسئلہ نہیں بنانا چاہئے۔ ارشادِ خداوندی ہے۔ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (۲/۱۴۸) "دوسرے سے آگے بڑھنا چاہتے ہو تو حسن و خوبی کے امور میں آگے بڑھو"۔ اپنی اَنا کا مظاہرہ اِن امور میں کرو۔ اس سے اَنا، ایگو، نہیں رہتا۔ خودی (PERSONALITY) بن جاتا ہے۔

پھر اسے بھی ہمیشہ پیشِ نظر رکھو کہ میاں بیوی کی زندگی "ہم زاد" ہی کی نہیں ہوتی "ہم راز" کی بھی ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے اسے "لباس اور بدن" (۲/۱۸۷) کی تشبیہ سے واضح کیا ہے۔ اس لئے میاں بیوی کا راز، میاں بیوی تک ہی رہنا چاہئے۔

جسطرح تم چاہتی ہو کہ خاوند تمہارے ماں باپ بہن بھائیوں کی عزت کرے اور ان سے شفقت اور محبت سے پیش آئے، اسی طرح تم بھی اس کے والدین اور اعزّہ کی عزت کرو اور ان سے شفقت سے پیش آؤ۔ زندگی ہمیشہ تعاون (RECIPROCITY) چاہتی ہے۔ دونوں ہاتھوں سے تالی بجتی ہے، ایک ہاتھ سے چپت لگتی ہے۔

جاتے جاتے، دو ایک باتیں خود تمہارے لئے بھی۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں سائرہ سے بڑا پیار ہے۔ تم نے اسے بڑے چاؤ چونچلوں سے پالا ہے۔ اس نے گھر بھر کو سنبھال بھی رکھا ہے۔ اس کی رخصتی کو (خدا وہ دن خیریت سے لائے) تم بہت محسوس کرو گی۔ اس کے لئے تمہیں تیار رہنا چاہئے۔ یاد رکھو! جہاز بیشک گودیوں میں محفوظ رہتے ہیں۔ لیکن جہازوں کو گودیوں میں باندھ رکھنے کے لئے تو بنایا نہیں جاتا۔ انہیں سمندر کی موجوں کے حوالے کرنا ہوتا ہے۔ بچیوں کو وداع کرنے کے بعد ہماری نیک آرزوئیں ان کے ساتھ رہنی چاہئیں اور مفید مشورے۔ لیکن ہمیں مشورے اپنے حالات پر قیاس کر کے نہیں دینے چاہئیں۔ ان کے حالات اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق دینے چاہئیں اور اس پر اصرار نہیں کرنا چاہئے کہ وہ

من وعن تمہارے مشورہ پر عمل کرے۔ مشورہ کو مشورہ ہی رہنے دینا چاہیے۔ آرڈی ننس نہیں بنا دینا چاہیئے۔ پھر اسے بھی ملحوظ رکھنا کہ نئی نسل بیشتر امور میں ہم سے کہیں آگے ہے، ہمیں ان کا احترام کرنا چاہیئے۔

لڑکی کو رخصت کرنے کے بعد تم نے اس کے ماں باپ کو اکثر کہتے سُنا ہو گا کہ خدا کا شکر ہے بوجھ سر سے اُتر گیا۔ یہ صحیح نہیں۔ یہ بوجھ تو زندگی بھر سر پر رہتا ہے۔ رخصتی سے لڑکی کے مسائل (PROBLEMS) ختم نہیں ہو جاتے۔ اس کے بعد اس کے نئے مسائل شروع ہوتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں بیٹی کا تعلق ماں باپ کے ساتھ کب تک رہتا ہے۔ یہ راز مجھے ہمارے گاؤں کی ایک بڑھیا (خالہ) نے بتایا۔ تمہیں معلوم ہے کہ (ہماری) اماں جی (مرحومہ) گاؤں رہا کرتی تھیں۔ ہم یہاں شہر میں رہتے تھے۔ انہوں نے قریب سو سال کی عمر میں وفات پائی۔

وفات کی خبر سُن کر ہم سب وہاں گئے۔ میں نے چھوٹے بھائی سے کہا کہ وہ سامنے قصبے سے کفن دفن کا سامان لے آئے۔ پاس ہی ایک بڑھیا (خالہ) کھڑی تھی۔ اس نے کہا کہ بیٹا! تم نے بھائی سے کیا کہا ہے۔ میں نے کہا کہ اس سے کہا ہے کہ جا کر کفن دفن کا سامان لے آئے۔ یہ سُن کر اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا کہ ہم نے سن رکھا تھا کہ تم بڑے عالم فاضل ہو لیکن آج معلوم ہوا کہ تمہیں کچھ بھی نہیں آتا۔ تمہیں معلوم نہیں کہ بیٹی کا کفن اس کے میکے والوں کے ذمہ ہوتا ہے۔ یہ ہمارے گاؤں کی بیٹی تھی اس کا کفن دفن ہمارے ذمہ ہے۔ تم (سسرال والوں) کے ذمے نہیں۔ اس بوڑھی خالہ نے تو معمول کی بات کہہ دی لیکن میرے سامنے سوچ کے کئی دروازے کھول دیئے۔ میں نے سوچا کہ جس معاشرہ میں بیٹی کے ماں باپ کے ساتھ تعلق کی یہ کیفیت ہے کہ اس کا کفن دفن بھی ان کے ذمہ ہوتا ہے، اسے گھر سے رُخصت کر کے یہ سمجھ لینا کہ اس کی ذمہ داری ختم ہوئی، کم فہمی ہے۔ اس کے ساتھ تو عمر بھر کا رشتہ رہتا ہے۔ مغربی معاشرہ اس رشتے کی گہرائی اور پہنائی کو کیسے سمجھ سکتا ہے جہاں بالغ ہو جانے کے بعد بیٹی ماں باپ کے گھر میں 'PAYING GUEST'[ل] کی حیثیت سے رہتی ہے۔ اور رخصتی کے وقت ہیلو ڈیڈ اور ہیلو ممی کہکر روانہ ہو جاتی ہے اور پھر پلٹ کر بھی نہیں دیکھتی۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ مشرق

ل۔ ہماری زبان میں اس کے لئے کوئی لفظ نہیں اس لئے کہ ہمارے ہاں اس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا کہ مہمان کو بھی ہو سکتا ہے۔

کی وہ "یا ہمگی" اور مغرب کی یہ "بے ہمگی" دونوں انتہائی (EXTREMES) ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اولاد سے پرورش کی مدت تک تعلق حیوانات کو بھی رہتا ہے۔ انسانی تعلّقات وہیں تک نہیں ہوتے۔ قرآن مُوَدّۃ فی القربیٰ (۲۳/۴۲) کی تلقین کرتا ہے۔ جو حیوانی سطح سے اُوپر کی بات ہے۔

لیکن بیٹی کے ساتھ بھرپور رشتہ استوار رکھنے کے باوجود، کوشش یہ کرنی چاہیئے کہ وہ اپنے (اُس) گھر کو بسائے۔ ادھر کی ہو کر نہ رہ جائے۔ اس حقیقت کو اسے (اور خود ماں باپ کو) پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ لڑکی کا گھر اس کا وہی گھر ہوتا ہے۔ ماں باپ کا گھر تو یوں سمجھئے گویا تکان اُتارنے کے لئے تفریح گاہ ہوتا ہے۔

خط خاصا لمبا ہو گیا۔ لیکن اتنے عرصہ کے بعد خط لکھنے میں ایسا ہونا چاہیئے تھا۔ اچھا خدا حافظ بسا ترہ بیٹی کو بہت بہت دعائیں۔

مئی ۱۹۸۴ء　　تمہارا چچا جان

پرویز

قرآنی احکام

قرآنی احکام

ذیل میں، مختصر طور پر، ان احکام کو درج کیا جاتا ہے جو مرد و عورت کی حیثیت اور ان کے باہمی تعلقات کے متعلق قرآن کریم میں آئے ہیں۔ یہ احکام سابقہ خطوط میں بیان کئے جا چکے ہیں لیکن وہاں یہ منتشر طور پر آئے ہیں۔ اس باب میں ان سب کو (مختلف عنوانات کے ماتحت) یکجا کر دیا گیا ہے تاکہ جس موضوع کے متعلق آپ چاہیں تمام احکام بیک نظر سامنے آجائیں۔ ان احکام کی تشریح سابقہ خطوط میں کی جا چکی ہے اس لئے اس جگہ انہیں بغیر تشریح کے درج کیا جاتا ہے (بجز ان مقامات کے جہاں ان کی مزید تشریح ضروری سمجھی گئی ہے۔)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مرد اور عورت کی حیثیت

(۱) مرد اور عورت ایک ہی اصل کی شاخیں ہیں اس لئے پیدائش کے اعتبار سے ان میں ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا۔ (۷/۱۸۹)

"اللہ وہ ہے جس نے تم سب کو نفسِ واحدہ[1] سے پیدا کیا اور اس سے اس کے جوڑے بنائے"۔

(۲) مرد اور عورت ایک دوسرے کے جزو ہیں۔

بَعْضُکُمْ مِّنْ بَعْضٍ ج (۳/۱۹۵)

"تم سب مرد اور عورت ایک دوسرے میں سے ہو"

(۳) تقسیمِ عمل کے لئے بعض خصوصیات مردوں میں ایسی ہیں جو عورتوں میں نہیں اور بعض خصوصیات عورتوں میں ایسی ہیں جو مردوں میں نہیں۔ ان خصوصیات کے اعتبار سے مردوں کو عورتوں پر اور عورتوں کو مردوں پر فضیلت حاصل ہے۔

فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ (۴/۳۲ ، ۴/۳۴)

"اللہ نے مردوں اور عورتوں میں ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے"۔

(۴) تاریخ اس پر شاہد ہے کہ مرد کا عورت پر بالادست ہونے کا خیال اس وقت پیدا ہوا جب

---

[1] اس کی تشریح "ابلیس و آدم" (عنوان انسان) میں ملے گی۔

معاشرہ میں ذاتی ملکیت (PRIVATE PROPERTY) کا وجود عمل میں آیا۔ مرد نے اپنے آپ کو پرائیویٹ پراپرٹی کا مالک بنالیا اور اس طرح عورت اقتصادی طور پر اس کی دست نگراں ہو گئی۔ قرآن نے مرد کی اس بالادستی کو ختم کرنے کے لئے یہ حکم دے دیا کہ مرد اور عورت اپنی اپنی کمائی کے آپ مالک ہوتے ہیں۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ (۴/۳۲)

"مرد جو کچھ کمائیں وہ ان کا حصہ ہے اور عورتیں جو کمائیں وہ ان کا حصہ"

اسی طرح قرآن نے میراث میں بھی عورت کا الگ حصہ مقرر کیا (جس کا ذکر آگے چل کر آئے گا)

(۵) اور ہر ایک کو اس کے اعمال کا بدلہ ملتا ہے۔

أَنِّي لَآ أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ ۚ (۳/۱۹۵)

"تم میں سے کوئی مرد ہو یا عورت۔ میں کسی کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا"

(۶) یہ بھی صحیح نہیں کہ اماں حوا شیطان کے چکمہ میں آگئی تھیں اور انہوں نے بابا آدم کو بہکایا تھا۔ اوّل تو قرآن کی رُو سے آدم اور حوا کسی خاص آدمی اور عورت کے نام نہیں (حوا کا تو نام بھی قرآن میں نہیں) آدم اور اس کی بیوی کا ذکر ہے اور اس سے مراد نوعِ انسانی کے مرد اور عورت ہیں۔ باقی رہا شیطان کا بہکانا سو اس کے متعلق قرآن نے صاف الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ (۲/۳۶) "شیطان نے ان دونوں کو پھسلا دیا" اس لئے یہ سمجھنا غلط ہے کہ گناہ کی ابتداء عورت سے ہوئی ہے اور وہی مرد کی لغزشوں کی ذمہ دار ہے۔ مرد اور عورت دونوں میں لغزش کے امکان ہیں اور ایک کی ذمہ داری دوسرے پر عائد نہیں ہوتی۔

(۷) جو خصوصیات مومن مردوں کی ہیں وہی خصوصیات مومن عورتوں کی ہیں۔ مُسْلِمِيْنَ اور مُسْلِمَاتِ۔ مُؤْمِنِيْنَ اور مُؤْمِنَاتِ۔ قَانِتِيْنَ اور قَانِتَاتِ۔ صَادِقِيْنَ اور صَادِقَاتِ۔ صَابِرِيْنَ اور صَابِرَاتِ۔ خَاشِعِيْنَ اور خَاشِعَاتِ۔ مُتَصَدِّقِيْنَ اور مُتَصَدِّقَاتِ۔ صَائِمِيْنَ اور صَائِمَاتِ۔ حَافِظِيْنَ (عصمت) اور حَافِظَاتِ۔ ذَاكِرِيْنَ اور ذَاكِرَاتِ۔ أَعَدَّ اللّٰهُ لَهُم مَّغْفِرَةً وَّ

أَجْرًا عَظِيمًا ﴿۳۵/۳۳﴾

(۸) لیکن ان بنیادی خصوصیات کے اشتراک کے باوصف، مردوں اور عورتوں کے فطری وظائف زندگی میں ایسا فرق ہے جس کا ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ فطری تقسیمِ کار کی رُو سے عورت کے ذمے اولاد کی پیدائش، حمل، پرورش اور ابتدائی تربیت ہے۔ ان فرائض کی سرانجام دہی میں اس کا اتنا وقت اور توانائی صرف ہو جاتی ہے کہ وہ حصولِ معاش کے قابل نہیں رہ سکتی۔ اس کے برعکس مردوں کے راستے میں ایسے کوئی موانعات نہیں۔ اس لئے قرآن نے اس فطری تقسیم کی رُو سے کہہ دیا کہ اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ﴿۴/۳۴﴾ "ان خصوصیات کی بنا پر جن کی وجہ سے ایک جنس (SEX) کو دوسری جنس پر فوقیت حاصل ہے۔ (یعنی مردوں کو عورتوں پر اور عورتوں کو مردوں پر) مردوں کے ذمے اکتسابِ رزق ہے۔ عورت کے ذمے نہیں۔ عورتوں کی یہ ضروریات مرد پوری کریں گے اس دولت کے ذریعے جسے وہ کما کر لائیں گے"۔ اس دولت کو گھر کی تمام ضروریات کے لئے کھلا رکھا جائے گا یہ نہیں کہ چونکہ مرد اسے کما کر لایا ہے، اس لئے وہی اس کا مالک ہے۔ وہ بیوی کو اس میں سے بطور خیرات کچھ دے گا۔ یہاں تقسیمِ عمل ہے۔ کچھ کام مرد کر رہا ہے۔ کچھ عورت کر رہی ہے۔ جب عورت کی یہ ضروریات اس طرح پوری ہوں گی تو اس کی فطری صلاحیتوں کی نشوونما ہو سکے گی اور وہ ان صلاحیتوں کو قانونِ خداوندی کے مطابق صرف کر سکے گی۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۲۔ نکاح

(۱) بیوی بچوں کی محبت انسان کے لئے وجہ کشش ہے۔ اس لئے عورت کو نفرت کی شئے نہیں سمجھنا چاہیے۔

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ ... (۳/۱۴)

"بیوی بچوں کی محبت لوگوں کے لئے مرغوب بنائی گئی ہے"

(۲) یہ تعلق نکاح کے ذریعے قائم ہوتا ہے جو اس امر کا معاہدہ ہوتا ہے کہ ہم ان حدود کے مطابق جو اللہ نے مقرر کی ہیں، میاں بیوی کی زندگی بسر کرنے کا عہد کرتے ہیں۔

وَ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝ (۴/۲۱)

"وہ تم سے ایک مضبوط عہد لے چکی ہیں"

(۳) یہ معاہدہ (نکاح) بالغ مرد اور بالغ عورت میں ہوسکتا ہے۔ کم سنی میں نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ قرآن نے خود "بلوغت" کو "نکاح عمر" سے تعبیر کیا ہے

چنانچہ سورۂ نساء میں ہے۔

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ ... (۴/۶)

"تم (جب یتیموں کے سرپرست بنو تو) ان کی پرکھ کرتے رہو تا آنکہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔ پھر اگر تم ان میں عقل کی پختگی پاؤ تو ان کے مال و متاع ان کے حوالے کر دو"

یہاں یہ کہا گیا ہے کہ جب یتیم "نکاح کی عمر" کو پہنچ جائیں تو ان کا مال ان کے حوالے کر دو۔ اور سورۂ انعام میں ہے۔

وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ ... (۶/۱۵۳) نیز (۱۷/۳۴)

"اور یتیموں کے مال کے قریب تک نہ جاؤ بجز احسن طریقہ کے تاآنکہ وہ جوانی کی عمر تک پہنچ جائیں۔"

اس سے واضح ہے کہ "نکاح کی عمر" جوانی ہے۔ جب تک لڑکی اور لڑکا جوان نہ ہو جائیں، قرآن کی رُو سے وہ نکاح کی عمر کو نہیں پہنچتے۔ لہٰذا قرآن کی رُو سے نابالغ کی شادی ہو نہیں سکتی کیونکہ وہ نکاح کی عمر (یعنی جوانی) کو نہیں پہنچا۔

(۴) نکاح، مرد اور عورت، دونوں کی رضامندی سے ہوگا۔ چنانچہ مردوں کے متعلق ہے۔

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (۳/۴)

"تم ایسی عورتوں سے شادی کرو جو تمہیں پسند ہوں"

اور عورتوں کے متعلق کہا کہ

لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ط (۱۹/۴)

"یہ تمہارے لئے قطعاً جائز نہیں کہ تم عورتوں کے زبردستی مالک بن جایا کرو"

نکاح کے لئے جب پسندیدگی ضروری ہے تو اس سے صرف قبولِ صورت ہونا ہی مقصود نہیں۔ قرآن اس کی بھی تاکید کرتا ہے کہ فریقین کے خیالات میں زیادہ سے زیادہ موافقت ہونی چاہیئے۔

(۵) بالغ عورت اگر نکاح کے معاملات براہِ راست (خود) طے نہ کرنا چاہے تو اپنی طرف سے کسی کو اپنا مختارِ کار بنا سکتی ہے۔ سورۂ بقرہ میں اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ (۲۳۷/۲) سے عورت کا مختارِ کار مراد ہے۔ یعنی وہ شخص جسے عورت نے اپنی مرضی سے اپنے نکاح کے معاملات میں صاحبِ اختیار بنا دیا ہو[1]۔ (چنانچہ کم سنی میں نکاح نہیں ہو سکتا۔ اس لئے نکاح کے لئے ولی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا)۔

(۶) جو شخص نکاح کی مقدرت نہ رکھے (یا جسے بیوی نہ مل سکے) اسے ضبطِ نفس سے کام لینا چاہیئے۔

---

[1] جب معاملہ عدالت میں پہنچ جائے تو بیدہٖ عقدۃ النکاح سے مراد ہوگا وہ حاکم جو نکاح فسخ کر دینے کا مجاز ہو۔

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا ... (۲۴/۳۳)

"جس شخص کو نکاح (کا سامان یا زوج) میسر نہ آسکے اسے چاہئے کہ اپنے آپ کو بچائے رکھے"

اس لئے کہ نکاح کے علاوہ جنسی تعلق کی کوئی صورت جائز نہیں۔

(۷) مومن مرد کا مشرک عورت سے اور مومن عورت کا مشرک مرد سے نکاح جائز نہیں (دیکھئے ۲/۲۲۱)
اس کی وجہ پہلے بیان ہو چکی ہے۔

(۸) البتہ مسلمان مرد اہل کتاب کی عورتوں سے شادی کر سکتے ہیں۔ (دیکھئے ۵/۵) لیکن یہ صرف جائز ہے جو اُمت کے اجتماعی مفاد و مصالح سے مشروط ہے۔

(۹) حسب ذیل عورتوں سے نکاح حرام ہے۔

ماں (حقیقی ہو یا سوتیلی)۔ بیٹی۔ بہن۔ پھوپھی۔ خالہ۔ بھتیجی۔ بھانجی۔ جس عورت کا دودھ پیا ہو۔ یا جو لڑکی دودھ میں شریک ہو۔ (مثلاً رشید اور عائشہ نے ایک عورت خدیجہ کا دودھ پیا ہے۔ تو رشید نہ عائشہ سے شادی کر سکتا ہے نہ خدیجہ سے) بیوی کی ماں سے بھی نکاح جائز نہیں۔ اور جس عورت سے تم شادی کرو اگر اس کی (پہلے خاوند سے) لڑکی ہو جس کی تم نے پرورش کی ہے تو اس سے بھی نکاح جائز نہیں۔ اگر اس عورت سے صرف نکاح ہوا ہو۔ اور مقاربت نہ ہوئی ہو تو پھر اس لڑکی سے نکاح کیا جا سکتا ہے اور یہ بھی جائز نہیں کہ دو بہنوں سے بیک وقت نکاح کیا جائے۔ نیز حقیقی بیٹے کی بیوی سے بھی نکاح جائز نہیں۔

"اور کسی ایسی عورت سے نکاح جائز نہیں جو پہلے ہی کسی کے نکاح میں ہے" (۴/۲۲-۲۴)

نکاح سے مقصد محض جنسی جذبہ کی تسکین نہیں بلکہ ان تمام ذمہ داریوں کا نباہنا ہے جو نکاح سے عائد ہوتی ہیں۔ اگر کوئی مرد کسی عورت سے محض جنسی تعلق پیدا کرتا ہے اور اس تعلق کی ذمہ داریاں اپنے سر نہیں لیتا اور ان حدود کی پرواہ نہیں کرتا جو نکاح سے عائد ہوتی ہیں تو اس نے خواہ "نکاح کی رسم" کو بھی پورا نہ کر لیا ہو، قرآن کے نزدیک وہ حقیقی معنوں میں نکاح نہیں ہوگا اس لئے اس نے مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ ط (۴/۲۴) سے اس کی وضاحت کر دی ہے۔

مُحۡصِنِیۡنَ کے معنی ہیں۔ حدود و قیود کے اندر رہنے کے لئے اور مُسَافِحِیۡنَ سے مراد ہے محض جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے۔ اس لفظ کا مادہ سفح ہے جس کے معنی ہیں "بہا دینا"۔

(۱۰) نکاح سے مرد اور عورت دونوں پر یکساں حقوق اور یکساں ذمہ داریاں عاید ہو جاتی ہیں۔ "وَ لَهُنَّ مِثۡلُ الَّذِیۡ عَلَیۡهِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ (۲/۲۲۸) اور قاعدے کے مطابق عورت کے حقوق بھی اتنے ہی ہیں جتنی اس کی ذمہ داریاں ہیں"

(۱۱) میاں بیوی کو آپس میں ایک دوسرے کا راز داں اور پردہ دار ہونا چاہیئے کہ ان کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو۔ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمۡ وَ اَنۡتُمۡ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ (۲/۱۸۷) "وہ تمہارے لئے بمنزلہ لباس کے ہیں اور تم ان کے لئے بمنزلہ لباس کے"

(۱۲) میاں بیوی کے تعلقات ایسے خوشگوار ہونے چاہئیں کہ اس سے گھر میں کامل سکون اور اطمینان پیدا ہو جائے۔ قرآن کی رُو سے ازواج (جوڑوں) کا مطلب ہی یہ ہے۔ لِتَسۡكُنُوۡۤا اِلَيۡهَا۔ (۳۰/۲۱) "تاکہ ان سے تسکین حاصل ہو"۔ اور باہمی مودّت اور رحمت (محبت اور رفاقت) پیدا ہو۔ وَجَعَلَ بَيۡنَكُمۡ مَّوَدَّةً وَّ رَحۡمَةً ؕ (۳۰/۲۱)

(۱۳) اس سے رشتوں میں بھی وسعت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن نے نسب اور سسرال دونوں رشتوں کا ذکر کیا ہے۔ فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّ صِهۡرًا (۲۵/۵۴)

(۱۴) لیکن بیوی بچوں کی محبت اور ان کی ضروریات وغیرہ پورا کرنے کا خیال اگر انسان کو قوانین خداوندی سے غافل کر دیتا ہے اور وہ جائز و ناجائز کی تمیز بھی بھلا دیتا ہے تو یہی بیوی بچے اس کی تباہی کا موجب بن جاتے ہیں۔ اسی مقصد کے لئے کہا گیا ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ مِنۡ اَزۡوَاجِكُمۡ وَ اَوۡلَادِكُمۡ عَدُوًّا لَّكُمۡ فَاحۡذَرُوۡهُمۡ ۚ (۶۴/۱۴) "اے جماعت مومنین! یقیناً تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض وہ بھی ہیں جو در حقیقت تمہارے دشمن ہیں۔ ان سے محتاط رہو" ان کی خاطر اگر تم ناجائز طریق سے دولت اکٹھی کرنے لگ جاؤ گے تو یہ دولت تمہارے لئے مصیبت کا موجب بن جائے گی۔ کیونکہ یہ غارت گر دین و دانش ہو جائے گی۔ اِنَّمَاۤ اَمۡوَالُكُمۡ وَ اَوۡلَادُكُمۡ فِتۡنَةٌ ؕ (۶۴/۱۵) کے یہی معنی ہیں۔ اگر ان چیزوں کی وجہ سے انسان نے قوانین خداوندی کو فراموش یا نظر انداز کر دیا تو یہ اسے جہنم میں لے جائیں گی۔ لَا تُلۡهِكُمۡ اَمۡوَالُكُمۡ

وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ (۶۳/۹) "اگر ان میں سے کوئی بھی چیز نظامِ خداوندی کی راہ میں حائل ہوگئی۔ تو سمجھو کہ تم برباد ہوگئے" (۹/۶۳) اس لئے ضروری ہے کہ تم اس بربادی سے محفوظ رہنے کا ہر وقت خیال رکھو۔ خود ہی محفوظ رہنے کا نہیں بلکہ اپنے اہل و عیال کو محفوظ رکھنے کا بھی۔ تمہارا فریضہ ان کی پرورش ہی نہیں، انہیں جہنم سے محفوظ رکھنا بھی ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا ... (۶۶/۶)۔ (اس ضمن میں "اولاد" کا عنوان بھی دیکھئے۔)

---

(۱۵) جنسی اختلاط ایک عام انسانی مسئلہ ہے۔ اس لئے قرآن نے اس کے متعلق کسی خاص ہدایت کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اس ضمن میں اتنا ہی کہا ہے کہ حیض کے دنوں میں باہمی مقاربت جائز نہیں (۲/۲۲۲) مقصد اس سے افزائش نسل ہے جیسا کہ اس آیت کے مفہوم سے واضح ہے۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ (۲/۲۲۳)

"تمہاری بیویاں تمہارے لئے بمنزلہ کھیتی کے ہیں (جس میں تخم ریزی کی جاتی ہے) اس لئے تم اپنی کھیتی میں جب جی چاہے آؤ۔ (یعنی جب مقصد تخم ریزی ہو)"۔

البتہ روزے کی حالت میں اس کی اجازت نہیں۔ لیکن رمضان کی راتوں میں اس کی ممانعت نہیں۔ (۲/۱۸۷) اعتکاف کی حالت میں بھی اجازت نہیں۔ (۲/۱۸۷)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۳۔ مہر

چونکہ عورت کے فرائضِ زندگی ایسے ہیں جن کی وجہ سے وہ اکتسابِ رزق (روٹی کمانے) کے لئے کافی وقت نہیں نکال سکتی۔ اس لئے قرآن ایسا انتظام چاہتا ہے جس سے اس کی اقتصادی آزادی بالکل سلب نہ ہو جائے۔ اس مقصد کے لئے اس نے نکاح کے لئے یہ شرط مقرر کی ہے کہ مرد، عورت کو کچھ مال بطور تحفہ (FREE GIFT) کے دے۔ اسے عام طور پر مہر کہا جاتا ہے۔ قرآن نے اس کے لئے صدقہ، متاع اور اجور کے الفاظ استعمال کئے ہیں اور اسے مال سے تعبیر کیا ہے۔ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ (۴/۲۴) لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ روپے ہی کی شکل میں ہو۔

(۲) یہ مہر کسی چیز کا معاوضہ نہیں ہوتا۔ بلکہ بلا کسی قسم کے معاوضہ کے خیال کے تحفۃً ادا کرنا ہوتا ہے۔ اس کے لئے قرآن نے "نِحْلَةً" کا لفظ استعمال کیا ہے (۴/۴) جس کے معنی ہیں بلا بدل۔ اس طرح جیسے شہد کی مکھی چھتے میں شہد لا کر جمع کر دیتی ہے۔ اس میں اسے کسی معاوضے یا بدلے کا خیال قطعاً نہیں ہوتا۔

(۳) مہر کی کوئی مقدار قرآن نے مقرر نہیں کی۔ جو کچھ بھی باہمی رضامندی سے طے پا جائے، وہ مہر ہے۔ لیکن چونکہ اس کا ادا کرنا ضروری ہے اس لئے اسے علیٰ قدرِ وسعت ہونا چاہیئے۔ (دیکھئے ۲/۲۳۶) وسعت کے لحاظ سے یہ سونے کا ڈھیر بھی ہو سکتا ہے۔

وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا ط (۴/۲۰)

"اگر تم نے اسے سونے کا ڈھیر بھی دے دیا ہے تو اس سے واپس نہ لو"

(۴) مہر کی ادائیگی نکاح کے ساتھ ہی ہو جانی چاہیئے۔ (اگر عورت کی رضامندی سے) اُسے اُس وقت ادا نہ کیا جائے تو اس میں توقف بھی ہو سکتا ہے۔ اس پر سورۂ بقرہ کی ایک آیت دلالت کرتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اگر تم عورت کو طلاق دو قبل اس کے کہ تم نے اسے چھوا ہو اور اس کا مہر بھی مقرر

کرلیا تھا، تو اس مقررہ مہر کا آدھا دے دو۔ (۲/۲۳۷) اس سے ظاہر ہے کہ ایسی صورت بھی ممکن ہے جس میں نکاح کے ساتھ ہی مہر ادا نہ کیا گیا ہو۔ (نیز دیکھئے شق ۶)

(۵) مہر عورت کی ملکیّت ہوتا ہے اور کسی کو حق نہیں کہ اسے اس سے محروم کر دے۔ البتّہ عورت اپنی رضامندی سے اس میں سے کچھ چھوڑ بھی سکتی ہے اور بالکل معاف بھی کر سکتی ہے۔ چنانچہ

(ا) سورۂ نساء میں ہے کہ "عورتوں کو ان کا مہر بطیبِ خاطر اور بغیر کسی بدلہ کے خیال کے ادا کر دو۔ لیکن وہ اپنی خوشی سے اس میں سے کچھ چھوڑ دیں تو یہ تمہارے لئے جائز ہے" (۴/۴)

(ب) اسی سورۃ میں دوسری جگہ ہے کہ باہمی رضامندی سے یا ثالثوں اور عدالت کے ذریعے اس میں بعد میں کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے۔ (۴/۲۴)

(ج) طلاق قبل از خلوت کی صورت میں اُوپر بتایا جا چکا ہے کہ مہر کا نصف واجب الادا ہو گا لیکن عورت، یا اس کا مختارِ کار یا عدالتِ مجاز چاہے تو اسے معاف بھی کر سکتی ہے (۲/۲۳۷)

(۶) اگر کوئی ایسی شاذ صورت پیدا ہو جائے جس میں مہر مقرر نہ کیا گیا ہو تو اسے مرد کی وسعت کے مطابق مقرر کر لینا چاہیئے۔ (دیکھئے ۲/۲۳۶)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۴۔ تعلّقات کی کشیدگی

نکاح کا مدار خوشگواری تعلّقات پر ہے لیکن بعض اوقات ایسے حالات بھی پیدا ہو جاتے ہیں جن میں میاں بیوی کے تعلّقات میں کشیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ قرآن کی کوشش یہ ہے کہ جس طرح ممکن ہو ان تعلّقات کو منقطع نہ ہونے دیا جائے۔ بلکہ ان کی استواری کی صورت پیدا کی جائے۔

(۱) کشیدگیٔ تعلّقات کی ایک صورت یہ ہے کہ بعض اوقات انسان (از روئے جہالت) غصّہ میں آکے بیوی کو (مثلاً) ماں کہہ دیتا ہے اور جب غصّہ فرو ہو جائے تو اپنی بات پر سخت نادم ہوتا ہے۔ (اسے عربی زبان میں ظہار کہتے ہیں۔) قرآن کہتا ہے کہ اس قسم کی لغو قسموں کا فی الحقیقت مطلب کچھ نہیں ہوتا اس لئے انہیں ان کے اصلی معنوں میں نہیں لینا چاہئے کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کی ازدواجی زندگی ہی منقطع ہو چکی ہے۔ لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰہُ بِاللَّغۡوِ فِیۡۤ اَیۡمَانِکُمۡ (۲/۲۲۵) "اللہ تمہاری بے حقیقت، لغو، قسموں پر گرفت نہیں کرتا" دوسری جگہ ہے کہ ایسا کہہ دینے سے بیوی ماں نہیں بن جاتی۔ (۳۳/۴) البتہ قرآن مومنوں کو تاکید کرتا ہے کہ وہ ہر قسم کی لغویات سے مجتنب رہا کریں۔ (۲۳/۳) اس میں اس انداز کی لغو قسمیں بھی آجاتی ہیں۔ لیکن چونکہ اس قسم کا بے جا غصّہ (جس میں انسان ہوش حواس کھو کر ایسی باتیں کرنے لگ جائے) گھر کی فضا کو ناخوشگوار بنا دیتا ہے، اس لئے اس کی روک تھام ضروری ہے۔ اس کے لئے قرآن نے ایسی حرکت کا کفّارہ تجویز کیا ہے۔ یعنی ایسی صورت میں ازدواجی تعلّقات سے پہلے۔ یا تو

(۱) ایک غلام آزاد کیا جائے (یہ حکم اس زمانے سے متعلّق ہے جبکہ ہنوز عربوں کے معاشرہ میں پہلے وقتوں کے غلام موجود تھے) اور اگر غلام نہ ہوں تو

(۲) دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے۔ اور

(۳) جس میں اس کی طاقت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے یہ خدا کی قائم کردہ حدود ہیں۔ (۵۸/۴)

(۲) یہ تو رہا غصّہ کی حالت میں بیہودہ قسموں کے متعلّق۔ لیکن اگر کوئی شخص دل کے ارادے سے بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم کھالے تو یہ چیز قابلِ گرفت ہو جاتی ہے (اسے اصطلاح میں ایلاء کہتے ہیں۔ یعنی عورت کے حقوق کی ادائیگی میں کمی کرنا)۔ اس کے لئے قرآن نے کہا ہے کہ جو لوگ اس قسم کی قسم کھالیں تو ان کے لئے چار مہینے کی مہلت ہے۔ اگر وہ چار ماہ کے اندر اندر اپنی قسم سے رجوع کر لیں تو ان کے ازدواجی تعلّقات پر کوئی زد نہیں پڑے گی۔ (۲۲۶/۲)۔ البتّہ اس قسم کے توڑنے کا کفّارہ دینا ہو گا جو عام حالات میں دس مسکینوں کو کھانا کھلانا یا کپڑے پہنانا ہو گا۔ یا ایک غلام آزاد کرنا ہو گا۔ جو اس کی استطاعت نہ رکھے وہ تین دن کے روزے رکھے۔ (دیکھئے ۸۹/۵) اگر اس نے چار ماہ کے اندر رجوع نہ کیا تو سمجھ لیا جائے گا کہ اس کا ارادہ قطعِ تعلّق (طلاق) کا ہے۔ سو اس کے لئے طلاق کا طریق اختیار کیا جائیگا جس کی تشریح آگے چل کر آتی ہے۔ (دیکھئے ۲۲۷/۲) اسی سے یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ جو لوگ اپنی بیویوں کو اس طرح چھوڑے رکھتے ہیں کہ نہ ان سے ازدواجی تعلّقات قائم رکھتے ہیں اور نہ ہی انہیں طلاق دیتے ہیں، ان کی یہ روش قرآن کی تعلیم کے صریحاً خلاف ہے۔ انہیں چار ماہ کے اندر اندر اس امر کا مستقل طور پر فیصلہ کرنا چاہیئے۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو چار ماہ کے بعد طلاق کی کاروائی جاری ہو جانی چاہیئے۔

(۳) طلاق کے معنی ہیں نکاح کے معاہدہ سے آزاد ہو جانا۔ چونکہ یہ معاہدہ فریقین (مرد اور عورت) نے باہمی رضامندی سے استوار کیا تھا اس لئے ان میں سے کسی ایک کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ جب جی چاہے اپنی مرضی سے، طلاق، طلاق، طلاق کہہ کر اس معاہدہ کو منسوخ کر دے اس میں دوسرے فریق کے حقوق کا تحفظ ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اسے انفرادی فیصلہ پر نہیں چھوڑا بلکہ معاشرہ کو حکم دیا ہے کہ وہ اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے۔ (معاشرہ سے مُراد وہ نظام ہے جو مابہ النّزاع معاملات میں تصفیہ کے لئے قائم ہو۔ اسے حکومت یا عدالت کہا جاتا ہے) چنانچہ اس باب میں اس نے کہا ہے کہ

"اگر تم میاں بیوی میں باہمی اختلاف، جھگڑے یا مخالفت و عداوت (شقاق) کا خدشہ محسوس کرو تو ایک ثالثی بورڈ بٹھاؤ جس میں ایک ممبر مرد کے خاندان کا ایک اور عورت کے خاندان کا ہو۔ اس بورڈ کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ وہ ان دونوں میں مصالحت کرائیں۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو امید ہے کہ میاں بیوی میں موافقت کی صورت پیدا ہو جائے گی" (۳۵/۴)

(۴) اگر ثالثوں کی کوشش سے ان میں موافقت کی صورت نکل آئے تو بہت اچھا ہے۔ لیکن اگر وہ اپنی

کوشش میں ناکام رہیں تو ظاہر ہے کہ انہیں اس معاملہ کی رپورٹ اس نظام یا عدالت کے پاس بھیجنی ہوگی جس نے انہیں ثالث مقرر کیا تھا۔ وہ عدالت اس امر کا فیصلہ کرے گی کہ فریقین میں طلاق ہو جانی چاہئے اور اس کی شرائط کیا ہوں گی (ان شرائط کا ذکر آگے آتا ہے) چنانچہ سورۂ طلاق کی پہلی آیت یوں ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ... (۶۵/۱)

اے نبی! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ...

یہاں طلاق دینے کا حکم نبیؐ کو دیا گیا ہے۔ اور طَلَّقْتُمُ میں صیغہ جمع کا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ حکم مسلمانوں کے طلاق کے مقدمات میں فیصلہ دینے کا ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کو حکم تھا کہ وہ اپنے ہر متنازعہ فیہ معاملہ میں حضور کو حاکم بنائیں۔ (۴/۶۵) مرکز میں یہ فیصلے رسول اللہ خود کرتے تھے اور بیرونی مقامات میں افسران ماتحت جنہیں قرآن نے اولوالامر منکم کہا ہے۔ (۴/۵۹) رسول اللہ کی وفات کے بعد یہی فریضہ حضورؐ کے جانشین (خلفاءؓ) سرانجام دیتے تھے۔ لہٰذا طلاق کا فیصلہ کرنا عدالت کا کام ہے۔ خاوند یا بیوی کا اپنے اپنے طور پر نہیں۔ عدالت کو یہ فیصلہ اس وقت دینا چاہئے جب عورت ایام حیض سے فارغ ہو چکی ہو کیونکہ اس وقت سے عدت کا شمار ہوگا (۶۵/۱) اور عدت، عام حالات میں تین حیض تک ہوتی ہے (۲/۲۲۸) [عدت کی تفصیل آگے چل کر آئے گی]

(۵) جب ان دونوں میں اس طرح طلاق ہو جائے تو عدت کے دوران میں یہ عورت کسی اور مرد سے شادی نہیں کر سکتی۔ البتہ اگر یہ دونوں باہمی صلح کا ارادہ کر لیں تو سابقہ مرد اس مدت کے اندر بھی اس سے نکاح کر سکتا ہے۔ (۲/۲۲۸) آپ نے دیکھا ہوگا کہ عدت کے دوران میں، عورت پہ تو اس کی پابندی ہے کہ وہ کسی اور مرد سے شادی نہیں کر سکتی۔ لیکن مرد پہ اس کی پابندی نہیں۔ وہ چاہے تو طلاق کے دوسرے ہی دن کسی اور عورت سے شادی کر لے۔ یہ ہے مطلب اس آیت کا کہ وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَ لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (۲/۲۲۸) "کہ اور تمام باتوں میں عورتوں کے حقوق ان کے واجبات کے مطابق ہیں۔ البتہ اس ایک معاملہ میں مردوں کو ایک فوقیت حاصل ہے"

(۶) اگر اس عدت کے دوران میں یہ رشتۂ ازدواج استوار نہ کریں تو عدت کی مدت گزرنے پر اس کا اعلان کرنا ہوگا اور اس پر دو عادل گواہ بھی رکھنے ہوں گے (۶۵/۲) تاکہ عورت کسی دوسرے مرد سے

نکاح کرنے میں آزاد ہو جائے۔ یہ پہلی طلاق کہلائے گی۔ واضح رہے کہ عدت کے بعد بھی یہ میاں بیوی چاہیں تو آپس میں نکاح کر سکتے ہیں۔

(۷) اگر یہ میاں بیوی پہلی طلاق کے بعد پھر نکاح کر لیں۔ لیکن ان کی اس نئی ازدواجی زندگی میں پھر طلاق تک نوبت پہنچ جائے تو اسے دوسری طلاق کہا جائے گا۔ اس دوسری طلاق کے بعد بھی انہیں اجازت ہو گی کہ یہ چاہیں تو پھر آپس میں نکاح کر لیں۔ اگر انہوں نے نکاح کر لیا لیکن پھر طلاق کی نوبت پہنچی تو یہ تیسری طلاق ہو گی۔ یعنی ایک میاں بیوی کی ازدواجی زندگی میں تیسری مرتبہ طلاق کی نوبت آ گئی۔

اس طلاق کے بعد (نہ عدت کے دوران میں نہ ہی اس کے بعد) یہ آپس میں نکاح نہیں کر سکتے۔ یہ مطلب ہے۔ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ (۲/۲۲۹) طلاق دو مرتبہ کی ایسی ہے جس کے بعد تم قاعدے کے مطابق عورت کو (نکاح میں) روک سکتے ہو یا حسن کارانہ انداز سے اسے رخصت کر سکتے ہو۔ لیکن تیسری مرتبہ کی طلاق کے بعد اس کی اجازت نہیں ہو گی۔

البتہ اگر تیسری مرتبہ کی طلاق کے بعد یہ عورت کسی اور مرد سے شادی کر لے اور عورت بیوہ ہو جائے یا ان میں طلاق کی نوبت آ جائے تو پھر یہ پہلے میاں بیوی آپس میں نکاح کر سکتے ہیں۔ (۲/۲۳۰)

(۸) یاد رہے کہ اگر مرد طلاق کے بعد، اپنی بیوی سے دوبارہ نکاح کرنا چاہے تو دل میں یہ نیت نہ رکھے کہ اس طرح اس عورت کو پھانس کر اسے تنگ کروں گا (۲/۲۳۱) نیز اگر یہ عورت اپنے سابقہ خاوند سے نکاح کرنا چاہے تو دوسروں کو بھی نہیں چاہیئے کہ اسے اس سے روکیں (۲/۲۳۲)، اسے اس کی آزادی ہے کہ وہ چاہے تو پھر سے اس مرد سے اپنی رضامندی سے نکاح کر لے۔

(۹) یہاں تک کشیدگی تعلقات کی اس قسم کا ذکر آیا ہے جس میں شکایت خاوند کو پیدا ہو۔ اس کے ساتھ ہی قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ جب شکایت بیوی کو پیدا ہو تو پھر کیا صورت ہو گی۔ سورۂ نساء میں ہے کہ اگر کسی عورت کو اپنے خاوند کی طرف سے سرکشی یا بے رغبتی کا خدشہ ہو تو اس کے لئے پہلا قدم باہمی مصالحت کا ہونا چاہیئے (۴/۱۲۸)، ظاہر ہے کہ مصالحت کے لئے وہی طریق اختیار کرنا ہو گا۔ جو بیوی کی طرف سے سرکشی کی صورت میں بیان کیا گیا ہے (۴/۳۵)، یعنی مصالحت بورڈ کا تقرر۔

اگر ثالثوں کی یہ کوشش ناکام رہے تو ان دونوں میں مفارقت (طلاق) کی شکل پیدا ہو جائے گی۔ (۴/۱۳۰)

جس کی تفصیلات پہلے گزر چکی ہیں۔ اگر عدالت یہ دیکھے کہ مرد تو نباہ کرنا چاہتا ہے لیکن عورت کی طرف سے زیادتی ہو رہی ہے تو اس صورت میں عورت کو کچھ ہرجانہ ادا کرنا ہوگا۔ اس کی تصریح (۲/۲۲۹) میں کی گئی ہے۔

(۱۰) پہلے لکھا جا چکا ہے کہ مہر اس مال کا نام ہے جسے مرد، بغیر کسی معاوضہ کے خیال کے، عورت کو تحفۃً دیتا ہے۔ اسے عام طور پر نکاح کے وقت ہی ادا ہو جانا چاہیئے لیکن اگر عورت چاہے تو اس کی وصولی کو ملتوی بھی کر سکتی ہے۔ طلاق کے ساتھ چونکہ ازدواجی تعلّقات منقطع ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اگر مہر پہلے ادا نہ کیا گیا ہو تو اس کا فیصلہ اس مقام پر ہونا ضروری ہے۔ اس کے لئے قرآن کا حکم یہ ہے کہ

(ا) اگر عورت نباہ کرنا چاہتی ہے لیکن مرد طلاق پر مصر ہے تو عورت کے مہر میں سے کچھ واپس نہیں لیا جا سکتا۔ (۴/۲۰)

(ب) اگر طلاق عورت کو ہاتھ لگانے سے قبل دی گئی ہے تو مقررہ مہر کا نصف دینا ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ عورت یا اس کا مختارِ کار اس میں سے کچھ چھوڑ دے یا مرد پورا مہر ہی دے دے۔ (دیکھئے ۲/۲۳۷)

(ج) اگر طلاق "عورت کو ہاتھ لگانے سے قبل" دی گئی ہے اور (کسی طرح) مہر مقرر نہیں ہو سکا تھا تو مرد کی وسعت کے مطابق مہر دلانا ہوگا۔ (۲/۲۳۶)

(د) اگر مرد اس بناء پر طلاق دینا چاہے کہ عورت کسی بے حیائی کے کام کی مرتکب ہوئی ہے تو مہر کا کچھ حصّہ روکا جا سکتا ہے (۴/۱۹) ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ عدالت کے کرنے کا ہوگا۔

(ھ) (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) اگر مرد نباہ کرنا چاہتا ہے لیکن عورت علیٰحدگی پر مصُر ہے تو اسے اپنے مہر میں سے کچھ رقم بطور ہرجانہ دینی ہوگی۔ (۲/۲۲۹) اس کا تعیّن بھی عدالت ہی کرے گی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عِدّت

عِدت اُس مدت کا نام ہے جس میں مطلقہ یا بیوہ عورت شادی نہیں کر سکتی۔ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ پہلی اور دوسری مرتبہ طلاق کی صورت میں عورت، اپنے پہلے خاوند سے عدت کے اندر بھی شادی کر سکتی ہے) یہ معیاد حسب ذیل ہے۔

(۱) مطلقہ عورت کی عدت تین حیض (ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ۲/۲۲۸) ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طلاق کا فیصلہ اس وقت کرنا چاہیئے جب عورت حیض سے فارغ ہو چکی ہو تاکہ عدت کے شمار میں وقت نہ ہو۔ (دیکھیئے ۶۵/۱)

(ب) جو عورتیں اتنی سن رسیدہ ہو چکی ہوں کہ وہ حیض کی طرف سے نا اُمید ہوں، یا جنہیں کسی بیماری وغیرہ کی وجہ سے حیض نہ آتا ہو، ان کی عدّت (تین حیض کے بجائے) تین مہینے ہو گی۔ (۶۵/۴)

(ج) جو عورت حمل سے ہو اس کی عدّت وضعِ حمل (بچے کی پیدائش) تک ہے (۶۵/۴)۔ انہیں چاہیئے کہ وہ طلاق کے وقت یہ بتا دیں کہ وہ حمل سے ہیں۔ (۲/۲۲۸)

(د) جس عورت کو "ہاتھ لگانے سے قبل" طلاق دی گئی ہو اس کے لئے کوئی عدت نہیں۔ (۳۳/۴۹)

(۲) بیوہ عورت کی عدّت چار مہینے اور دس دن کی ہے (۲/۲۳۴) اگرچہ بیوہ عورت کے لئے حمل کی صورت میں الگ حکم نہیں۔ لیکن چونکہ مطلّقہ کے لئے عدّت وضع حمل تک ہے۔ (۶۵/۴) اس لئے اس سے مستنبط کیا جا سکتا ہے کہ بیوہ عورت کے لئے جو حاملہ ہو، عدّت وضعِ حمل تک ہو گی۔

(۳) عدت کے دوران مطلّقہ عورت کے رہنے سہنے اور خورونوش وغیرہ کی ذمّہ داری مرد پہ ہو گی اور اس کا معیار وہی ہو گا جو ازدواجی حالت میں تھا، (۲/۲۴۱، ۶۵/۱، ۶۵/۶-۷) لیکن اگر یہ کسی

بےحیائی کے کام کی مرتکب ہو تو پھر اس کی ذمّہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ (۶۵/۱)

(۴) بیوہ عورت کے لئے ایک سال تک کی رہائش اور خورد و نوش کا انتظام ضروری ہے جس کے لئے چاہیے کہ مرد وصیت کر جائے۔ (۲/۲۴۰) اگر وہ اس سے پہلے، اپنی مرضی سے دوسری جگہ چلی جائے اور اپنا کچھ اور انتظام کر لے تو پھر یہ ذمّہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ (۲/۲۴۰)

(۵) عدت کے دوران میں نکاح تو نہیں کیا جا سکتا لیکن نکاح کے لئے سلسلۂ جنبانی کی ممانعت نہیں۔ (۲/۲۳۵)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۶ - ترکہ

قرآن جس معاشی نظام کو قائم کرنا چاہتا ہے اس میں دولت جمع کرنے یا جائیدادیں بنوانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق محنت کرتا ہے اور اس کی اور اس کے متعلّقین کی ضروریاتِ زندگی کا بہم پہنچانا نظام کے ذمّے ہوتا ہے۔ لیکن جب تک وہ نظام قائم نہ ہو (یا اس نظام میں بھی جو کچھ کسی کے پاس ہو) قرآن نے اس کی تقسیم کے لئے احکام دیئے ہیں جو مختصر الفاظ میں یہ ہیں۔

(۱) ہر شخص پر فرض ہے کہ وہ اپنے ترکہ کے متعلّق وصیّت کرے۔ یہ وصیّت پورے ترکہ کے متعلّق ہوگی اور ہر ایک کے لئے ہو سکتی ہے۔ (دیکھئے ۲/۱۸۰) سورۂ مائدہ ۵/۱۰۶ میں وصیّت لکھوانے کے تفصیلی احکام دیئے گئے ہیں۔

(ب) متوفّی کی وفات پر، سب سے پہلے اس کا قرضہ ادا کیا جائے گا۔ اس کے بعد اس کی وصیّت کے مطابق ترکہ کی تقسیم ہوگی۔ (مِنۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصِىۡ بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ) (۴/۱۱-۱۲)

(ج) اگر (قرضہ اور) وصیّت کے پورا کرنے کے بعد کچھ بچ جائے۔ (یا مثلاً کوئی شخص بغیر وصیّت کئے مر جائے)، تو اس صورت میں باقی ماندہ ترکہ کی تقسیم ان حصّوں کے مطابق ہوگی جو قرآن میں مذکور ہیں۔ اس میں عورتوں اور مردوں (سب کے) حصّے دیئے ہوئے ہیں۔ (۴/۷)

(د) تقسیم کا طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے میاں یا بیوی کا حصّہ نکال لیا جائے اور اس کے بعد باقی وارثوں کے حصے نکالے جائیں۔

(ہ) اگر مرد کی اولاد نہ ہو، تو بیوی کا حصّہ ۱/۴ (ایک چوتھائی) ہے۔ اور اگر اولاد ہو تو ۱/۸ (آٹھواں حصّہ) (دیکھئے ۴/۱۲)

اسی طرح اگر عورت مر جائے اور اس کی اولاد نہ ہو تو اس کے ترکہ میں سے خاوند کا حصّہ ۱/۲ (نصف)

ہے۔ اور اگر اس کی اولاد ہو تو (۱/۴) چوتھائی حصہ۔ (دیکھئے ۴/۱۲)

(کلالہ کی صورت میں حکم اور ہے۔ (دیکھئے ۴/۱۲، ۴/۱۷۶)
چونکہ یہ ایک فنی بحث ہے اس لئے اس کی تفصیل کا یہ مقام نہیں۔

(د) لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے (یعنی لڑکی کا ۱/۳ ، لڑکے کا ۲/۳)

اگر لڑکیاں دو یا دو سے زیادہ ہوں تو ان سب کا حصہ ۲/۳ ہوگا۔ اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو ۱/۲ ۔

متوفی کے اولاد ہو تو ماں باپ میں سے ہر ایک کا حصہ (۱/۶) چھٹا ہوگا۔ اگر اولاد نہ ہو اور صرف ماں باپ وارث ہوں تو ماں کا حصہ (۱/۳) تہائی۔ اور اگر ساتھ بھائی بھی ہوں تو ماں کا حصہ (۱/۶) چھٹا ہوگا (۴/۱۱)

نوٹ:۔ یہاں ترکہ کی تقسیم کے موٹے موٹے اصول دیئے گئے ہیں۔ ان کی جزئیات کے لئے تفصیلی بحث کی ضرورت ہے جس کا مقام یہ نہیں۔ ترکہ کی تقسیم ایک فنی چیز ہے، جس کے لئے ان تمام احکام سے پوری پوری واقفیت ضروری ہے۔

(ش) بیوہ کے سال بھر کے نان ونفقہ وغیرہ کے متعلق وصیت کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ (دیکھئے ۲/۲۴۰)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۷ - اولاد

اولاد کو انسان کے لئے وجہِ کشش بنایا گیا ہے۔ (۳/۱۴)

(۲) لیکن اگر اولاد کے لئے انسان ناجائز کام کرنے لگ جائے یا اولاد کی محبت ان فرائض کی راہ میں حائل ہو جائے جو خدا کی طرف سے عائد ہوتے ہیں تو یہی اولاد فتنہ کا موجب بن جاتی ہے (۸/۲۸)، اس لئے کہ اولاد میں تعلق صرف انسان کی دنیاوی زندگی سے ہے۔ (۱۸/۴۶) قانونِ خداوندی کے مقابلہ میں اولاد کسی کام نہیں آسکتی۔ (۵۸/۱۷) اس لئے جس مقام پر اولاد اور خدا کے قوانین کے اتباع میں تصادم ہو، وہاں اولاد کو چھوڑ کر خدا کے قوانین کا اتباع کرنا چاہئے (۶۴/۱۴)۔ جو اولاد قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتے اس سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئے۔ اس کے لئے حضرت نوحؑ کے بیٹے کی مثال بڑی نمایاں ہے جسے قرآن نے عملِ غیر صالح کی بنا پر کہہ دیا کہ اِنَّہٗ لَیْسَ مِنْ اَھْلِکَ (۱۱/۴۶-۴۷) صرف اولاد ہی نہیں بلکہ ماں باپ، بہن بھائی، بیوی یا خاوند، یا دیگر اہل خاندان۔ ان میں سے جو کوئی بھی نظامِ خداوندی کی راہ میں حائل ہو۔ نظامِ خداوندی کو اس پر ہمیشہ ترجیح دینی چاہیئے۔ (۹/۲۴)

(۳) تندرست و توانا اور صحیح و سالم بچہ خدا کی نعمت ہے (۷/۱۸۹-۱۹۰) اور صاحبِ فہم و فراست پاکباز اور محبت بھرا دل رکھنے والا۔ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرنے والا۔ والدین کے لئے کشادہ ظرف۔ اس قسم کا بچہ اللہ کی رحمت ہے۔ (۱۹/۱۲-۱۴)

انسان جب عہدِ جاہلیت میں تھا تو اپنے بچوں کو اپنے ہاتھ سے مار دیا کرتا تھا۔ اب بھی آسٹریلیا وغیرہ میں اس قسم کے قدیم زمانے کے قبائل پائے جاتے ہیں۔ جن میں اکثر بچوں کو پیدا ہوتے ہی مار دیا جاتا ہے۔[a] قرآن نے اس وحشت انگیز رسم کو سختی سے روکا ہے۔ وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَکُمْ

---

a – THE MOTHERS (VOL. II)
BY ROBERT BRIFFAULT.

خَشْیَۃَ اِمْلَاقٍ ط (۱۷/۳۱، ۶/۱۵۲) "اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل مت کرو"۔ لیکن قتلِ اولاد کے معنی بچوں کو سچ مچ مار دینا ہی نہیں اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ انہیں تعلیم و تربیت سے محروم رکھا جائے، ان کی پرورش ٹھیک طور پر نہ کی جائے۔ ان میں تو ہم پرستی کے غلط تصورات پیدا ہونے دیئے جائیں۔ لہٰذا، اب جب کہ مہذب ممالک میں بچوں کو مارا نہیں دیا جاتا، ان احکام کے معنی یہ ہیں گے کہ اپنی اولاد کی انسانی صلاحیتوں کا گلا نہ گھونٹ دیا کرو۔

عہدِ جہالت ہی سے انسانوں میں یہ تصور بھی چلا آتا ہے، کہ لڑکیاں لڑکوں کے برابر نہیں ہوتیں۔ چنانچہ قرآن میں خود عربوں کے متعلق ہے کہ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُھُمْ بِالْاُنْثٰی ظَلَّ وَجْھُهٗ مُسْوَدًّا وَّ ھُوَ کَظِیْمٌ ۚ (۱۶/۵۸) جب ان میں سے کسی کو یہ اطلاع ملتی ہے کہ اس کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے تو اس کے چہرے کا رنگ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غصے سے بھر جاتا ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ ہے کہ وہ اپنی لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے (۸۱/۸)[1] قرآن نے اس قصابانہ رسم سے بھی روکا۔ چنانچہ نبی اکرمؐ عورتوں سے خاص طور پر اس کا عہد لیا کرتے تھے (۶۰/۱۲) قرآن نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ لڑکے اور لڑکیاں سب خدا کے قانون کے مطابق پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ لڑکے خدا کی رحمت ہیں اور لڑکیاں بھاری باعثِ زحمت۔ یَھَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ یَھَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ الذُّکُوْرَ ۙ اَوْ یُزَوِّجُھُمْ ذُکْرَانًا وَّ اِنَاثًا ۚ وَیَجْعَلُ مَنْ یَّشَآءُ عَقِیْمًا (۴۲/۴۹-۵۰) لڑکیاں بھی اللہ کے قانونِ مشیت کے مطابق پیدا ہوتی ہیں اور لڑکے بھی۔ (بعض کے ہاں، لڑکے اور لڑکیاں دونوں پیدا ہوتے ہیں اور بعض کے ہاں اولاد ہوتی ہی نہیں، یہ سب خدا کے قانونِ طبعی کے ماتحت ہوتا ہے اس لئے نہ تو لڑکیوں کو باعثِ زحمت سمجھنا چاہیئے اور نہ ہی جس کے ہاں اولاد نہ ہو، اسے سرد آہیں بھرتے رہنا چاہیئے۔

---

[1] ہم خوش ہیں کہ ہم میں ایسی وحشیانہ رسم نہیں۔ لیکن ہم جس طرح اپنی بیٹیوں کی شادیاں دیدہ و دانستہ ایسی جگہ کر دیتے ہیں جہاں وہ بچاریاں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتی ہیں۔ اگر یہ بیٹی کو اپنے ہاتھوں زندہ درگور کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟

اولاد کی تربیت کی ذمہ داری اگرچہ ماں اور باپ دونوں پر عاید ہوتی ہے لیکن اس باب میں ماں کا حصہ باپ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔ اس لئے کہ بچے کی تربیت کا صحیح وقت وہ ہوتا ہے جب وہ ہنوز ماں کی آغوش میں ہوتا ہے۔ علمائے نفسیات میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے بچوں کی نفسیات کا خصوصی طور پر مطالعہ کیا ہے (مثلاً ڈاکٹر ایڈلر اور ڈاکٹر جنگ) ان کی تحقیقات کا ماحصل یہ ہے کہ بچے نے بڑی عمر میں جا کر جو کچھ بننا ہوتا ہے وہ سب کچھ آغوش مادر میں بن چکا ہوتا ہے۔ بعد کی تعلیم صرف اس عمارت کو پختہ کرتی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن نے عورت کو اقتصادی ضروریات سے فارغ کر دیا ہے تاکہ وہ اپنے اس بنیادی فریضہ کی ادائیگی میں پورا پورا وقت دے سکے۔ جو مائیں اس فریضہ کی سرانجام دہی میں کوتاہی کرتی ہیں وہ نہ صرف اپنے بچوں ہی کو تباہ کرتی ہیں بلکہ پورے معاشرہ کی مجرم ہوتی ہیں کیونکہ بچوں کی بربادی خود معاشرہ کی بربادی ہے۔

اس حقیقت کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ بچوں کی تعمیر سیرت کے لئے نہایت ضروری ہے کہ گھر میں (میاں اور بیوی میں) پوری یک جہتی اور ہم آہنگی ہو۔ جس گھر میں (میاں بیوی میں) اَن بَن رہے ان کے بچے کبھی صحیح تربیت یافتہ نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ۱۹۵۶ء کی (BRITANNIC BOOK) میں مختلف اعداد و شمار کے بعد کہا گیا ہے کہ جو بچے ابتدائی عمر میں جرائم پیشہ بن جاتے ہیں ان میں بیشتر تعداد ان کی ہوتی ہے جو ایسے گھروں میں پرورش پاتے ہیں جن میں مسرت و شادمانی اور خاندانی زندگی میں موافقت اور مطابقت نہ ہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن جب عائلی زندگی میں کامل موافقت پر زور دیتا ہے تو اس سے مقصود کیا ہے۔

؎ جرائم پیشگی تو اس کا صرف ایک گوشہ ہے۔ بڑی عمر کے لوگوں میں جو کردار کے مختلف نقائص پائے جاتے ہیں ان کی تحقیق کرنے پر بھی یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ اس کی بنیادی وجہ بچپن میں گھر کے اس ماحول کی خرابی تھی جس میں اس نے پرورش پائی تھی۔ اور اس میں ماں کی کمزوریوں کا حصہ زیادہ ہوتا ہے۔ بالخصوص ماں (یا ماں باپ دونوں) کی محبت سے محروم بچے بڑے ہو کر عجیب و غریب نفسیاتی عوارض اور پیچیدگیوں کا شکار رہتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رضاعت

(دودھ پلانا)

قرآن نے اس کے متعلق حکم نہیں دیا کہ بچوں کو اتنی مدت تک ضرور دودھ پلایا جائے اس کا فیصلہ حالات کے مطابق کیا جائے گا۔ اس نے سورۂ احقاف میں ضمنی طور پر کہا ہے کہ بچے کی ماں پہلے اسے پیٹ میں رکھتی ہے اور پھر دودھ پلاتی ہے جس میں اڑھائی سال کا عرصہ لگ جاتا ہے۔ (۴۶/۱۵) لیکن بعض صورتیں ایسی بھی پیدا ہو جاتی ہیں جن میں دودھ کی مدت کا تعین قانونی طور پر ضروری ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے اور اس کی گود میں شیر خوار بچہ ہے۔ قرآن کی رو سے اس بچے کی پرورش کی ذمہ داری باپ پر عائد ہوتی ہے۔ (اور اگر اس کا باپ مر جائے تو اس کے وارثوں پر (۲/۲۳۳) وہ کہتا ہے کہ اگر وہ باہمی رضامندی سے چاہیں کہ بچے کی ماں ہی اسے دودھ پلائے تو اسے اس کا معاوضہ دینا ہو گا اور یہ مدت دو سال تک کی ہو سکتی ہے (۲/۲۳۳) لیکن اگر وہ باہمی رضامندی ہی سے اس سے قبل ہی دودھ چھڑا دینا چاہیں تو ایسا بھی کر سکتے ہیں (۲/۲۳۳) اور ایسا بھی کہ وہ اس کی ماں کے بجائے کسی اور سے دودھ پلانے کا انتظام کر لے (۲/۲۳۳) نیز (۳۱/۱۴ ؛ ۶۵/۶) (قانونی ضرورت کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک شخص مر جائے اور اس کی بیوہ، بچے کو دودھ پلاتی رہے تو وہ اس کے وارثوں سے اس کا معاوضہ بذریعہ عدالت لے سکتی ہے۔ لیکن صرف بچے کی دو سال کی عمر تک۔ اس سے زیادہ نہیں۔)

باقی رہا یہ کہ میاں بیوی کی علیحدگی کی صورت میں بچے کس کے پاس رہنے چاہئیں اس کی بابت قرآن نے کوئی حکم نہیں دیا۔ اس کا فیصلہ حالات کے مطابق ہر انفرادی کیس

میں عدالت دے گی جس میں اصول یہ پیشِ نظر رکھا جائے گا کہ بچوں کی صحیح پرورش اور تعلیم کس کے پاس ہو سکتی ہے۔ نیز اس میں ماں باپ کے جذبات کا بھی لحاظ رکھنا ہوگا کیونکہ میاں بیوی کے تعلقات کے منقطع ہو جانے سے اولاد کے ساتھ قلبی لگاؤ تو منقطع نہیں ہو جاتا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تعدّد ازدواج

(ایک سے زیادہ بیوی)

ہم نے اس عنوان کو ان قوانین کے آخری حصّہ میں اس لئے رکھا ہے کہ یہ سب سے اہم ہے اور ہمارے معاشرہ میں اس کے متعلّق بڑی غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے۔ عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے (اور اسی کے مطابق عمل بھی ہوتا ہے) کہ ایک مسلمان مرد جب جی چاہے، چار تک شادیاں کر سکتا ہے۔ یہ تصوّر قرآن کے بالکل خلاف ہے۔ قرآن عام حالات میں صرف ایک بیوی کی اجازت دیتا ہے اگر اس بیوی سے نباہ کی کوئی صورت باقی نہ رہے (جیسا کہ طلاق کے عنوان میں بتایا جا چکا ہے) تو مرد اس کے بعد دوسری شادی کر سکتا ہے۔ اس کی موجودگی میں نہیں۔ سورۂ نساء میں ہے۔ وَ اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّ اٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ ... (۴/۲۰) اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی سے نکاح کرنا چاہو تو پہلی بیوی کا مہر پورا پورا ادا کر دو۔ اور پھر اس کی جگہ دوسری بیوی لاؤ۔) اس سے بالکل واضح ہے کہ **ایک بیوی کی جگہ** ہی دوسری بیوی آسکتی ہے۔ اس کی موجودگی میں نہیں۔

واضح رہے کہ قرآن کی رُو سے اس کی اجازت نہیں کہ آپ محض ایک نئی بیوی لانے کے لئے، پہلی بیوی کو طلاق دے دیں۔ قرآن نے طلاق کے لئے واضح احکام دیئے ہیں۔ (جن کا ذکر طلاق کے عنوان میں آ چکا ہے)۔ ان میں، اس کی کہیں اجازت نہیں دی گئی کہ تم ایک نئی شادی کرنے کے لئے اپنی سابقہ بیوی کو طلاق دے دو۔

(۲) ہم نے اُوپر کہا ہے کہ قرآن کی رُو سے عام حالات میں ایک ہی بیوی کی اجازت ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کوئی خاص حالات بھی پیدا ہو سکتے ہیں جن میں ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی سے نکاح کیا جا سکتا ہے۔ قرآن نے ان حالات کی تصریح خود ہی کر دی ہے۔ سورۂ نساء میں ہے۔

وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰى اَلَّا تَعُوْلُوْا ؕ (۴/۳)

اس آیت کے چار ٹکڑے ہیں۔ ان چاروں کا ترجمہ اور مفہوم حسب ذیل ہے۔

(i) پہلا ٹکڑا ہے۔ وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِى الْيَتٰمٰى۔ عربی زبان میں یتامیٰ کے معنے وہ بچے بھی ہیں جن کے باپ مرجائیں اور وہ جوان عورتیں بھی جو بلا خاوند کے ہوں۔ خواہ وہ بیوہ ہوں اور خواہ وہ غیر شادی شدہ جوان لڑکیاں جنہیں خاوند نہ مل سکے۔ (ذرا آگے چل کر قرآن نے یَتَامَی النِّسَآءِ خود انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ۴/۱۲۷)

آیت کے معنی یہ ہیں کہ اگر ایسے حالات پیدا ہوجائیں جن میں تمہیں اس کا اندیشہ ہو کہ تم یتیم بچوں اور بے شوہر کی عورتوں کے مسئلہ کا منصفانہ حل نہیں کر سکو گے۔ یعنی ان کے جو تقاضے ہیں انہیں منصفانہ طور پر (جیسا کہ ان کا حق ہے)، پورا نہیں کر سکو گے۔ مطلب صاف ہے کہ اگر کسی ہنگامی حالت میں (مثلاً جنگ کے بعد جب جوان مرد بڑی تعداد میں ضائع ہو چکے ہوں) ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ معاشرہ میں یتیم بچے اور لاوارث جوان عورتیں بغیر شوہروں کے رہ جائیں تو اس ہنگامی صورت سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اس کی اجازت دی جاتی ہے (کہ توحّدِ ازدواج یعنی ایک بیوی کے قانون میں عارضی طور پر RELAXATION پیدا کر لے)

(ii) فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ان میں سے اُن عورتوں سے جو تمہیں پسند ہوں، نکاح کر لو اور اس طرح انہیں (اور بیواؤں کی صورت میں ان کے ساتھ ان کے بچوں کو بھی) خاندان کے اندر جذب کر لو۔ یہی ان سے منصفانہ سلوک ہے۔ یہ مسئلہ اگر دو دو بیویاں کرنے سے حل ہو جائے تو دو کر لو۔ تین تین سے ہو تو تین تین سے اور چار چار سے ہو تو چار چار!

(iii) یہ تو رہا اجتماعی فیصلہ۔ انفرادی طور پر اس کی اجازت بھی اُس کے لئے ہے جو ان بیویوں میں عدل کر سکے۔ اگر عدل نہ کر سکے تو ان ہنگامی حالات کے باوجود، وہ صرف ایک ہی بیوی رکھے۔ (جو عام قانون ہے)

عدل کی شرط کے متعلق یہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ تو نفسیاتی طور پر ناممکن ہے کہ تم ہر بیوی کو یکساں چاہو۔

وَلَنْ تَسْتَطِيعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ (۴:۱۲۹)
ایسا عدل تم کر ہی نہیں سکتے خواہ تم کتنا ہی چاہو۔ (کہاں وہ بیوی جو تمہاری عمر بھر کی رفیقہ ہے اور کہاں یہ جسے تم، پہلی بیوی سے نفرت کی وجہ سے نہیں بلکہ محض معاشرہ کی ایک اجتماعی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے جزوِ خاندان بنا رہے ہو،) لیکن اس کے لئے اتنا ضرور کرو کہ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ (۴:۱۲۹) ایسا نہ کرو کہ تم بالکل ایک ہی طرف جھک جاؤ اور دوسری کو ادھر لٹکا کر چھوڑ دو۔

(۷) چوتھا ٹکڑا ہے۔ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا (۴:۳) تَعُوْلُوْا کے معنی بے انصافی کے بھی ہوتے ہیں اور عیال داری کے بوجھ کے نیچے دب جانے کے بھی۔ لہٰذا قرآن نے جو کہا ہے کہ اگر تم عدل نہ کر سکو تو پھر وہی ایک بیوی والے قانون پر کاربند رہو تو اس سے ایک مقصد تو یہ ہے کہ تم ناانصافی نہ کر سکو اور دوسرے یہ بھی کہ تم عیالداری کے بوجھ سے اس قدر دب نہ جاؤ کہ ان دو خاندانوں کی پرورش ہی نہ کر سکو۔

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ قرآن کی رو سے:-

(۱) قانون بیک وقت ایک ہی بیوی (MONOGAMY) کا ہے۔

(۲) لیکن اگر کبھی معاشرہ میں ایسے حالات ہنگامی طور پر پیدا ہو جائیں، کہ یتیم بچے اور بے شوہر کی عورتیں بہت زیادہ رہ جائیں، تو ایسی اجتماعی مشکل کے حل کی ایک صورت یہ ہے کہ "ایک بیوی" کے قانون میں عارضی استثناء کر دیا جائے۔ اگر صرف یتیم بچوں کا مسئلہ ہوتا تو اس کے حل کی اور صورتیں بھی ہو جاتیں لیکن مسئلہ شادی کے قابل عورتوں کا ہے۔ ان (مسلمان) عورتوں کی شادی غیر مسلموں سے ہو ہی نہیں سکتی۔ انہیں مسلمان گھروں کے اندر ہی جذب ہونا ہے تو اس کی شکل اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک خاندان میں، ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت دیدی جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ اجازت اجتماعی ہے انفرادی نہیں۔ یعنی معاشرہ ہی اس کا فیصلہ کر سکتا ہے کہ ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں یا نہیں۔

(۳) ایسی حالت پیدا ہو جانے کے بعد، ایک سے زیادہ بیوی کی اجازت بھی صرف اسی فرد کو دی جا سکے گی جو:-

(ا) ان سب سے عدل کر سکے۔ اور

(ب) ان خاندانوں کی پرورش کا کفیل ہو سکے۔ (قرآنی معاشرہ میں اس کی کفالت معاشرہ پر ہوگی۔

لیکن جب تک وہ معاشرہ قائم نہ ہو، اس کی ذمہ داری افراد پر ہی عائد ہوگی)

اگر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی پوری نہیں ہوتی تو پھر "ایک بیوی" والا قانون ہی نافذ رہے گا۔ اگر:-

معاشرہ میں ایسے اجتماعی حالات پیدا نہیں ہوئے یا ایسے حالات تو پیدا ہو چکے ہیں لیکن ایک فرد مناسب عدل نہیں کر سکتا۔ یا اتنے افرادِ خاندان کی پرورش کا کفیل نہیں ہو سکتا۔	تو پھر دوسری بیوی کی اجازت نہیں ہے۔

یہ ہیں قرآن کی رُو سے وہ غیر معمولی حالات جن میں ایک سے زیادہ بیوی کی اجازت ہوگی۔ ان کے علاوہ، اور کسی حالت میں بھی قرآن کی رُو سے ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی کی اجازت نہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لونڈیاں

لیکن ہمارے ہاں معاملہ چار بیویوں تک پہنچ کر ہی رُک نہیں جاتا، اس سے بھی آگے بڑھتا ہے۔ چنانچہ ہمارے مروّجہ مذہب کی رُو سے ایک مسلمان مرد، چار بیویوں کے علاوہ بے شمار لونڈیاں بھی اپنے حرم میں رکھ سکتا ہے۔ اور جب جی چاہے انہیں کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کیا جاسکتا ہے۔ یہ تمام باتیں قرآن کے یکسر خلاف ہیں۔ قرآن کی رُو سے نہ کوئی مرد غلام بنایا جاسکتا ہے، نہ عورت لونڈی۔ اس کے نزدیک ہر ابن آدم (انسانی بچہ) واجب التکریم ہے۔ (۱۷/۷۰)

(۲) جب اسلام آیا تو (باقی دنیا کی طرح) عربوں میں بھی غلامی رائج تھی۔ وہ جنگ کے قیدیوں میں سے مردوں کو غلام اور عورتوں کو لونڈیاں بنا لیا کرتے تھے۔ جب یہ لوگ مسلمان ہوئے تو ان کے گھروں میں اس قسم کے غلام اور لونڈیاں موجود تھے۔ اسلام اگر ان سب کو فوراً گھروں سے باہر نکال دیتا تو ان کے معاشرہ میں انتشار واقع ہو جاتا۔ اس لئے اس نے ایسے احکام دیئے جن کی رُو سے یہ غلام اور لونڈیاں آہستہ آہستہ یا تو آزاد ہو گئے اور یا ان کے خاندانوں کا جزو بنتے گئے۔ قرآنِ کریم میں غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق جو احکام آئے ہیں وہ انہی غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق ہیں جو اس وقت ان کے ہاں موجود تھے۔ ما ملکت ایمانکم کے معنی ہی یہ ہیں کہ جو اس سے پہلے تمہاری ملک میں آچکے ہیں۔ (ملکت) ماضی کا صیغہ ہے۔ جس کے معنی ہیں وہ کام جو پہلے ہو چکا ہو۔

یہ تو رہا ان غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق جو اس وقت موجود تھے۔ آئندہ کے لئے قرآن نے اس کا دروازہ ہی بند کر دیا۔ اور وہ اس طرح کہ اس نے جنگ کے قیدیوں کے متعلق صاف طور

لہ ملاحظہ ہو تفہیمات۔ حصہ دوم۔ از سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ نیز ان کی تفسیر تفہیم القرآن جلد اوّل۔

طاہرہ کے نام

پر حکم دے دیا کہ

فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً ... (۴۷/۴)

"(ان پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد) انہیں یا تو بطور احسان چھوڑ دو اور یا فدیہ لے کر چھوڑ دو"۔

اس حکم کے بعد اسلام میں غلاموں اور لونڈیوں کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا گھروں میں لونڈیاں رکھنا یکسر خلافِ قرآن فعل ہے۔

تتمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت عائشہؓ کی عمر

شادی کے وقت

(صغر سنی کی شادی کی تائید میں عام طور پر دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضؓ سے چھ سال کی عمر میں نکاح کیا تھا اور نو سال کی عمر میں ان کی رخصتی ہوئی تھی۔ چونکہ یہ سوال بڑا اہم ہے اس لئے ہم نے مناسب سمجھا کہ اس تحقیقی مقالہ کو بھی درج کر دیا جائے جس نے ایک بہت بڑی حقیقت سے پہلی مرتبہ پردہ اٹھایا ہے۔)

ہمارے ہاں جو باتیں متفقہ طور پر مانی جاتی ہیں، یعنی جن میں کسی کو بھی اختلاف نہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ کی عمر نکاح کے وقت چھ برس کی اور رخصتی کے وقت نو برس کی تھی۔ اس بات کو ایک ایسے مسئلہ کے طور پر مانا جاتا ہے کہ اس میں کسی تحقیق کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی۔ اس کی بنیاد اُن روایات پر ہے جو بخاری، طبری اور طبقات ابن سعد وغیرہ میں ملتی ہیں، لیکن انہی اور ان جیسی تاریخ کی اور کتابوں میں ایسی روایات بھی موجود ہیں جن سے اس بات کی تردید ہوتی ہے اور اس کے برعکس یہ ثابت ہوتا ہے کہ شادی کے وقت حضرت عائشہ رضؓ کی عمر اس سے کہیں زیادہ تھی۔

قبل اس کے کہ ہم تاریخ کی روشنی میں اس مسئلہ کی تحقیق کریں، دو ایک باتیں تمہیداً سمجھ لینا ضروری ہیں پہلے تو یہ کہ قرآن کریم میں نکاح وطلاق وغیرہ سے متعلق احکام ہجرت کے بہت بعد نازل ہوئے تھے اور حضرت عائشہ رضؓ کے نکاح اور رخصتی کے واقعات چونکہ ہجرت سے پہلے یا ہجرت کے سال کے بیان کئے جاتے ہیں، اس لئے ظاہر ہے کہ یہ قرآنی احکام کے نزول سے پہلے کی باتیں ہیں۔ جیسا کہ ذرا آگے چل کر معلوم ہوگا، عربوں میں شادی سے پہلے، رشتہ کے متعلق بات طے کر لینے کا رواج تھا۔ یہ وہی چیز تھی جسے ہمارے ہاں نسبت ٹھہرانا یا منگنی کرنا کہتے ہیں۔ قرآن میں صرف نکاح کا ذکر ہے، نسبت اور منگنی کا نہیں۔ لہٰذا روایات میں جو کہا گیا ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ کا نکاح چھ برس کی عمر میں ہوا اور رخصتی نو برس کی عمر میں، تو وہاں

نکاح سے مقصود، عربی معاشرہ کی رسم کے مطابق رشتہ کی بات چیت کا طے پانا (یا منگنی کرنا) ہے اور رخصتی سے مراد شادی۔ بنابریں اصل سوال یہ ہے کہ شادی کے وقت حضرت عائشہ رضؓ کی عمر کیا تھی؟

دوسری بات یہ ہے کہ اس زمانے میں عربوں کے ہاں کوئی خاص کیلنڈر رائج نہیں تھا جس کی رُو سے وہ واقعات کا تعین اسی طرح کرتے جس طرح آج ہم تاریخ، دن، مہینہ اور سن لکھ کر تعین کرتے ہیں (سن ہجری پہلے پہل حضرت عمر رضؓ کے زمانے میں رائج ہوا تھا) ان کے ہاں پیدائش اور موت کے زمانے کا تعین بعض اہم واقعات کی نسبت سے کرتے یا دوسرے بچوں کی پیدائش وغیرہ کی نسبت سے۔ خود ہمارے ہاں بھی بڑی بوڑھیاں عمروں کا تعین اسی طرح سے کرتی ہیں، مثلاً وہ کہیں گی، کہ جب کانگڑے کا بھونچال آیا ہے تو زید دودھ پیتا تھا اور عمر، زید سے تین سال بعد پیدا ہوا تھا۔ خود نبی اکرمؐ کے متعلق تاریخ میں ہے کہ حضورؐ کی پیدائش عام الفیل میں ہوئی تھی، یعنی اس سال جب یمن کے گورنر نے ہاتھیوں کی فوج کے ساتھ مکہ پر چڑھائی کی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب واقعات کا تعین اس طرح سے کیا جائے تو ان میں مہینوں اور بعض اوقات برسوں کا فرق بھی کچھ مستبعد نہیں ہو سکتا۔ (اس کی مثالیں آخر میں پیش کی جائیں گی) دوسرے یہ کہ پیدائش کے واقعات میں اگر مہینہ نہ دیا جائے صرف سال ہی دیا جائے، تو عمر کے حساب میں کم و بیش ایک برس کا فرق ویسے ہی پڑ سکتا ہے۔ مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ فلاں کی پیدائش ۱۹۲۰ء میں ہوئی تھی تو اگر اس کی پیدائش جنوری کے مہینے میں ہوئی تھی تو ۱۹۲۰ء کا سال عمر کے حساب میں شامل کرنا چاہیئے اور اگر پیدائش دسمبر میں ہوئی تھی تو عمر کی ابتدا ۱۹۲۱ء سے ہونی چاہیئے لہٰذا ہماری تاریخ میں عمروں کے حساب کے لئے اس بنیادی نکتہ کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

تیسرے یہ کہ (جیسا کہ اُوپر لکھا جا چکا ہے) ہمارے ہاں سن کی باقاعدہ تدریج حضرت عمر رضؓ کے زمانہ میں ہوئی اور اس کی ابتدا ہجرت سے کی گئی۔ اگرچہ ہجرت ربیع الاوّل کے مہینے میں ہوئی تھی، لیکن سنہ ہجری کو محرم سے شمار کر کے پورا سال لے لیا گیا۔ ہجرت سے پہلے سن کا تعین نبی اکرمؐ کی نبوّت کے سال سے کیا جاتا ہے کہ جب حضورؐ عمر کے چالیسویں سال میں تھے تو آپ کو نبوّت عطا ہوئی تھی۔ اس کے بعد تیرہ سال تک آپ مکہ میں رہے۔ پھر ہجرت کی۔ یعنی ہجرت کے وقت آپ اپنی عمر کے ۵۳ سال پورے کر چکے تھے۔ اور ۵۴ واں سال شروع تھا۔ اس اعتبار سے (اگر اس سال کو شامل کر لیا جائے جب آپ کو نبوّت عطا ہوئی تھی۔ یعنی عمر کا چالیسواں سال تو) ہجرت کے وقت نبوّت کا پندرھواں سال ہو گا اور اگر اس پہلے

سال کو شامل نہ کیا جائے۔ تو نبوت کا چودھواں سال۔ ان نکات کا سامنے رکھنا ضروری ہے کیونکہ اس کا اثر مسئلہ زیرِ نظر پر پڑے گا۔

(۱) اسد الغابہ جلد چہارم صفحہ ۳۷۷ پر مذکور ہے کہ :۔

حضرت فاطمہؓ، حضرت عائشہؓ سے تقریباً پانچ سال بڑی تھیں۔

لہٰذا حضرت عائشہؓ کا سنِ پیدائش معلوم کرنے کے لئے ہمیں دیکھنا یہ ہوگا کہ حضرت فاطمہؓ کا سالِ پیدائش کیا تھا۔

(۲) اسد الغابہ ہی میں ہے کہ :۔

حضرت عباسؓ، حضرت علیؓ کے ہاں گئے تو حضرت فاطمہؓ حضرت علیؓ سے کہہ رہی تھیں کہ میری عمر تم سے زیادہ ہے تو اس پر حضرت عباسؓ نے کہا کہ فاطمہؓ اس زمانہ میں پیدا ہوئی تھیں، جب قریش خانۂ کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے اور علیؓ اس سے چند سال پہلے پیدا ہو چکے تھے۔

(جلد چہارم صفحہ ۳۸۰)

اسی کتاب میں دوسرے مقام پر ہے کہ :۔

حضرت فاطمہؓ کی پیدائش اس سال میں ہوئی تھی جبکہ کعبہ کی تعمیر ہو رہی تھی اور نبی اکرمؐ کی عمر ۳۵ سال کی تھی۔

(جلد چہارم صـ۳۷۷)

طبقات ابن سعد میں ہے :۔

حضرت فاطمہؓ رسول اللہؐ کی بیٹی ہیں۔ ان کی والدہ حضرت خدیجہؓ بنت خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصیٰ ہیں۔ حضرت فاطمہؓ، حضرت خدیجہؓ کے بطن سے ان دنوں پیدا ہوئی تھیں جب قریش بیت اللہ کی تعمیر کر رہے تھے اور یہ واقعہ نبوت سے پانچ سال پہلے کا ہے۔

(جلد ۸ صفحہ ۱۱)

دوسری جگہ ہے :۔

حضرت عباسؓ ایک مرتبہ حضرت علیؓ کے گھر گئے تو حضرت فاطمہؓ، حضرت علیؓ سے فرما رہی تھیں کہ میں تم سے عمر میں بڑی ہوں۔ حضرت عباسؓ نے فرمایا دیکھو فاطمہؓ! تم ان دنوں پیدا

ہوئی تھیں۔ جبکہ قریش خانہ کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے اور نبی اکرمؐ کی پینتیس سال کی عمر تھی
اور دیکھو علیؓ بائم اس سے چند سال پہلے پیدا ہوئے تھے۔　(جلد ۸ صفحہ ۱۷)

استیعاب میں حضرت فاطمہؓ کی وفات کے متعلق حسب ذیل بیان ملتا ہے :-

وفات کے وقت حضرت فاطمہؓ کی عمر کیا تھی ؟ اس میں اختلاف ہے۔ زبیر بن بکار نے عبداللہ بن الحسن سے نقل کیا ہے کہ وہ ہشام بن عبدالملک کے پاس تھے۔ اور وہاں کلبی بھی موجود تھے۔ ہشام نے عبداللہ بن الحسن سے دریافت کیا کہ اے ابو محمد! فاطمہؓ بنت رسولؐ اللہ کی عمر کل کتنی ہوئی تھی، تو عبداللہ بن الحسن نے کہا کہ تیس سال۔ اس کے بعد ہشام نے کلبی سے دریافت کیا کہ حضرت فاطمہؓ کی کل عمر کتنی ہوئی تو کلبی نے کہا کہ ۳۵ سال اس پر ہشام نے عبداللہ ابن الحسن سے کہا کہ اے ابو محمدؒ! سنیئے کلبی کیا کہہ رہے ہیں اور ہشام نے کلبی کے بیان کو زیادہ اہمیت دی۔ اس پر عبداللہ ابن الحسن نے کہا۔ اے امیر المومنین! مجھ سے میری ماں کے متعلق پوچھئے اور کلبی سے اس کی ماں کے متعلق دریافت کیجئے۔

(جلد ۱ صفحہ ۷۵۲)

حضرت فاطمہؓ کی وفات ۱۱ھ میں ہوئی تھی۔ اگر اس وقت ان کی عمر تیس سال کی تھی تو اس سے ان کی پیدائش نبوت سے قریب پانچ سال پہلے ٹھیک بیٹھتی ہے (مہینوں کے فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔)

اس میں شبہ نہیں کہ (دیگر واقعات کی طرح) حضرت فاطمہؓ کی عمر (بوقت وفات) کے متعلق مختلف روایات ملتی ہیں۔ مثلاً ایک روایت کی رو سے ان کی عمر چوبیس سال کی ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک کی رو سے اٹھارہ سال سے کچھ زیادہ۔ لیکن صحیح یہی نظر آتا ہے کہ وفات کے وقت ان کی عمر قریب تیس سال تھی اور پیدائش نبوت سے قریب پانچ سال پہلے۔

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت عائشہؓ اس سال پیدا ہوئیں، جب نبی اکرمؐ اپنی عمر کے چالیسویں سال میں تھے۔ (حضرت فاطمہؓ کی پیدائش سے قریب پانچ سال بعد) یعنی اس سال جب حضورؐ کو نبوت ملی۔ (آخر میں ایک اور روایت دیکھئے)۔

(۳) اگر اس روایت کو صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت عائشہؓ کی عمر نکاح (منگنی) کے وقت چھ برس کی تھی تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ان کی پیدائش ۴ نبوی میں (یعنی حضورؐ کو نبوت ملنے کے

ٰ آخر میں ایک اور روایت بھی ملاحظہ کیجئے۔

چوتھے سال، یا جب حضورؐ کی عمر چالیس سال کی تھی اس وقت ہوئی تھی۔ اس لئے کہ نکاح (منگنی) کا واقعہ سنہ ۱۰ نبوی کا بتایا جاتا ہے۔ یعنی جب حضورؐ کی عمر پچاس سال کی تھی۔ یہ بات بوجوہ غلط ہے۔ مثلاً طبقات ابن سعد میں ہے کہ:-

جب رسول اللہؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو حضرت عائشہؓ کا پیغام دیا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! میں عائشہؓ کے متعلق مطعم بن عدی بن نوفل بن عبد مناف سے اس کے بیٹے جبیر کے لئے وعدہ یا بات چیت کر چکا ہوں۔ لہٰذا مجھے اتنی مہلت دیجئے کہ میں عائشہؓ کو ان سے واپس لے لوں۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایسا ہی کیا۔

اگر حضرت عائشہؓ کی عمر اس واقعہ کے وقت چھ برس کی تسلیم کی جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ جبیر سے اس کی منگنی چار پانچ سال کی عمر میں ہو چکی تھی عربوں میں اس کی مثال کہیں نہیں ملتی کہ وہ چار چار، پانچ پانچ سال کی عمر کی لڑکیوں کی نسبت کر دیا کرتے تھے۔ علاوہ بریں بخاری میں ہے کہ:-

حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ جب نبی اکرمؐ پر مکہ میں بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ ○ (۵۴/۴۶) (سورۃ القمر کی) آیات نازل ہوئیں تو میں ان دنوں بچی تھی اور کھیلتی پھرتی تھی۔ (بخاری جلد ۲ صہ ۲۰۴)

سورۂ قمر قریب سنہ ۵ نبوی میں نازل ہوئی تھی۔ اس وقت حضرت عائشہؓ کی عمر کم از کم اتنی تو ہونی چاہئے کہ انہیں معلوم ہو کہ یہ قرآن کی آیات ہیں اور بعد میں یہ واقعہ یاد بھی رہے۔ اگر ان کا سال پیدائش سنہ ۴ نبوی تصور کر لیا جائے تو سنہ ۵ نبوی میں وہ ایک سال کی ہوئیں۔ ایک سال کی بچی کے لئے نہ کھیلنا پھرنا ممکن ہے۔ نہ قرآنی آیات کے متعلق یہ کچھ یاد رکھنا ممکن۔ اس کے برعکس، اگر ان کا سن پیدائش نبوت کا پہلا سال تسلیم کیا جائے، تو سورۂ قمر کے نزول کے وقت ان کی عمر پانچ چھ سال کی ہو گی۔ اس عمر میں وہ یقیناً کھیلتی پھرتی ہوں گی۔ اور قرآنی آیات کے متعلق یہ کچھ یاد رکھ سکنے کے قابل۔ (اس ضمن میں وہ روایت بھی قابل غور ہے جو آخر میں درج کی گئی ہے)۔

ان شہادات سے واضح ہے کہ یہی روایت قابل ترجیح ہے کہ ان کی پیدائش اسی سال ہوئی جب رسول اللہ اپنی عمر کے چالیسویں سال میں تھے۔

(۴) جس واقعہ کو نکاح یا منگنی سے تعبیر کیا گیا ہے، وہ شوال سنہ ۱۰ نبوی میں ہوا تھا، (طبقات ابن سعد جلد ۸، صـ ۴۰) جب حضورؐ کی عمر پچاس سال کی تھی۔ اس اعتبار سے حضرت عائشہؓ کی عمر اس وقت دس سال کے قریب تھی، اگر پہلا سال شمار نہ کیا جائے۔ اور گیارہ سال کی اگر اسے شمار کر لیا جائے۔ چونکہ اصل اہمیت شادی کے واقعہ کو ہے نہ کہ منگنی کے واقعہ کو، اس لئے ہم اس واقعہ کے سرسری تذکرہ کے بعد آگے بڑھتے ہیں۔

---

(۵) شادی کے متعلق اس امر پر اتفاق ہے کہ وہ ہجرت کے بعد ہوئی تھی۔ سو ہمیں پہلے یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ ہجرت کب ہوئی تھی۔

نزولِ وحی کے بعد نبی اکرمؐ مکہ میں کتنے سال رہے۔ اس کے متعلق مختلف روایات ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ جب آپ پر وحی نازل ہوئی ہے تو آپ کی عمر تینتالیس سال کی تھی۔ اور اس کے بعد آپ دس سال تک مکہ میں رہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ :-

> ایک شخص حضرت ابن عباسؓ کے پاس آیا اور کہا کہ رسول اللہ پر دس برس مکے میں اور دس برس مدینہ میں وحی نازل کی گئی۔ ابن عباسؓ نے کہا کہ یہ کون کہتا ہے۔ مکہ میں آپ پر پندرہ برس تک یا اس سے زیادہ وحی کی گئی۔

لیکن انہی (حضرت ابن عباسؓ) سے یہ روایت بھی ہے کہ آپ مکہ میں تیرہ برس رہے۔ چنانچہ اس بات کو عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ آپ تیرہ برس مکہ میں رہے اس کے بعد ہجرت فرمائی (ان روایات کے لئے دیکھئے طبقات ابن سعد جزء اوّل صـ ۳۳۲ - ۳۳۳) تاریخ طبری۔ جلد اوّل۔ حصہ سوم صـ ۵۴ نیز صـ ۱۳۶ - ۱۳۵)

اتفاق سے اس وقت میرے سامنے ان جلدوں کا وہ اردو ترجمہ ہے جو حیدر آباد دکن سے شائع ہوا تھا، اس لئے یہ دونوں حوالے اس کے ہیں، تیرہ سال اور پندرہ سال کے تضاد کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ رسول اللہ اپنی عمر کے ۵۳ سال پورے کر چکے تھے اور ۵۴ واں سال شروع ہوا تھا۔ جب ہجرت ہوئی اور حضورؐ چالیسویں سال میں تھے کہ نزولِ وحی کی ابتداء ہوئی۔ اب اگر عمر کا چالیسواں سال شمار نہ کیا جائے تو مکہ کا قیام تیرہ برس کا ہوتا ہے اور چودھویں برس کے شروع میں ہجرت ہوتی ہے۔ اور اگر چالیسویں سال کو شمار کر لیا جائے تو مکہ کا قیام چودہ سال کا ہوتا ہے اور پندرھویں سال میں ہجرت ہوتی ہے۔ اسی کو غالباً حضرت

ابن عباس کی روایت میں پندرہ سال کہہ دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے حضرت عائشہ رضؓ شروع ہجرت میں یا تو تیرہ سال پورے کر کے چودھویں سال میں تھیں اور یا چودہ سال پورے کر کے پندرھویں سال میں۔ (نیز دیکھئے وہ روایت جو آخر میں آئی ہے۔

---

(۶) اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہجرت کے کتنے عرصہ بعد آپ کی شادی ہوئی۔ عام روایت کے مطابق نکاح (منگنی) کے وقت حضرت عائشہ رضؓ کی عمر چھ برس کی تھی اور (رخصتی) شادی کے وقت نو برس کی اور رخصتی مدینہ میں شوال کے مہینے میں ہوئی تھی۔ چونکہ منگنی ہجرت سے تین سال پہلے ہوئی تھی اس لئے اس روایت کے مطابق آپ کی شادی ہجرت کے پہلے سال ماہ شوال میں ہو جانی چاہئیے۔ لیکن یہ بھی غلط ہے۔ !

اس کے وجوہات حسب ذیل ہیں :-

(۱) طبقات ابن سعد میں حضرت عائشہ رضؓ نے تفصیل سے بتایا ہے کہ جب نبی اکرمؐ اور حضرت ابوبکرؓ مدینہ تشریف لے گئے تو حضورؐ کی صاحبزادی اور حضرت ابوبکر رضؓ کے اہل وعیال مکہ میں پیچھے چھوڑ دیئے گئے تھے چنانچہ اس کے بعد جب آپ کو اطمینان ہو گیا تو ان سب کو مدینہ بلوا لیا گیا۔

(طبقات جلد ۸ ۔ صـ ۴۳)

(ب) بخاری میں حضرت عائشہ رضؓ سے مروی ہے کہ :-

جب ہم مدینہ میں آئے تو مجھے وہاں بخار آیا اور میرے سر کے تمام بال جھڑ گئے۔ اس کے بعد وہ پھر اُگ آئے اور کندھوں تک آ گئے۔ تب آپ کی شادی ہوئی۔

(بخاری جزو ۱۵، صـ ۲۰۴)

اس سے ظاہر ہے کہ :-

(i) حضرت عائشہ رضؓ ہجرت کے کچھ عرصہ بعد تک مکہ ہی میں رہیں (واضح رہے کہ ہجرت ربیع الاوّل کے مہینے میں ہوئی تھی)۔

(ii) مدینہ تشریف لانے کے بعد آپ بیمار ہوئیں اور آپ کے سر کے بال سب جھڑ گئے۔

(iii) اس کے بعد وہ تمام بال دوبارہ اُگے اور کندھوں تک آ گئے اس کے بعد آپ کی شادی ہوئی۔

اگر یہ مانا جائے کہ آپ کی شادی ہجرت کے پہلے سال شوال میں ہوئی تھی، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اوپر کے تمام واقعات آٹھ ماہ کے اندر اندر (ربیع الاول سے شوال تک) ہو گئے تھے۔ اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ آپؓ کو ہجرت کے بعد مکہ سے مدینہ آنے میں تین چار ماہ کا عرصہ لگا، پھر ایک آدھ مہینہ بیماری کا بھی سمجھ لیجئے تو اس کے بعد شادی تک کے لئے تین چار ماہ کا عرصہ باقی رہ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنے قلیل عرصہ میں کسی صورت میں بھی نئے بال اُگ کر کندھوں تک نہیں آسکتے۔ یہ ایک ایسی بدیہی بات ہے کہ بخاری کے شارح عینی نے بھی لکھا ہے کہ:-

یہ قول بہت ہی عجیب ہے کہ ان کی رخصتی ہجرت کے سات مہینے بعد ہوگئی۔ یہ قول بالکل کمزور ہے۔ ان کی رخصتی جنگ بدر سے واپسی کے بعد شوال ۲ھ ہجری میں ہوئی۔

(عینی جلد ۸ صـ ۹۶)

(ج) اس کی تائید استیعاب نے بھی کی ہے جس میں لکھا ہے کہ:-

رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے ہجرت سے تین سال پہلے شوال ۱۰ھ نبوتی میں نکاح کیا تھا اور ہجرت سے اٹھارہ ماہ بعد شوال میں مدینہ میں انہیں رخصت کرا کر لائے تھے۔

(استیعاب جلد ۲ صـ ۷۴۴)

(د) اسد الغابہ میں ہے کہ:-

حضرت فاطمہؓ کی شادی حضرت عائشہؓ کی شادی سے چار ماہ بعد ہوئی تھی۔

(جلد ۱۲ صـ ۳۷۷)

حضرت فاطمہؓ کی شادی محرم میں ہوئی تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ کس سن ہجری کا محرم تھا۔ بخاری میں ایک طویل روایت ہے جس میں مذکور ہے کہ:-

حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میری ایک اونٹنی تھی جو مجھے یوم بدر میں مال غنیمت میں ملی تھی۔ اور ایک اونٹنی مجھے رسول اللہ ﷺ نے اس حصہ میں سے دی تھی جو اللہ نے آپ کو بطور فئے دیا تھا یعنی خمس میں سے۔ میں نے ارادہ کیا کہ حضرت فاطمہؓ بنت رسول اللہ ﷺ کو رخصت کرا کے لے آؤں اور میں نے بنو قینقاع کے ایک سنار سے بات چیت کی کہ وہ میرے ساتھ چلے اور ہم چل کر اذخر گھاس لے آئیں۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ اذخر گھاس کو سناروں کے ہاتھ فروخت کروں گا اور اس سے جو رقم

مجھے حاصل ہو گی اس سے شادی کا ولیمہ کروں گا۔ (اس کے بعد ہے کہ حضرت حمزہؓ نے کسطرح
ان اونٹنیوں کی کھوکھیں پھاڑ ڈالیں۔ چونکہ یہ حصہ ہمارے موضوع سے غیر متعلق ہے اس لئے
اسے نقل کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ (بخاری جزو سوم صفحہ ۸)

اس سے ظاہر ہے کہ جنگ بدر تک حضرت علیؓ کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ جنگ بدر رمضان ۲ھ ہجری میں ہوئی، لہٰذا آپ کی شادی جلدی سے جلدی ۳ھ ہجری کے محرم میں ہو سکتی ہے۔ (اسد الغابہ میں اسے غلطی سے محرم ۲ھ لکھ دیا گیا ہے۔)

اور چونکہ حضرت عائشہؓ کی شادی اس سے چار ماہ قبل ہوئی تھی۔ اس لئے یہ شادی شوال ۲ھ میں ہو سکتی ہے نہ کہ ۱ھ میں۔

(۷) تصریحات بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ شادی کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر پندرہ برس کی تھی۔ اگر سال پیدائش کو شمار نہ کیا جائے اور سولہ برس کی اگر اس سال کو شمار کر لیا جائے۔ یعنی ہجرت کے وقت کی عمر سے قریب دو سال زیادہ۔

حضرت عباسؓ کی یہ روایت پہلے درج کی جا چکی ہے کہ حضورؐ نزول وحی کے بعد پندرہ سال تک مکہ میں رہے۔ اس مقام پر ہم نے تیرہ اور پندرہ سال کی روایات میں مطابقت کی کوشش کی تھی۔ لیکن اگر اس روایت کو بالفاظہ صحیح مان لیا جائے (کہ حضورؐ نے مکہ میں کامل پندرہ سال رہنے کے بعد سولھویں برس میں ہجرت کی) تو اس صورت میں حضرت عائشہؓ کی عمر بوقت شادی سترہ سال کی ہو جاتی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت کی تائید طبری کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ:-

ابن عباس اور ابن حنظلہ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے ۶۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔ (طبری اردو ترجمہ حیدرآباد۔ جلد اوّل۔ حصہ سوم صفحہ ۵۹۹)

یعنی چالیس سال کی عمر میں نبوت۔ پندرہ سال مکہ میں اور دس سال مدینہ میں، کل ۶۵ سال۔

ان شہادات کے علاوہ ایک اور شہادت ایسی ہے جو واقعہ کے لحاظ سے ان سے بھی قوی ہے اور جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کی عمر ہجرت کے وقت سترہ (۱۷) سال کی، فلہٰذا رخصتی کے قریب انیس (۱۹) سال کی تھی۔ حضرت اسماءؓ بنت ابوبکرؓ حضرت عائشہؓ کی بڑی (علاتی) بہن تھیں۔ ان کے متعلق صاحب

مشکوٰۃ، شیخ ولی الدین ابی عبداللہ محمد بن عبداللہ خطیب، اپنی کتاب الکمال فی اسماء الرجال میں لکھتے ہیں :-

یہ اسماء ہیں ابوبکر صدیقؓ کی بیٹی۔ ان کو ذات النطاقین کہا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے جس رات میں حضورؐ نے ہجرت کی تھی اپنے پٹکے کو پھاڑ کر دو حصے کئے تھے۔ اس کے ایک حصے میں توشہ دان کو باندھا اور دوسرے کو مشکیزے پر باندھا یا اس کا اپنا پٹکا بنا لیا تھا۔ اور یہ حضرت عبداللہ بن زبیر کی والدہ ہیں۔ مکہ میں اسلام لائیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت صرف سترہ آدمیوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ اور یہ حضرت عائشہؓ سے دس برس بڑی تھیں، جب آپ کے بیٹے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی نعش کو (جو بعد قتل ایک لکڑی پر لٹکا دی گئی تھی) لکڑی سے اتار کر دفن کیا گیا، اس سے دس دن بعد یا بیس دن بعد بعمر ایک سو سال انتقال کیا۔ اس وقت ۷۳ھ تھا۔ ان سے بہت سے لوگوں نے احادیث کی روایت کی ہے۔

(الکمال مشکوٰۃ کے اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہوئی ہے، اس کا صفحہ ۷۷۹ دیکھئے)

حضرت اسماء کی عمر بوقت وفات (۷۳ھ میں) سو سال کی تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کی عمر ہجرت کے وقت ستائیس سال کی تھی۔ اور چونکہ حضرت عائشہؓ ان سے دس سال چھوٹی تھیں۔ اس لئے حضرت عائشہؓ کی عمر سترہ سال کی تھی۔ اس اعتبار سے شادی کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر قریب انیس سال کی ہوتی ہے۔

اس سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ کلبی نے جو ہشام بن عبدالملک سے کہا تھا کہ حضرت فاطمہؓ کی عمر قریب پینتیس سال کی تھی تو یہ قرین قیاس ہے اگر حضرت عائشہؓ کی عمر ہجرت کے وقت سترہ سال کی تھی تو حضرت فاطمہؓ کی عمر اس وقت قریب بائیس سال کی ہوگی اور وفات کے وقت قریب تینتیس سال اور پیدائش اور وفات کے سال ساتھ شمار کر لینے سے پینتیس سال۔

بہرحال تصریحات بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ شادی کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر بعض روایات کے مطابق انیس برس اور بعض کے مطابق سترہ برس کی تھی۔ اور ۱۵۔۱۶ برس سے کم کسی صورت میں بھی نہ تھی۔ اس لئے وہ روایات کہ شادی کے وقت آپ کی عمر نو برس کی تھی، آپ اس وقت کھیل

کے ساتھ جھولے جھولتیں اور نبی اکرمؐ کے ہاں آجانے کے بعد بھی گڑیاں کھیلا کرتی تھیں، قابلِ قبول قرار نہیں پاسکتیں۔ رسول اللہؐ نے اپنی بیٹیوں کی شادیاں کیں۔ ان میں سے کسی کی شادی بھی صغر سنی میں نہیں کی۔ سب سے آخر میں حضرت فاطمہؓ کی شادی کی۔ اس وقت ان کی عمر کم از کم اکیس یا بائیس سال کی تھی۔ حالانکہ حضرت علیؓ جن سے ان کی شادی کرنی تھی خود گھر میں موجود تھے۔

آخر میں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں تاریخ کے اس اہم نکتہ کو ایک بار پھر دہراؤں جسے اس سے پیشتر کئی مرتبہ پیش کیا جا چکا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ تاریخ میں ہمیں ایک ہی واقعہ کے متعلق کئی متضاد روایات ملتی ہیں۔ مثلاً طبری میں خود نبی اکرمؐ کی عمر کے متعلق یہ روایات موجود ہیں کہ آپ کی عمر ساٹھ سال کی۔ تریسٹھ سال کی۔ یا پینسٹھ سال کی تھی۔ (طبری جلد اول۔ حصہ دوم) یا مثلاً حضرت فاطمہؓ کی وفات کے متعلق ہے کہ وہ حضورؐ کی وفات کے بعد صرف تین دن زندہ رہیں۔ یا ایک ماہ۔ دو ماہ۔ تین ماہ۔ اور پانچ دن۔ چار ماہ اور بعض کے نزدیک چھ ماہ تک زندہ رہیں۔ (بحوالہ سیرۃ النبی شبلی جلد دوم ص۲۷۱ حاشیہ) یہ فرق تو پھر بھی چند دنوں اور مہینوں کا ہے۔ حضرت سودہؓ کی وفات کے متعلق واقدی نے لکھا ہے کہ انہوں نے ۵۴ھ میں وفات پائی اور امام بخاری تاریخ میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں انتقال فرمایا۔ (یعنی ۲۳ھ سے پہلے)[۱] اس فرق کو ملاحظہ کیجئے کہ کس قدر زیادہ ہے۔ یہ تضاد جہاں تک ان واقعات میں ہو جن کا تعلق کسی دینی معاملہ سے نہیں اور نہ ہی ان کا اثر نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس پر پڑتا ہے، ان میں چنداں مضائقہ نہیں کہ ایک روایت کو قبول کر لیا جائے یا دوسری کو۔ مثلاً یہ کہ حضرت سودہؓ کی وفات ۲۳ھ میں ہوئی تھی یا ۵۴ھ میں، اس کا اثر نہ دین پر پڑتا ہے اور نہ رسول اللہؐ کی ذاتِ اقدس پر۔ لیکن ایسی روایات جن کا اثر دین پر یا حضورؐ کی ذات پر پڑتا ہے، ان کے متعلق بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ ان کے بارے میں اصول یہ ہونا چاہیے کہ کوئی بات جو قرآن کے خلاف ہے یا جس سے حضورؐ کی ذات کے خلاف کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے وہ کسی صورت میں صحیح نہیں ہو سکتی۔ خواہ تاریخی اسناد کی رُو سے وہ کتنی ہی ثقہ کیوں نہ قرار پا چکی ہو۔ تاریخ بہر حال ظنّی ہے۔ اس کے مقابلہ میں قرآن ایک یقینی شہادت ہے اور یہ حقیقت بھی قطعاً یقینی ہے کہ نبی اکرمؐ کا کوئی قول یا عمل نہ قرآن کے خلاف ہو سکتا ہے اور نہ ہی شرفِ انسانیت کے خلاف۔ اس لئے ہمیں ظنّی چیزوں کو ہمیشہ یقینی باتوں کا تابع رکھنا چاہیئے۔ اگر ہم اپنی تاریخ میں اتنی احتیاط برت لیں تو ہم دین کے معاملہ میں بہت

---

[۱] بحوالہ سیرۃ النبی شبلی جلد ۲ ص۴۰۴

سی اُلجھنوں سے بچ جائیں گے اور سیرتِ نبی اکرمؐ کے بارے میں ان رنج دہ اعتراضات سے بھی جو ہماری تاریخی روایات کی بناء پر غیروں کی طرف سے آئے دن عائد ہوتے رہتے ہیں۔ ضرورت تو اس امر کی ہے کہ صدرِ اول کی تاریخ مذکورہ بالا معیار کے مطابق از سرِ نو لکھی جائے تاکہ جن غلط واقعات کی بناء پر نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار ہو جاتی ہے وہ واقعات تاریخ میں باقی نہ رہیں لیکن جب تک ایسا نہ ہو سکے اس وقت تک ہمیں اتنا تو ضرور کرنا چاہیئے کہ اس قسم کی روایات کے متعلق کہہ دیا جائے کہ یہ غلط ہیں اور مزید تحقیق کی محتاج۔